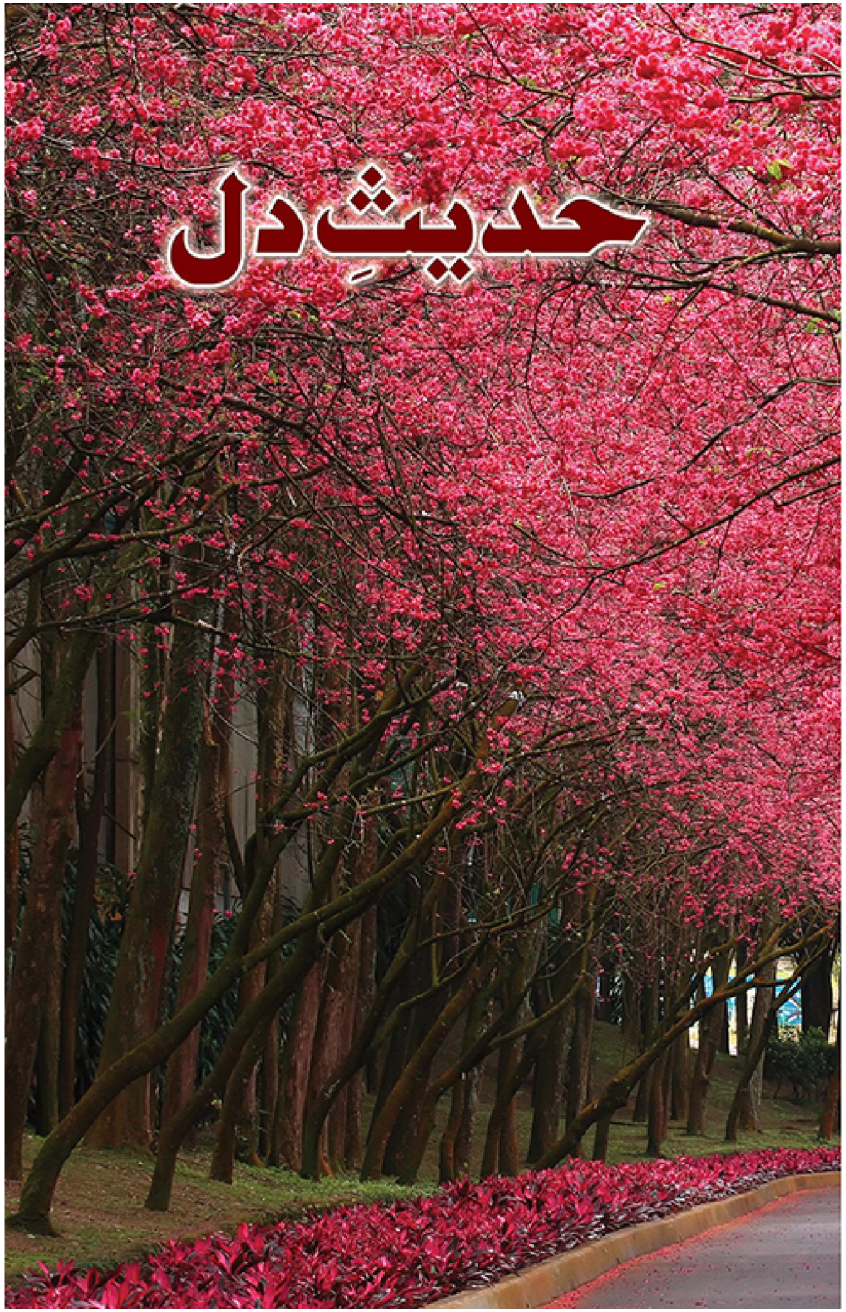

حدیثِ دل

زندگی اور شخصیت کی تعمیر کے لیے رہنما تحریریں
جو دل سے لکھی گئیں اور دل والوں کے لیے لکھی گئیں

ابویحییٰ

انذار پبلیشرز

A Non-Profit Organization

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب	:	حدیثِ دل
ISBN نمبر	:	978-969-9807-06-0
مصنف	:	ابویحییٰ
ناشر	:	انذار پبلیشرز:03323051201
ویب سائٹ	:	www.inzaar.org
ای میل	:	abuyahya267@gmail.com
ٹائٹل	:	حافظ حسن سلیم
قیمت	:	300روپے
ملنے کا پتہ	:	پوری دنیا میں کسی بھی جگہ گھر بیٹھے یہ کتاب حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے۔ (0092)-03323051201 مزید مقامات کے لیے دیکھیے ہماری ویب سائٹwww.Inzaar.org

حدیثِ دل کسی درویش بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آ گاہ

فہرست

بڑی لکیر 09
باپ، خدا اور انسان 10
انسان اور بدبو 11
موت کی دستک 12
دوسروں کو دیکھنے کا غلط طریقہ 13
قیادت کا مسئلہ 14
اعلیٰ شخصیت 15
علم اور شخصیت 16
گناہ اور علم 17
آج کے مسلمان کی خوش نصیبی 18
شخصیت اور ارتقا 19
شخصیت کا ارتقا اور عزم 20
کچھوا خرگوش کہانی: کچھ نئے پہلو 21
پاکستان کا فیصلہ 23
لیڈر کون 24
ٹی وی اور سکون 25
خدا کے لیے مردانہ اسلوب 28
پہلی شکست 29
دل کے غریب 30
تین سطحیں 31
لیڈرشپ کیا ہے؟ 33
استقامت 36
حالات بڑے خراب ہیں 37
سونا اور مٹی 38
بسم اللہ 39
بلوواٹر جیلی 41
سچی خدا پرستی 42
خدا کی گنتی 43
تحقیق کی ذمہ داری 44
زندہ اور مردہ نماز 46
خدا کا قرب 47
نکاح کیا نہیں ہے؟ 48
قرآن کریم کا طریقہ استدلال 51
مسکراہٹ اور خوبصورتی 54
مسکراہٹ اللہ کے لیے 55
اصل بے وقوفی 56
مسیار شادی 57
اولاد ایک مشن 58
قیامت کی مثال 60
ہم اور ہمارے والدین 63
ماں باپ کی قدر و قیمت 64
یہ پیشہ نہیں ہے 65
خرچ کی عادت 68
اپنی زمین 69
دبئی کی جنت 70
نفس اور شیطان 73
بے شکل انسان 77
بابر کا المیہ 78
بابر ’نہ‘ عیش کوش 79
ہم کو نہیں 80
بھیڑ کی نفسیات 83
گول اور مزاحمت 84
اصل کرنسی 85
پریشانی 86
زندہ معجزہ 88
وہ کیوں عظیم تھے؟ 90
ٹریفک 91
پیغمبر کی تعلیم اور شیطان کا طریقہ 93
خواتین کی ناپاکی اور جنت 95
تم میرے ساتھ ہوتے ہو گویا 97
نئے اور پرانے گدھے 98
جماعت اور نیکی کا فروغ 99
آسودہ حال طبقات اور اسراف 100
گورپیا کوئی ہور 102
بھوپال کی شہزادی کے اسباق زندگی 104
عجیب دنیا 107
خوشگوار ازدواجی زندگی 108
سب سے بڑی سچائی 109
راکھ کے بادلوں کا پیغام 111
بلاوہ اور پیغام 113
تعمیری اور تنقیدی ذہن 114
بخل کا انجام 115
عظیم بادشاہی 116
قیامت اور موت کا فرق 117
مکڑی کا جالا 119
انسان کی کہانی 121
دو ماہ کا سبق 122
اصل چہرہ 123

سیلاب عظیم 125
اجڑی کھیتی کا سبق 126
آج کے بت 127
سب سے طویل فاصلہ 128
زیادہ بڑی خدمت 129
معرفت کی دعا 131
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے 132
ٹیم ورک 133
ملیكٍ مقتدر 134
جنت کا نقشہ 135
کال سنٹرز 136
کرم والا اور دل والے 137
لغویات 138
سیرت مصطفی بے مثل باخدا 139
نجات سے بڑھ کر 141
مفادات اور گناہ 142
دو قسم کی دنیائیں 144
جنت کی دریافت 145
نوجوانوں کا مسئلہ 147
جنت اور عزتِ نفس 150
مال و دنیا اور دل 151
زنبور کا دور 152
پہلے جہنم کیوں؟ 154
خواہشات اور گناہ 156
خدا کی طاقت 158
تعجب کی بات 159
عجز اور قدرت 160
کعبہ کی طرف منہ 162
انسان اور مصائب 163
ٹائم مشین 164
گناہ، ماحول اور صحبت 166
جوش اور استقامت 167
شرط اور شرافت 168
بھکاری کا حق 170
گناہ اور عادات 171
انسانی گوشت کھانے والے لوگ 173
آج کا موقع اور خدا کا پڑوس 176
ڈینگی اور جنت کے باسی 177
Think and Thank 178
زندگی اور ملازمت 179
گناہ اور اختلافات 180
زیادہ نمک 182
خوف اور امن 183
پکنک پوائنٹ 184
شکوہ کے بجائے شکر 186
ایک سجدے کے عوض 187
بن دیکھے کا سودا 188
شاپنگ کلچر 190
مردوں کے کان 192
یہ ایک سجدہ 193
لکھنے والے 194
میں وہی ہوں مومن مبتلا 195
جہنم کی قید 197
صحت کا راز 198
انسان اور خدا 200
زینت دنیا خوب یابد 203
تکبر کی ماں 204
بجلی کا بل اور زندگی کا بل 205
سیاچن کا جہنم 206
مصائب سے بچنے کا راستہ 208
مال اور کمزور 211
جنت کی وراثت 212
دعا اور عزم 213
تقدیر اور عمل 214
فطرت کی سزا جزا 216
خدا اور ہماری کہانی 218
آگ اور تیل 219
کرسیوں کا پیغام 220
دلہن کی نمائش 221
مما پپا اور اللہ 222
اللہ کو دیکھنا اللہ کا دیکھنا 223
فرینڈز لسٹ 225
طوفان اور جھونکا 227
آسانی کی نعمت 228
ترقی کا راستہ 229
وہ اجنبی 230
ہمیں شکایت ہے 231
فرض آشنائی 234
چھوٹی نعمت 235
پاکیزگی کا راستہ 236
جلال، جمال اور کمال رب 237
خدا زندہ ہے 240
گاڑی سے پردہ 241
پانچ جاتے ہیں چار پھرتے ہیں 242
پٹا ہوا مہرہ 243
اکیسویں صدی کا نشہ 245
باخبر کی بے خبری 246
بہترین داعی 247
مال اور حوصلہ 248
قرآن کا زکوٰۃ کیلکولیٹر 249
یہ دنیا وہ دنیا 250
میاں بیوی اور دوستی 251
ایمان، حج اور جہاد 252

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

کسی بھی قوم کی ترقی اور دنیا میں اس کے مقام و مرتبے کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ افراد ملت کی شخصیت کس رخ پر تعمیر ہوئی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں دور جدید میں یہ کام کبھی بڑے اذہان کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکا۔ مزید سانحہ یہ ہوا کہ افراد کی تعمیر کے فطری ادارے یعنی والدین، خاندان اور محلے کے بزرگ، اساتذہ، علما و صوفیا اور اہل دانش وغیرہ سماج میں کمزور ہوتے چلے گئے یا جتنے کچھ بھی ہیں ان کی ترجیحات میں یہ کام شامل نہیں۔

یہ وہ احساس ہے جس کے تحت یہ فقیر پچھلے کئی برسوں سے اپنے کمزور قلم کے سہارے یہ کوشش کر رہا ہے کہ افراد ملت کی شخصیت کی تعمیر کو موضوع بنا کر لکھا جائے۔ ایمان، اخلاق، صبر، علم، تحقیق، معقولیت، مثبت انداز فکر اور حیا جیسی اقدار کو افراد کی شخصیت کا اصل حصہ بنایا جائے۔ یہ ایک مشکل اور طویل راستہ ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ منزل تک پہنچانے کا یہی ایک راستہ ہے۔ چاہے وہ افراد کے لیے جنت کی منزل ہو یا قوم کے لیے دنیوی عروج کی منزل۔

ہم دلوں پر دستک دے کر دل کی بات لوگوں کو سمجھا رہے ہیں۔ اس مجموعے کا نام اسی مناسب سے حدیث دل رکھا گیا ہے۔ یہ نام اقبال کے کلام سے لیا گیا ہے جو درویش بے گلیم تھے یعنی ایک عارف اور درویش ہوتے ہوئے بھی درویش کے حلیے (گلیم) میں نہ تھے۔

حدیثِ دل کسی درویش بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ

ابو یحییٰ

بڑی لکیر

کلاس روم میں سناٹا طاری تھا۔ طلبا کی نظریں کبھی استاد کی طرف اٹھتیں اور کبھی بلیک بورڈ کی طرف۔ استاد کے سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ سوال تھا ہی ایسا۔ استاد نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بغیر ایک لفظ کہے بلیک بورڈ پر ایک لمبی لکیر کھینچ دی۔ پھر اپنا رخ طلبا کی طرف کرتے ہوئے پوچھا، ”تم میں سے کون ہے جو اس لکیر کو چھوئے بغیر اسے چھوٹا کر دے؟“

”یہ ناممکن ہے۔“، کلاس کے سب سے ذہین طالبعلم نے آخر کار اس خاموشی کو توڑتے ہوئے جواب دیا۔ ”لکیر کو چھوٹا کرنے کے لیے اسے مٹانا پڑے گا اور آپ اس لکیر کو چھونے سے بھی منع کر رہے ہیں۔“ باقی طلبا نے بھی گردن ہلا کر اس کی تائید کر دی۔ استاد نے گہری نظروں سے طلبا کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر بلیک بورڈ پر پچھلی لکیر کے متوازی مگر اس سے بڑی ایک اور لکیر کھینچ دی۔ جس کے بعد سب نے دیکھ لیا کہ استاد نے پچھلی لکیر کو چھوئے بغیر اسے چھوٹا کر دیا تھا۔ طلبا نے آج اپنی زندگی کا سب سے بڑا سبق سیکھا تھا۔ دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر، ان کو بدنام کیے بغیر، ان سے حسد کیے بغیر، ان سے الجھے بغیر ان سے آگے نکل جانے کا ہنر چند منٹ میں انہوں نے سیکھ لیا تھا۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جس فطرت پر پیدا کیا ہے اس میں اپنا موازنہ دوسروں سے کر کے ان سے آگے بڑھنا انسان کی طبیعت میں شامل ہے۔ اس کام کو کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دوسرے کو چھوٹا بنانے کی کوشش کی جائے۔ مگر ایسی صورت میں انسان خود بڑا نہیں ہوتا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دوسروں سے الجھے بغیر خود کو مضبوط، طاقتور اور بڑا بنانے پر توجہ دی جائے۔ دوسرے اس شکل میں بھی چھوٹے ہو جاتے ہیں، مگر اصل بات یہ ہے کہ اس عمل میں انسان خود بڑا ہو جاتا ہے۔

دوسروں سے الجھے بغیر آگے بڑھنا، خدا کی دنیا میں ترقی کا اصل طریقہ ہے۔ فرد اور قوم دونوں کے لیے دیرپا اور مستقل ترقی کا یہی واحد راستہ ہے۔

باپ، خدا اور انسان

سرد ہوا کا ایک جھونکا میرے وجود سے ٹکرایا۔ سطح زمین پر سورج ڈوبنے میں گرچہ ابھی کچھ وقت تھا مگر آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر یہ دہکتا ہوا چراغ، شام کے ملگجے سایوں سے قبل از وقت ہی شکست کھا چکا تھا۔ پہاڑوں کی بلندیاں جو دن بھر سر اٹھائے اس چراغ کی عظمت کو سلام کرتی رہیں، شام ہوتے ہی کسی جفاکار ملازم کی طرح اسے، اس کی روشنی سمیت، قبل از وقت ہی نگل چکی تھیں۔ شام کے ان گہرے سایوں نے سردی کے احساس کو اور بڑھا دیا تھا۔ اس پر یہ سرد ہوا کا جھونکا۔ بے اختیار میں نے اپنی گرم جیکٹ کو ہاتھوں کے حلقے سے اپنے گرد اور کس لیا۔

اگلے لمحے مجھے اپنے بیٹے کا خیال آیا جو گرچہ اپنی بچہ گاڑی (stroller) پر اچھی طرح ڈھکا ہوا لیٹا تھا، مگر اس جھونکے نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اپنی گرم جیکٹ اتار کر اس کی گاڑی کو پوری طرح ڈھانپ دوں۔ اب میں سرد ہواؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے تنہا رہ گیا۔ ٹھنڈ میرے وجود میں سرایت کرنے لگی، مگر اسی لمحے ایک دوسرے احساسِ تپش نے مجھے آلیا۔ میں نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھا جس کی عظمت کو کوئی بلندی اور جس کے نور کو کوئی اندھیرا نہیں نگل سکتا۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”باپ کی محبت ایسی ہوتی ہے تو خدا کی محبت کیسی ہوگی۔“

مسیح کے پیروکاروں کو بہت بڑی غلطی لگی جب انہوں نے خدا کی محبت کو بیان کرنے کے لیے اسے باپ کہا۔ ماں باپ کی حیثیت ہی کیا ہے...... اس محبت، اس کرم اور اس مہربانی کے سامنے جو خدا اپنے بندوں پر کرتا ہے...... مگر یہ بندے...... ان کے پاس خدا کو دینے کے لیے کچھ نہیں۔ اور جو ہے وہ اسے دینے کے لیے تیار نہیں۔ محبت کا بدلہ محبت ہے۔ مہربانی کا بدلہ شکر گزاری ہے اور خدا کے کرم کا بدلہ خدا کی یاد ہے۔ آہ! مگر کتنے کم لوگ ہیں جو محبت، شکر اور یادِ الٰہی کی کیفیات میں جیتے ہیں۔

آج کا انسان ہمیشہ سے بڑھ کر خدا کی نعمت میں جی رہا ہے۔ مگر آج کا انسان ہمیشہ سے بڑھ کر خدا کو بھولا ہوا ہے۔ کتنا بلند ہے وہ خدا اور کتنا پست ہے یہ انسان۔

انسان اور بدبو

خدا کی اس دنیا میں بدبو بھی ہے اور خوشبو بھی۔ مگر انسانوں میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جو خوشبو کو چھوڑ کر بدبو کو اپنے لیے پسند کرے۔ تاہم اس کے باوجود زندگی کے سفر میں بدبو کا جھونکا، گٹر کی نالی، کچرے کا ڈھیر اور دیگر ناپسندیدہ چیزیں راہ میں آہی جاتی ہیں۔ یہ نہ ہوں تب بھی جسم سے نکلنے والی میل، پسینہ، بدبو اور بول و براز وغیرہ سے بچنا ممکن نہیں۔ مگر ہم ان چیزوں کی شکایت نہیں کرتے بلکہ فوراً ہر گندگی کو دھوتے اور ناپسندیدہ چیزوں سے کنارا کر لیتے ہیں۔

کامیاب شخصیت کا راز بھی اسی رویے میں پوشیدہ ہے۔ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والے ناخوشگوار واقعات کو بدبو کے گندے جھونکے کی طرح نظرانداز کر دینا چاہیے۔ دوسروں کی جانب سے اچھالے گئے بدمزاجی اور بداخلاقی کے گند کو صبر کے پانی سے دھولینا اور تحمل کے پرفیوم سے جھیل لینا چاہیے۔ بہت سے لوگ جواب تو نہیں دیتے مگر شکایت سے بھی خود کو روک نہیں پاتے۔ مگر یہ شکایت کرنا بھی انسان کو ایک منفی نفسیات میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یعنی موقع ملنے پر بدلہ لینے کی خواہش۔ یہ اپنے دل میں ایک گندا اور بدبودار تالاب بنانے کے مترادف ہے اور اسی لیے یہ رویہ اعلیٰ شخصیت کی تعمیر میں ایک رکاوٹ ہے۔

شکایت کرنا اور جواب دینا بظاہر ایک فطری ردعمل ہے۔ مگر درحقیقت یہ جسم کی بدبو کو پرفیوم کے بجائے گندے پسینے سے ختم کرنے کی کوشش ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم اس ذہنی سکون سے محروم ہو جاتے ہیں جو صبر و تحمل کے حامل ایک خوشبودار شخص کو ہمیشہ حاصل ہوتا ہے۔ ایک صابر شخص خدا کی رحمت، فرشتوں کی معیت اور جنت کی امید میں جیتا ہے۔ ایسے شخص کی خوشی اور سرشاری کے کیا کہنے۔ مگر ہم اس مستقل ذہنی سکون کے بجائے شکایت اور جوابی اقدام کی سوچ میں جیتے ہیں اور اپنے لیے مستقل ذہنی اذیت اور اخلاقی بدبو کا انتظام کر لیتے ہیں۔

موت کی دستک

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جانداروں کی نسل کو برقرار رکھنے کا ایک عجیب طریقہ اختیار کیا ہے۔ جاندار کسی فیکٹری میں بننے والی پروڈکٹ نہیں ہوتے، جو مشینوں سے وجود میں آئیں، بلکہ ہر جاندار اگلی نسل کو اپنے وجود سے جنم دیتا ہے۔ مثلاً درخت اپنے بیج سے ایک نئے درخت کو جنم دیتا ہے۔ گھوڑا ایک اور گھوڑے کو، کتا ایک اور کتے کو اور انسان ایک نئے انسان کو جنم دیتا ہے۔

دوسرے جانداروں کے لیے اس عجیب و غریب طریقے میں کوئی پیغام ہو یا نہ ہو، اعلیٰ ترین درجے کا شعور رکھنے والے انسانوں کے لیے اس میں ایک غیر معمولی پیغام ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں ان کی جگہ لینے ان کے اپنے وجود سے ایک دوسرا شخص آچکا ہے۔ نسل انسانی کی بقا کے لیے ان کا نعم البدل سامنے آ گیا ہے۔ بظاہر یہ زندگی کی آمد ہے، لیکن درحقیقت یہ خوشی کے لفافے میں رکھا ہوا موت کا المناک پیغام ہے۔ یہ زندگی کے دروازے پر موت کی خاموش دستک ہے۔

یہ دستک انسان کے دروازے پر دوبارہ اس وقت سنائی دیتی ہے، جب اس کے ماں باپ میں سے کسی کا انتقال ہو جاتا ہے۔ جو نادان پہلی دستک پر نہیں چونکے، انہیں اس دوسری اور زیادہ واضح دستک پر ہڑبڑا کر اٹھ جانا چاہیے۔ انہیں جان لینا چاہیے کہ ان کی پیدائش کے بعد ان کے ماں باپ کا جانا اگر مقدر ہے تو ان کی اولاد کے آنے کے بعد ان کا جانا بھی طے ہو چکا ہے۔

جوانی اور ادھیڑ عمر مالی اور جسمانی ہر دو اعتبار سے زندگی کا بہترین حصہ ہوتا ہے۔ انسان چاہے تو اس بہترین وقت کو استعمال کر کے جنت میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکتا ہے۔ مگر اکثر لوگ اس دور کو دنیا کی عارضی زندگی کی ترقی کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ ایسے میں موت دو دفعہ ہوشیار کرنے کے لیے زندگی کے دروازے پر دستک دیتی ہے تا کہ لوگ غفلت کی نیند سے جاگیں اور ہمیشہ رہنے والی جنت کے حصول کے لیے اپنی تمام صلاحتیں لگا دیں۔ کیونکہ بہت جلد موت ایک زلزلے کی صورت نمودار ہو کر ان کی ہر ترقی اور ہر تعمیر کو ڈھا دے گی اور ان کے پاس پچھتاووں کے سوا کچھ نہیں بچے گا۔

موت کی دستک سن لیجیے۔ قبل اس کے کہ یہ دستک موت کا زلزلہ بن کا نمودار ہو جائے۔

دوسروں کو دیکھنے کا غلط طریقہ

مستشرقین (Orientalists) ان مغربی اہل علم کو کہا جاتا ہے جو مشرقی معاشروں، تہذیب اور زبانوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مغربی استعماریت کے عروج کے زمانے میں یہ علم بہت ترقی حاصل کر گیا تھا۔ ان مستشرقین کی ایک بڑی تعداد کی یہ کوشش رہی کہ اسلام اور پیغمبر اسلام میں خامیاں تلاش کی جائیں۔ اسلامی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی سیرت تو پہلے ہی خامیوں سے پاک ہیں، اس لیے مستشرقین کی ان متعصّبانہ تحقیقات کا جب کبھی علمی جائزہ لیا جاتا ہے تو ان کی غلطیاں با آسانی واضح ہو جاتی ہیں۔

ایسے مستشرقین کی اصل غلطی ان کا یہ اندازِ فکر ہے کہ خامیوں کی تلاش کے لیے تحقیق کا آغاز کیا جائے۔ تاہم یہ اندازِ فکر صرف ان مستشرقین ہی تک محدود نہیں، بلکہ ہم میں سے بیشتر لوگ اسی طرح سوچتے اور ہمیشہ دوسروں کے متعلق غلط رائے قائم کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ اس اصول پر زندگی گزارتے ہیں، وہ زندگی کے ہر تعلق میں انسانوں کی خامیاں ہی دیکھتے ہیں اور انھی کی بنیاد پر ان کے بارے میں رائے قائم کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرے میں نفرتیں اور عداوتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔

ایک عام انسان خوبی و خامی دونوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ہم اگر انسان کی خوبیوں کو چھوڑ کر اس کی خامیوں کے لحاظ سے رائے قائم کریں گے تو وہ ہمارے نزدیک برا ہو جائے گا اور ہم فطری طور پر اس کے ساتھ اچھا معاملہ نہیں کریں گے۔ جواب میں وہ بھی ہم سے اچھا معاملہ نہیں کرے گا اور معاشرے میں شر بڑھے گا۔ اس کے برعکس اگر ہم کسی کے حوالے سے اس کی خوبیوں کی بنیاد پر تصور قائم کریں گے تو اس کے ساتھ ہمارا معاملہ اچھا ہو گا۔ اور جواب میں وہ بھی ہمارے ساتھ اچھا کرے گا اور یوں معاشرے میں محبت، خیر اور سکون عام ہو جائے گا۔ لوگوں کی جان، مال اور آبرو کو تحفظ ملے گا۔ یہی وہ چیز ہے جو دنیا میں انسانیت کو سب سے زیادہ مطلوب ہے۔

قیادت کا مسئلہ

ہمارے ہاں اکثر اس بات کا شکوہ کیا جاتا ہے کہ مخلص اور باشعور قیادت کا فقدان ہو چکا ہے۔ اب نہ اقبال جیسے فکری رہنما پیدا ہو سکتے ہیں اور نہ شاہ ولی اللہ جیسے مذہبی عالم، نہ قائد اعظم جیسے سیاسی لیڈر کی اب کوئی جگہ ہے اور نہ سر سید جیسے مصلح کے اٹھنے کا کوئی امکان۔ لیکن یہ نقطۂ نظر اللہ تعالیٰ کے قانون کے قطعاً خلاف ہے۔

خدا نے جب سے انسان کو اس دنیا میں بسایا ہے تب سے اس کی انفرادی اور اجتماعی ضرورت کی ہر چیز کی فراہمی کی ذمہ داری خود لے رکھی ہے۔ انسانی ضروریات ہوا، پانی، خوراک ہی نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ لوگ مختلف صلاحیتیں لے کر پیدا ہوں تاکہ اجتماعی زندگی وجود میں آسکے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ محنت، سرمایہ، عقل اور علم کا بہترین استعمال کرنے والے لوگ پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی ایک طرح کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو قوم کی قیادت اور رہنمائی کا کام کرتے ہیں۔

ہماری قوم میں بھی اللہ تعالیٰ کے اس قانون کے تحت اعلیٰ ترین درجے کے لیڈر پیدا ہوتے رہے ہیں اور آج تک ہو رہے ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں کہ ہمارے ہاں لیڈر نہیں پیدا ہوتے۔ مسئلہ یہ ہے کہ لیڈر تو موجود ہیں، ہم ان کی بات سننے، ان کی رہنمائی قبول کرنے اور ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں۔ خاص کر ہمارا مڈل کلاس طبقہ جس نے مادی آسائشوں کو زندگی کا نصب العین بنالیا ہے، وہ اپنا کردار ادا نہیں کر رہا۔

ہم اپنے بچوں میں اجتماعی خیر و شر کا شعور پیدا کرنے کے بجائے فلموں اور میوزک کا ذوق پیدا کرتے ہیں۔ ہم انہیں اپنے مذہب اور تہذیب کا شعور دینے کے بجائے منہ بگاڑ کے انگریزی بولنا سکھانا پسند کرتے ہیں۔ ہم کتاب خریدنے کے بجائے برگر خریدنا، مطالعے کے بجائے ٹی وی پر تفریحی پروگرام دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ہم مخلص اور باکردار لوگوں کا ساتھ دینے کے بجائے اپنے گھر اور کیریئرز کو مقصودِ زندگی بنانا پسند کرتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں ہمیں شکوہ اپنے آپ سے ہونا چاہیے نہ کہ ملک کے بد سے بدتر ہوتے ہوئے حالات سے۔

اعلیٰ شخصیت

اس دنیا میں لوگ جب گھر بناتے ہیں تو اس کی ہر اینٹ پتھر اور ہر کمرہ و دیوار اپنی مرضی کے مطابق تعمیر کراتے ہیں۔ ان کی خوشی، آسانی اور راحت سب کا انحصار اسی بات پر ہوتا ہے کہ ان کا گھر ان کی مرضی کے مطابق بن جائے۔ مگر یہی لوگ اپنی شخصیت جیسی قیمتی چیز کی تعمیر دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہ دوسرے لوگ ان کی شخصیت کو سکون و اطمینان سے محروم کر کے اس میں مکروہ صفات شامل کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح انہیں ایک بدصورت انسان بنا دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر لوگوں کو دیگر انسانوں سے ناخوشگوار تجربات ہر صبح و شام پیش آتے ہیں۔ اس کے جواب میں لوگ ویسے ہی رویے کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ غصے کے جواب میں غصہ، گالی کے جواب میں گالی، بہتان کے جواب میں بہتان، سازش کے جواب میں سازش، نفرت کے جواب میں نفرت ایک عام رویہ بن جاتا ہے۔ یہ عمل اپنی شخصیت دوسروں کے حوالے کرنے کا عمل ہے۔ جو دھیرے دھیرے تلخی، بدزبانی اور بداخلاقی کو ہماری شخصیت کا حصہ بنا دیتا ہے۔ ہماری اعلیٰ، فطری اور اخلاقی شخصیت منفی باتوں کے ردعمل میں خود منفی شخصیت بن جاتی ہے۔

اس کے بعد ہم ہر شخص کی شکایت شروع کر دیتے ہیں۔ اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم بھی ایسے ہی ہیں۔ ہم سے بھی لوگوں کو وہی تجربات ہو رہے ہیں جو ابتدا میں ہمیں دوسروں سے ہوئے تھے۔ مگر شکایت کی سوچ کبھی ہمیں اپنا تجزیہ نہیں کرنے دیتی۔ ہم اپنی نظر میں اچھے ہوتے ہیں اور دوسروں کی نظر میں برے ہو جاتے ہیں۔

اپنی شخصیت کی تعمیر دوسروں کے ہاتھ میں دینا ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ اس کمزوری کے ساتھ کوئی اعلیٰ شخصیت جنم نہیں لے سکتی۔ اعلیٰ شخصیت صرف اس وقت جنم لیتی ہے جب انسان اپنے اصولوں کے مطابق جی رہا ہو نہ کہ دوسروں کے طرزِ عمل کی بنیاد پر۔

علم اور شخصیت

مجھے اپنی مختصر تحریروں کے بارے ہر طرح کے ردعمل ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک ردعمل وہ ہے جس کے مطابق ان تحریروں میں کوئی خاص اور نئی بات نہیں ہوتی۔ یہ معمولی سطح کے تذکیری اور بیانیہ مضامین ہیں جن سے معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

میرے مختصر مضامین کا مقصد لوگوں کے علم کو نہیں ان کی شخصیت کو پروان چڑھانا ہوتا ہے۔ مثبت سوچ پر مبنی ایک ربانی شخصیت۔ ایک ایسی شخصیت جو زندگی کے سرد و گرم میں کبھی منفی سوچ کو خود پر غالب نہ آنے دے۔ ایک ایسی شخصیت جو زندگی انسانوں میں گزارے، مگر اس کا وجود ہر لمحہ اس کے پروردگار کے ساتھ متعلق رہے۔ ایک ایسی شخصیت جو زندگی کے بارے میں تعمیری اور مخلوق کے بارے میں خیرخواہی کا ذہن رکھتی ہو۔

ایسی شخصیت کی تعمیر بظاہر سادہ لگتی ہے، مگر یہ اس دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ اس کام کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ انسان بہت سا علم حاصل کرے۔ اس کے لیے اپنے علم کو مسلسل یاددہانی کے ذریعے سے اپنی شخصیت میں انڈیلتے رہنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے لیے اپنے علم کو دماغ کے بلند مقام سے قلب کے متواضع مقام تک لانا ہوتا ہے۔

جو لوگ کسی علمی نکتے کی تلاش میں تیز رفتاری کے ساتھ الفاظ پر نظر دوڑاتے چلے جائیں، ان کی نگاہوں سے تعمیر شخصیت کی یہ حقیقت اکثر پوشیدہ رہ جاتی ہے۔ جس کے بعد بہت سے صاحبانِ علم زندگی کے سرد و گرم میں بالکل وہی ثابت ہوتے ہیں، جس کی توقع ایک جاہل سے کی جاسکتی ہے۔ ایسے لوگوں کے علم میں ارتقا ہوتا ہے، ان کی شخصیت میں کوئی ارتقا نہیں ہوتا۔ ان کا علم بڑھتا ہے، ان کی شخصیت کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔ علم بلاشبہ ایک اہم چیز ہے، مگر اہم تر بات یہ ہے کہ زندگی کے حقائق کا سامنا علم نہیں شخصیت کرتی ہے۔

گناہ اور علم

گناہوں میں مبتلا ہونے کا ایک بہت اہم سبب علم کی کمی ہے۔ علم کی اس کمی میں ایمان و اخلاق اور شریعت کے مطالبات سے ناواقفیت بھی شامل ہے اور احکامِ دینی کی باہمی ترجیحات اور اہمیت کا علم نہ ہونا بھی شامل ہے۔

دین پر عمل کرنے میں انسان کی نجات موقوف ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ لوگ دین کا علم ایک بنیادی ضرورت سمجھتے ہوئے سنجیدگی کے ساتھ حاصل کریں۔ کیونکہ صحیح علم ہی صحیح عمل کی اساس ہوتا ہے۔ عام طور پر لوگ دین کے علم کو احکامِ شریعت ہی کے ساتھ متعلق کرتے ہیں۔ مثلاً طہارت اور غسل کے مسائل، نماز و روزہ اور حج و زکوٰۃ کے مسائل وغیرہ۔ مگر علم کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ خاص کر اخلاقی مطالبات کے حوالے سے دیے گئے احکام کی اہمیت ہی سے لوگ صرف ناواقف نہیں ہوتے بلکہ اکثر ان کے حدود و قیود سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر غیبت ایک حرام فعل ہے۔ مگر غیبت کیا ہوتی ہے اور کیا نہیں ہوتی۔ کب کی جاسکتی ہے اور کن حالات میں کسی کی برائی بیان کرنا جائز ہوجاتا ہے، وغیرہ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنھیں سیکھنا اور سمجھنا ضروری ہے۔

اس لیے یہ بات لازمی ہے کہ ہر بندۂ مؤمن ضروری دینی علم حاصل کرے۔ یہ لازمی دینی علم فرد سے متعلق شریعت جیسے عبادات، معاشرت وغیرہ کے احکام پر مشتمل ہے۔ نیز ایمانیات اور اخلاقیات کی تعلیم اور دینی مطالبات میں ترجیحات کا سمجھنا بھی اس لازمی دینی علم کا حصہ ہے۔ اس کے بغیر انسان اکثر گناہ کرتا رہتا ہے اور اسے یہ علم ہی نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی گناہ کیا ہے، تو اس پر توبہ کا کیا سوال۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ لاعلمی گناہ کا جواز نہیں بن سکتی بلکہ اپنی ذات میں ایک گناہ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ لازمی علم حاصل کیا جائے تاکہ علم کی اصلاح کے ساتھ عمل کی اصلاح کا پروسس بھی زندگی میں مستقلاً جاری رہے۔

آج کے مسلمان کی خوش نصیبی

اسلامی تعلیمات میں اہل جنت کے دو درجات بیان ہوئے ہیں۔ ایک عام جنتی اور دوسرے مقربین جن کو ملنے والا مقام اور نعمتیں غیر معمولی ہیں، (واقعہ 8-40:56)۔ اس دوسرے مقام کے حصول کے لیے نزول قرآن کے وقت اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کر کے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کی شرط لگی ہوئی تھی، (نساء 95:4)۔ چنانچہ جنت میں پروردگار عالم کا یہ قرب اور اس کے حضور بلند مقام کا حصول کوئی آسان کام نہیں۔ کسی عام آدمی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ معمول کی زندگی گزارتے ہوئے اس کا تصور بھی کر سکے۔ تاہم ختم نبوت اور مسلمانوں کے سیاسی زوال کے بعد انسانی تاریخ میں غالباً دور جدید کا زمانہ وہ واحد استثنا ہے جب خدا کے قرب اور جنت کے اعلیٰ ترین درجات کے حصول کے لیے سخت ترین قربانیوں کی شرط اٹھ گئی ہے۔

دور جدید میں اسلام کی اصل دعوت اسی طرح اجنبی ہو چکی ہے جس طرح زمانہ نبوت کے آغاز پر تھی۔ اُس دور میں اسلام قبول کر کے دین کی دعوت کا ایک حصہ بننے کا مطلب بدترین ظلم و ستم کو دعوت دینا اور جان و مال کی قربانی کے ساتھ میدان میں اترنا تھا۔ مگر آج کے دور میں جو شخص خدا کو اپنی اصل ترجیح اور دین کی اصل دعوت عام کرنے کو اپنا مشن بنا لے تو وہ بلاشبہ مقربین کے مقام کا حقدار ہو جائے گا، مگر بدلے میں اسے اس طرح کی قربانیاں نہیں پیش کرنی ہوں گی جیسی کہ اگلوں کو دینی پڑی تھیں۔ آج مذہبی آزادی کا دور ہے جس میں ہم اپنے دین کو پھیلانے اور اس پر عمل کرنے کے لیے مکمل آزاد ہیں۔ چنانچہ آج کے مسلمان کو میدان جنگ میں دشمنوں سے لڑنے کے بجائے صرف اپنے تعصّبات اور خواہشات سے لڑنا ہوگا۔ اسے ہر مسلکی تعصب سے بلند ہو کر قرآن کی دعوت کو قبول کرنا اور خواہشات کو محدود کر کے اس دعوت کو دوسروں تک پہنچانا ہوگا۔

جس شخص نے اسے اپنی زندگی کا مشن بنا لیا اور ضروریات پوری کرنے کے بعد اپنے اضافی مال اور پیسے کو اس کام میں لگا دیا، کل روز جزا اس کا بدلہ جنت کے بلند ترین درجات ہوں گے۔ کتنا آسان ہے آج کے مسلمان کا راستہ اور کتنے کم ہیں اس راستے پر چلنے والے۔

شخصیت اور ارتقا

اس دنیا میں زندگی اور ارتقا ہم معنی الفاظ ہیں۔ یہاں صرف بے جان پتھروں میں ارتقا نہیں ہوتا، وگرنہ نباتات اور حیوانات کی اس دنیا میں بڑھنا اور نشو نما پانا ہی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ ارتقا کے اصول سے انسان کو بھی کوئی استثنا حاصل نہیں ہے۔ انسان کا جسم، سوچ، معاشرہ سب ارتقا کے مستقل اور مسلسل عمل سے گزرتے ہیں۔ افراد اسی بنیاد پر یتیمی سے بادشاہت تک پہنچتے ہیں اور اجتماعیت پتھر کے دور سے اپنا سفر شروع کر کے انفارمیشن ایج میں داخل ہو جاتی ہے۔

تاہم ارتقا کا ایک اور میدان ہے جسے ہم نے نظر انداز کر رکھا ہے۔ یہ ارتقا شخصیت کا ارتقا ہے۔ انسانی شخصیت شعور کی عمر کو پہنچتے پہنچتے اپنی وراثت، ماحول اور تعلیم و تربیت کی بنا پر تشکیل پا چکی ہوتی ہے۔ مزاج، عادات، سوچ اور اقدار کا ڈھانچہ تشکیل پا چکا ہوتا ہے۔ بیشتر انسان اپنی پوری زندگی اسی ڈھانچے کے تحت گزار دیتے ہیں۔ ان کی ارتقائی سوچ کا محور اگر کوئی ہوتا ہے تو وہ مادی ترقی ہوتی ہے۔ لیکن جو آزمائش خدا نے یہاں رکھی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی شخصیت کے اس ڈھانچے کو خدائی فطری اخلاقیات اور الہامی رہنمائی کی روشنی میں تبدیل کرے۔

یہ ہر انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے مزاج، عادات، معمولات، رویوں، سوچ اور عمل کا محاسبہ کرے۔ وہ ہر منفی سوچ اور نظریے سے نجات حاصل کرے اور مثبت فکر کو اختیار کرے۔ وہ اخلاق کریمانہ کے حصول اور رذائل اخلاق سے چھٹکارا پانے کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے۔ وہ اچھی عادات اور رویوں کو اپنی شخصیت کا حصہ بنائے اور برائیوں کو کھرچ کر نکال پھینکے۔

جو شخص اس ارتقا کے عمل سے گزرتا ہے اس کی شخصیت پاکیزہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہی وہ پاکیزگی ہے جس کا بدلہ جنت کی ابدی بادشاہی ہے۔ اس بادشاہی میں انسان کے ارتقا کا نیا دور شروع ہوگا۔ لیکن یہ ارتقا امتحان کا نہیں انعام کا ہوگا۔ جہاں ہر روز انسانی وجود احساسات اور جذبات کی نئی خوشیوں سے ہمکنار ہوگا۔

شخصیت کا ارتقا اور عزم

پندرہ برس کے کسی نوجوان سے آج سوال کیجیے کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے تو جواب ملے گا کہ وہ شاندار کیریئر کی تعمیر چاہتا ہے۔ یہ کیریئر بدقسمتی سے اگلے تیس چالیس برسوں میں موت کے بے رحم پنجوں میں آ کر برباد ہو جائے گا۔ لیکن ایک کیریئر وہ بھی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ یہ کیریئر شخصیت کی تعمیر کا کیریئر ہے۔ جس کا بدلہ ختم نہ ہونے والی فردوس کی ابدی بستی ہے۔

اپنی شخصیت کی تعمیر کا شعور جتنا کم ہے اس کا عملی طریقہ اتنا ہی آسان ہے۔ انسان قرآن کریم کے اخلاقی ماڈل کو سامنے رکھے اور پھر اس کی روشنی میں ہر صبح اور ہر شام اپنا جائزہ لے۔ مثلاً انسان اپنے ماحول کے زیر اثر اگر کوئی ایسی عادت اختیار کر چکا ہے جو اللہ کے نزدیک غیر مطلوب ہے تو اس کی نشاندہی کر لے اور پھر اسے اپنی شخصیت سے نکالنے کی مہم شروع کر دے۔ یہ 'مہم' اس لیے ہے کہ کسی عادت سے چھٹکارا پانے کے لیے بڑی استقامت درکار ہوتی ہے۔

مثلاً دھیمے مزاج کے لوگوں کے لیے غصہ نہ کرنا کوئی مسئلہ نہیں۔ مگر تیز مزاج شخص کے لیے یہ ایک پوری مہم ہے کہ وہ اپنی زبان اور رویے کو قابو میں رکھے۔ ایک آہستہ رو شخص یہ بات نہیں سمجھ سکتا کہ ایک جلد باز آدمی درجنوں دفعہ نقصان اٹھا کر بھی اس عادت سے پیچھا نہیں چھڑا پاتا۔

شخصیت کا ارتقا اور تعمیر ایک مضبوط آغاز چاہتا ہے۔ بھرپور ارادے کے ساتھ ایک غلطی کو سدھارنے کا عزم۔ گو پرانی عادت اس عزم کو بار بار ڈھاتی ہے، مگر عزمِ مسلسل کی کشتی پر سوار ہو کر انسان عادت کے اس سمندر کو عبور کر ہی لیتا ہے۔ پھر یہ منفی عادت ایک نئی اور اچھی عادت سے بدل جاتی ہے۔ یہ فتح نئی فتوحات، نئی عادات اور ایک نئی شخصیت کی نوید ہوتی ہے۔

اس دنیا میں انسان کا اصل امتیاز یہ نہیں کہ اس کا جسم ارتقا پاتا ہے۔ یہ چیز تو جانوروں کو بھی حاصل ہے۔ انسان کا اصل شرف یہ ہے کہ وہ اپنی شخصیت میں ارتقا کر سکتا ہے۔ شرف انسانیت کے حامل یہی لوگ جنت کے ختم نہ ہونے والے اجر کے حقدار ہیں۔

کچھوا خرگوش کہانی: کچھ نئے پہلو

سب لوگوں کو بچپن میں سنی ہوئی کچھوے اور خرگوش کی کہانی ضرور یاد ہوتی ہے۔ اس کہانی کے مطابق کچھوے اور خرگوش میں دوڑ کا مقابلہ ہوتا ہے۔ دوڑ کے آغاز میں جب کہ کچھوا بالکل ابتدا ہی میں ہوتا ہے خرگوش اپنی تیز رفتاری کی بنا پر بہت آگے نکل جاتا ہے۔ مگر ہدف پر پہنچنے سے قبل خرگوش کو خیال آتا ہے کہ کچھوا تو ابھی بہت زیادہ پیچھے ہے، اس لیے اسے کچھ دیر درخت کے سائے میں لیٹ کر سستا لینا چاہیے۔ لہٰذا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے اور کچھ ہی دیر میں اس کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ کچھوا بغیر رکے آہستہ آہستہ چلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ سوئے ہوئے خرگوش سے آگے نکل جاتا ہے اور پھر ہدف تک پہنچ جاتا ہے۔ جب خرگوش کی آنکھ کھلتی ہے اور وہ دوڑ کر ہدف تک پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ کچھوا وہاں پہلے سے موجود ہے۔ اس طرح خرگوش اپنی تیز رفتاری کے باوجود یہ دوڑ ہار جاتا ہے۔

اس کہانی سے بچوں کو یہ سبق سکھایا جاتا ہے کہ خرگوش کی طرح انسان کو کبھی غیر ضروری طور پر خود اعتمادی کا شکار نہیں ہونا چاہیے نہ کسی کی صلاحیت کو کم تر سمجھ کر عمل سے رکنا چاہیے۔ اسی طرح یہ سبق بھی اس کہانی میں ہے کہ مستقل مزاجی اور ہمت ایک بہت بڑی صفت ہے جس کا مظاہرہ کچھوے نے کیا۔

اس کہانی کی مزید تفصیلات بھی ہیں جو کم لوگوں کو معلوم ہیں۔ ان کی تفصیل اس طرح ہے کہ دوڑ ہارنے کے بعد خرگوش دوبارہ مقابلہ رکھتا ہے اور اس دفعہ بغیر رکے دوڑتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک بڑے فرق سے کچھوے کو شکست دے دیتا ہے۔ اس سے یہ سبق ملا کہ اعلیٰ صلاحیت کے ساتھ مستقل مزاجی جمع ہو جائے تو انسان ہمیشہ دوسروں سے بہت آگے نکل جاتا ہے۔ مگر ابھی یہ کہانی ختم نہیں ہوئی۔ کچھوا شکست کے بعد بہت افسردہ ہو جاتا ہے۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ دوڑ کے میدان میں وہ کبھی خرگوش سے نہیں جیت سکتا، مگر وہ مایوس ہونے کے بجائے غور و فکر کرتا

اور ایک ایسا میدان دریافت کرتا ہے جہاں اس کی فتح یقینی ہوتی ہے۔اس کے بعد دوبارہ مقابلہ ہوتا ہے۔ایک دفعہ پھر خرگوش اس عزم کے ساتھ بھاگتا ہے کہ وہ ہدف سے پہلے ہرگز نہیں رکے گا۔مگر دوڑتے دوڑتے اچانک اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سامنے ایک دریا آ گیا ہے۔

وہ پریشان ہوکر دریا کے کنارے کھڑا ہو جاتا ہے۔اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دریا کیسے عبور کیا جائے۔بہت دیر گزر جاتی ہے اور آخر کار کچھوا آہستہ آہستہ وہاں پہنچتا ہے اور اطمینان کے ساتھ تیر کر دریا پار کر لیتا ہے اور پھر ہدف تک پہنچ جاتا ہے۔یوں خرگوش کو مستقل مزاجی اور اعلیٰ صلاحیت کے باوجود شکست ہو جاتی ہے۔

سبق یہ نکلا کہ انسان کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔بلکہ غور وفکر کی صلاحیت کو استعمال کر کے اپنی کوئی ایسی خوبی، مخالف کی کوئی ایسی خامی اور حالات و ماحول کا کوئی ایسا مددگار عنصر تلاش کرنا چاہیے جو اسے زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھا دے۔اللہ تعالیٰ نے لازماً ایسی کوئی نہ کوئی چیز رکھی ہوتی ہے۔شرط یہ ہے کہ انسان اسے تلاش کر لے۔تاہم یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ایک روز اس علاقے میں کچھ شکاری آ جاتے ہیں۔کچھوے اور خرگوش دونوں کی جان کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔خرگوش کے پیچھے شکاری اور آگے پانی ہوتا ہے جبکہ کچھوے کے لیے پانی تک پہنچنے کا وقت بھی نہیں ہوتا۔چنانچہ دونوں اپنے اختلافات ختم کر کے ایک دوسرے کی مدد کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔خرگوش کچھوے کو اپنے اوپر اٹھا کر دوڑتا ہے۔یہاں تک کہ وہ دریا کے کنارے جا پہنچتا ہے۔یہاں سے کچھوا اسے اپنے اوپر بٹھا کر دریا پار کرا دیتا ہے۔پھر خرگوش کچھوے کو اپنی کمر پر بٹھا لیتا ہے اور دوڑنا شروع کر دیتا ہے یہاں تک کہ دونوں خطرے کی زد سے نکل جاتے ہیں۔

یہ آخری حصہ ہمیں بتاتا ہے کہ مل کر کام کرنا سب سے اچھا طریقہ ہے۔اس میں سب کی جیت ہے۔مگر اس کے لیے انسان کو اپنی انا اور بڑائی کو قربان کرنا ہوتا ہے۔یہ وہ باتیں ہیں جو شاید بڑوں کی سمجھ میں نہیں آتیں، اس لیے بچہ بن کر کہانی کی شکل میں انہیں سمجھ لینا چاہیے۔

پاکستان کا فیصلہ

21 اپریل علامہ سر محمد اقبال کا یوم وفات ہے۔وہ اقبال جنہیں مصور پاکستان اور مفکر پاکستان کہا جاتا ہے۔جن کے اشعار نے ایک شکست خوردہ قوم کے تن مردہ میں زندگی کی روح پھونک دی۔جن کے افکار نے ایک عظیم مملکت کی تاسیس کی۔جن کی کوششوں نے قائد اعظم کو حصول پاکستان کی جدوجہد پر آمادہ کیا۔پاکستان انہی اقبال کا ورثہ ہے۔

وہ ایک غلام قوم کے ایسے فرزند تھے جو اعلیٰ ترین تعلیم کے حامل تھے۔جنہیں اپنی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر ملک کے اندر اور باہر ترقی کے تمام مواقع میسر تھے۔لیکن وہ 1908 میں یورپ سے لوٹ آئے۔اپنے معاش کے لیے انہوں نے وکالت کا پیشہ ضرورت کی حد تک اختیار کیا اور اپنی اصل توانائی اور صلاحیتیں قوم کے لیے وقف کر دیں۔اس کا نتیجہ 40 برس بعد دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست کی شکل میں نکل آیا۔اب ذرا چشم تصور کو وا کیجیے اور سوچیے کہ علامہ اقبال آج کل کے نوجوانوں کی طرح صرف کیریئر، معاش، شادی، بنگلے، اولاد اور بینک بیلنس کو اپنی زندگی کا مقصود بنا لیتے تو کیا ہوتا؟ صرف یہ ہوتا کہ 21 اپریل 1938 کو ایک وکیل ورثے میں چند لاکھ یا آج کل کے حساب سے چند کروڑ روپے چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو جاتا۔کہاں دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست اور کہاں چند کروڑ روپے۔

آج پاکستان کے بہترین نوجوانوں کی منزل دولت اور دنیوی کامیابی کا حصول ہے۔اس منزل کا اُخروی انجام جو بھی ہو، دنیوی انجام ایک گمنام موت اور ورثے میں چھوڑے ہوئے چند کروڑ روپے ہیں۔دوسری طرف ایک راستہ وہ ہے جو سر محمد اقبال کا ہے۔جو قومی خدمت کا ہے۔جو معاش کو ضروریات کی حد تک رکھنے کا ہے۔

پاکستان کے مستقبل کا انحصار کرپٹ لیڈروں اور سپر پاورز پر نہیں۔آج کے نوجوانوں کے اس فیصلے پر ہے جس میں ایک طرف قومی خدمت اور دوسری طرف ایک گمنام موت ہے۔

لیڈر کون

ہماری قوم اپنے لیڈروں سے بہت نالاں ہے۔اس کے نزدیک تمام مسائل کی وجہ کرپٹ، نااہل اور غیر مخلص لیڈر ہیں۔ ہر گفتگو اور ہر تجزیے کی باٹم لائن یہی ہوتی ہے کہ لیڈر بے کردار ہیں اور ان کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی،اس لیے خیر پھوٹنے کا بھی کوئی امکان نہیں۔

لوگوں کی یہ سوچ ہمارے اس رویے نے بنائی ہے جس کے تحت مسائل کا حل صرف یہ ہے کہ سیاسی لیڈروں کو ہر مسئلے کا ذمہ دار ٹھہرادیا جائے۔جبکہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی تربیت دوسرے انداز میں کرتے ہیں۔وہ بتاتے ہیں کہ ہر مومن اپنی ذات میں ایک لیڈر ہے(فرقان 74:25)۔ہر بندۂ مومن کی یہ شدید خواہش ہونی چاہیے کہ وہ اپنے زیر اثر لوگوں کی اچھی تربیت کر کے انہیں باکردار بنائے تاکہ قیامت کے دن متقیوں کے ایک لیڈر کی حیثیت سے رب کی بارگاہ میں پیش ہو۔

یہ سوچ انسان کو کبھی بے عمل، بدعمل اور مایوس نہیں ہونے دیتی۔اس سوچ کے تحت جینے والے قومی زوال کے دور میں بھی اپنی اخلاقی اور شخصی ترقی کی نئی راہیں دیکھتے ہیں۔بے کردار لیڈروں کے درمیان یہ لوگ اعلیٰ ترین لیڈر بن کر اٹھتے ہیں۔بے عمل اور بدعنوان لوگوں کے درمیان یہ اعلیٰ سیرت و اخلاق کے لوگ پیدا کردیتے ہیں۔یہ سوچ پھیلتی ہے اور آہستہ آہستہ پورے معاشرے میں اعلیٰ سیرت و کردار کے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں۔جس کے بعد کسی بدعنوان لیڈر کا معاشرے میں پنپنا ممکن نہیں رہتا۔جبکہ دوسروں پر الزام ڈالنے کی سوچ ذاتی اصلاح کے تمام دروازے بند کر کے انسان کو خود بھی کرپٹ اور بے کردار بنا دیتی ہے۔وہ برے لیڈروں کو ہٹانے کے بجائے مزید برے لیڈر اور برے پیروکار پیدا کر دیتی ہے۔

بندۂ مومن کی زندگی الزام لگانے کے لیے نہیں لوگوں کی تربیت کے لیے وقف ہوتی ہے۔ اسے لیڈروں کا غم نہیں کھاتا کیونکہ وہ خود ایک لیڈر ہوتا ہے۔

ٹی وی اور سکون

ٹی وی دیکھنا ایک تفریحی عمل سمجھا جاتا ہے۔گھریلو خواتین اور بچوں کے علاوہ دن بھر دوکان، دفتر، کاروبار اور بازار کی تھکن کے مارے ہوئے لوگ اپنی ذہنی اور جسمانی تکان اتارنے کے لیے ٹی وی کو استعمال کرتے ہیں۔خوشحال لوگوں کے گھروں میں عام طور پر بیڈروم میں بھی ٹی وی ہوتا ہے،اس لیے وہ گھر آتے ہی بستر پر لیٹ جاتے اور ٹی وی کھول کر ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں۔رات گئے تک ان کا یہی شغل جاری رہتا ہے۔

تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر حالات میں ٹی وی دیکھنے کا عمل سکون دینے کے بجائے انسان کے لیے ذہنی اذیت کا باعث بن جاتا ہے۔بظاہر ایک انسان ٹی وی پروگراموں سے لطف اندوز ہوتا ہے،مگر درحقیقت ٹی وی کے ذریعے سے منتقل ہونے والا ذہنی دباؤ اس کے اعصاب کو بتدریج کمزور کرتا چلا جاتا ہے۔

ٹی وی سے اعصابی دباؤ پیدا کرنے والی پہلی چیز بلند آواز ہے۔موجودہ دور کے ڈرامے اور فلمیں تاثر کو بڑھانے کے لیے پس منظر کی موسیقی کو استعمال کرتے ہیں۔ڈائیلاگ اور مناظر کی نوعیت کے لحاظ سے یہ موسیقی تیز اور کم ہوتی رہتی ہے۔کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ ٹی وی کی آواز کو بار بار کم اور زیادہ کرتا رہے۔اس لیے لوگ اتنی اونچی آواز کھولنے پر مجبور ہوتے ہیں جس سے ڈائیلاگ سمجھ میں آجائیں اور اس دوران میں تیز اور تکلیف دہ حد تک اونچی موسیقی انہیں جبراً سننی پڑتی ہے۔گھروں میں رہنے والے لوگوں کے لیے بھی یہ شور سخت تکلیف دہ ہوسکتا ہے،مگر جو لوگ پہلے ہی بازار اور سڑکوں پر دن بھر Noise Pollution کا شکار رہے ہوں ان کے لیے تو یہ شور زہر قاتل ثابت ہوتا ہے۔لوگ اس شور کو تفریح کی خاطر گوارا کرتے ہیں،مگر کئی برسوں میں جا کر یہ انسانی اعصاب کو شکست و ریخت میں مبتلا کر دیتا ہے۔جو آخر کار مختلف ذہنی

اورجسمانی بیماریوں کا باعث بن جاتا ہے۔

انسانی اعصاب پر ٹی وی کا دوسرا حملہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ میڈیا شو بز، کھیل اور خبروں وغیرہ کی شکل میں جو کچھ نشر کرتا ہے، وہ ہمارے جذبات کو عام معمولات زندگی سے کہیں زیادہ فعال کر دیتا ہے۔اسپورٹس چینل پر کھیل میں ہار جیت کے سنسنی خیز لمحات، نیوز چینل پر نشر ہونے والی جنگ اور بدامنی کی خبریں، فلموں ڈراموں کے خوف، دہشت، سسپنس، غم والم وغیرہ سے بھرپور مناظر، جذبات پر غیر معمولی درجے میں اثر انداز ہوکر اعصاب کو جھنجھوڑ ڈالتے ہیں۔اکثر لوگوں میں یہ مناظر فوری طور پر تو کسی نقصان کا باعث نہیں ہوتے، لیکن ایک طویل مدت میں یہ مضبوط اعصاب کے لوگوں کو بھی ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔

جذبات پر اثر ڈالنے والے ایسے ہی مناظر کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جو اخلاقی طور پر ناپسندیدہ ہوتے ہیں، لیکن لوگ ایسے مناظر اور ناچ گانوں کو شوق سے دیکھتے ہیں۔لیکن ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ اخلاقی طور پر ان کا دیکھنا ٹھیک نہیں، اس لیے ضمیر کی طرف سے ایک دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ایک طرف خارج سے آنے والا جذباتی دباؤ جب اس اندرونی دباؤ سے ملتا ہے تو غیر محسوس طریقے سے انسان کے اعصاب کو متاثر کرتا ہے۔اس طرح بظاہر مزے فراہم کرنے والی ایک چیز زہریلی گیس کی طرح انسان کے اعصاب کو گھلا دیتی ہے۔

ٹی وی کا ایک اور اثر یہ ہوتا ہے کہ لوگ بہت سے پروگراموں کے عادی ہوجاتے ہیں۔وہ ہر مصروفیت اور کام کو چھوڑ کر انہیں دیکھتے ہیں۔جس کے بعد ان کاموں کو کرنے کا وقت نہیں رہتا یا پھر انسان انہیں ٹھیک طرح نہیں پورا کر پاتا۔یہ چیز دیگر نقصانات کے ساتھ ایک نوعیت کا ذہنی دباؤ پیدا کرتی ہے۔

ٹی وی کے ذریعے دباؤ پیدا ہونے کی ایک اور شکل یہ ہے کہ لوگ گھر آ کر اپنا بیشتر وقت اسی

کام میں گزار دیتے ہیں۔جس کے بعد وہ بہت سی ایسی چیزیں ترک کر دیتے ہیں جو دن بھر کی تھکان اور دباؤ کو دور کرنے والی ہیں۔بیوی بچوں، ماں باپ، اور بہن بھائیوں کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنا، دوستوں سے گفتگو، اچھا مطالعہ اور چہل قدمی وغیرہ جیسی چیزیں جو انسان کی نفسیاتی اور ذہنی صحت کے لیے بیحد ضروری ہیں، زندگی سے خارج ہوجاتی ہیں۔ان کے علاوہ تنہائی میں بیٹھ کر غور وفکر اور خود احتسابی کا عمل جو زندگی کو بہتر بنانے کے لیے بہت ضروری ہے، معمولات میں اپنی جگہ نہیں بنا پاتا۔یہ سب چیزیں مل کر رفتہ رفتہ انسان کو ذہنی اور اعصابی تکان کا شکار کر دیتی ہیں۔جس کے بعد لوگ بہت سی عمومی اور سنگین بیماریوں کا آسانی سے نشانہ بن جاتے ہیں۔آج کل بیماریوں کی کثرت کی جہاں کچھ اور وجوہات بھی ہیں وہیں اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ٹی وی نے انسان کے اعصاب کو کمزور کر دیا ہے جس کے نتیجے میں انسانوں کی قوت مدافعت بہت کمزور ہوگئی ہے اور وہ بآسانی بیماریوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

ٹی وی دور جدید کی ایک بڑی نعمت ہے۔مگر یہ عقلمندی نہیں کہ اس نعمت کے غلط اور بیجا استعمال سے اسے اپنے لیے باعث زحمت بنا لیا جائے۔

☆☆☆☆☆☆☆

بہترین انسان وہ ہے جو مسائل حل کرتا ہے
اور بدترین وہ ہے جو مسائل پیدا کر دیتا ہے
(ابویحییٰ)

خدا کے لیے مردانہ اسلوب

دور جدید میں مرد وعورت کی برابری کا مغربی تصور دنیا بھر میں عام ہو رہا ہے۔ اس تصور کے تحت اکثر یہ سوال اٹھا دیا جاتا ہے کہ مذہبی صحائف میں اللہ تعالیٰ کے لیے ہمیشہ مذکر کا صیغہ کیوں استعمال ہوتا ہے یعنی انگریزی میں He اور اردو میں 'وہ چاہتا ہے' وغیرہ۔ یہ سوال ایک فطری سوال بھی ہے جو بڑے ہی نہیں بلکہ معصوم بچے بھی اٹھا دیتے ہیں۔

اس معاملے میں حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ مرد ہیں اور نہ عورت۔ لیکن انسانی زبانوں کی مجبوری ہے کہ ان میں جب بھی کلام کیا جائے گا تو کسی ہستی کے متعلق مرد یا عورت کے صیغے میں بات کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے جب اپنا کلام نازل کیا تو اپنے لیے مردانہ صیغہ اختیار کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عورت کوئی کمتر مخلوق ہے جس کی نسبت کرنا بھی اس نے پسند نہیں کیا۔ اس بات کا تعلق اللہ تعالیٰ سے نہیں انسانوں سے ہے۔

انسان دیکھتے ہیں کہ عورت صنف نازک ہے۔ مرد نہ صرف جسمانی طور پر عورت سے طاقتور ہوتے ہیں بلکہ زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک سماج میں ہمیشہ مردوں کو غلبہ حاصل رہا ہے۔ دنیا بھر کے صدر، وزیر اعظم، اداروں کے سربراہ وغیرہ آج بھی زیادہ تر مرد ہوتے ہیں۔ مردوں کے ساتھ غلبہ کی اس نسبت کی وجہ سے یہ نامناسب تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے لیے مؤنث کا صیغہ استعمال کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ کا انسانوں سے بنیادی تعلق مالک و آقا کا ہے۔ یہ تعلق غلبہ چاہتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے نسوانی صیغوں کے بجائے مردانہ اسالیب کا انتخاب کیا ہے۔ اس کا کوئی تعلق اس بات سے نہیں کہ عورتیں اس کی نگاہ میں کوئی کمتر حیثیت رکھتی ہیں۔

خدا کے لیے مردانہ اسلوب کا اختیار کیا جانا یہ نہیں بتاتا کہ خدا مرد ہے، بلکہ یہ بتاتا ہے کہ وہ انسانوں کا مالک ہے اور ہمیشہ غالب رہنے والی ہستی ہے۔

پہلی شکست

کچھ عرصے قبل ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کی شادی ایک دوسرے خاندان میں ہوئی۔ شادی کے دوران میں ان کی ساس کو ان کے گھر والوں سے کچھ شکایات پیدا ہوئیں۔ جس کا اظہار ان کے تلخ رویے سے ہوا۔ مگر اس کے جواب میں ان کے گھر والوں نے بہت صبر اور تحمل سے کام لیا۔ ان کی بیٹی کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا بلکہ ان کی توقعات سے اچھا سلوک کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ ہی عرصے میں لڑکی کے گھر والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ انہوں نے اپنے سابقہ رویے کی معافی مانگ لی۔ یوں جس کہانی کا انجام ہمارے معاشرے کے عام رویے کے مطابق طلاق اور زندگی بھر کی گھریلو ناچاقیوں پر ہونا چاہیے تھا، وہ معاملہ ایک بہت اچھے انداز میں طے ہو گیا۔

انسانی زندگی کا اصول ہے کہ جب برائی کا جواب برائی سے دیا جاتا ہے تو شر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ خاص کر رشتے ناتوں میں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش میں آخر کار اینٹ و پتھر اور رشتہ و ناطہ سب ٹوٹ جاتے ہیں اور تمام فریق ایک تکلیف دہ صورتحال سے گزرتے ہیں۔

اس کے برعکس اگر ابتدا ہی میں اعراض اور درگزر کا راستہ اختیار کیا جائے تو تھوڑی تکلیف اٹھا کر نہ صرف ایک تباہ کن صورتحال سے محفوظ رہا جا سکتا ہے بلکہ دوسرے فریق کو بھی اس کی غلطی کا احساس دلایا جا سکتا ہے۔ تاہم ایسا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے انسان کو اپنی انا کو کچلنا پڑتا ہے۔ انتقام لینے کی قدرت کے باوجود معاف کرنا ہوتا ہے۔ دوسرے کی برائی پر صبر کر کے اسے allowance دینا ہوتا ہے۔ اپنی پہلی شکست کو حوصلے سے جھیلنا ہوتا ہے۔

یہ کام مشکل ہے، مگر اسی کے بعد انسان دنیا و آخرت میں بہترین نتیجہ دیکھتا ہے۔ دنیا میں لوگوں کی نگاہ میں بڑا مقام پا کر اور آخرت میں خدا کی رحمت حاصل کر کے۔

دل کے غریب

مذہب اور ادب کی تاریخ میں جو خطبے لافانی شہرت اور غیر معمولی تاثیر کے حامل ہیں، ان میں سے ایک متی کی انجیل میں آنے والا پہاڑی کا وہ خطبہ ہے جو حضرت عیسیٰ نے اپنی نبوت کے ابتدائی زمانے میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس خطبے کا آغاز جس جملے سے ہوتا ہے، وہ یہ ہے:

''مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہی انھی کی ہے'' (متی 3:5)

عام طور پر اس جملے سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ اس میں سیدنا مسیح نے غریب لوگوں کو ایک عظیم خوشخبری دی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دل یا روح کے غریب (Poor in Spirit) کے الفاظ ایک زیادہ وسیع تر حقیقت کا بیان کرتے ہیں۔

دل کا غریب وہ شخص ہوتا ہے جس نے خالق کائنات کی بے حد عظمت کے مقابلے میں اپنی کلی بے کسی کو دریافت کر لیا ہو۔ جس نے اپنے مالک کی بے پناہ قدرت اور عظمت کے مقابلے میں اپنے عجز کو سمجھ لیا ہو۔ جس نے یہ جان لیا ہو کہ وہ اپنے مالک کی بے پایاں عنایات کے جواب میں اسے کچھ بھی پیش نہیں کر سکتا۔ جس کی روح اور جس کا دل اپنے آقا کی رحمت کے احساس سے اس طرح سرشار ہو کہ وہ سب کچھ کر کے بھی یہ سمجھے کہ اس نے رب کے لیے کچھ نہیں کیا۔

ضروری نہیں کہ ایسا انسان مالی طور پر غریب ہو، لیکن وہ دل کا غریب ضرور ہوگا۔ جس کے بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ، لہجے میں نرمی، انداز میں تواضع، اخلاق میں حسن، اعمال میں اخلاص، رویے میں درگزر اور مخلوق کی خیر خواہی آ جاتی ہے۔ وہ سانپ کی طرح ہشیار لیکن کبوتر کی طرح بے ضرر ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد خدا کی جنت کے لیے جینا اور دوسروں کو اس کی طرف بلانا ہوتا ہے۔ یہ چیز اگر ایک دولتمند میں ہو تب بھی وہ دل کا غریب ہے اور اگر ایک غریب میں نہ ہو تب بھی وہ اس خوشخبری کا حقدار نہیں۔

تین سطحیں

اللہ تعالیٰ نے جو کائنات تخلیق کی ہے اس کو دیکھنے کی تین سطحیں انسان نے دریافت کی ہیں۔ پہلی سطح وہ ہے جو انسانی آنکھ سے نظر آتی ہے۔ یہ جمادات، نباتات اور حیوانات کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں آسمان اور زمین ہے، شہر اور جنگل ہیں، میدان اور پہاڑ ہیں، سمندر اور صحرا ہیں۔ اس دنیا میں بے پناہ تنوع ہے، رنگینی ہے، حسن ہے اور وہ سب کچھ ہے جسے ہم شب و روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور مبہوت اور حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ اس دنیا میں خدا ہر لمحہ اپنی صفات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنی خلاقیت، ربوبیت، علم، حکمت، قدرت اور رحمت کے نمونے شب و روز لوگوں کو دکھاتا ہے۔

کائنات کی دوسری سطح وہ ہے جو بڑی بڑی دوربینوں سے نظر آتی ہے۔ یہ دنیا ستاروں اور سیاروں کی دنیا ہے۔ ختم نہ ہونے والے فاصلوں اور ان گنت کہکشاؤں کی دنیا ہے۔ روشنی اور آگ کے سورجوں اور اندھیروں اور تاریکی کے خلاؤں کی دنیا ہے۔ یہ دنیا اتنی بڑی اور اتنی ہیبت ناک ہے کہ اس کے تصور ہی سے انسان لرز اٹھتا ہے۔ اس دنیا کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سورج جیسے عظیم وجود کو ساحل سمندر پر پڑا ریت کا ایک حقیر ذرہ تصور کر لیا جائے تو ذرے کی جسامت کا اگلا ستارہ تیس کلومیٹر دور پایا جائے گا۔ اس کائنات میں اتنے ہی ستارے ہیں جتنے دنیا کے تمام ساحلوں پر ذرات ہوتے ہیں یا شاید اس سے بھی زیادہ۔

یہ دنیا خدا کی بے کراں عظمت اور اس کی بے حد قہاریت (قہار کا مطلب قابو رکھنے والا) کا مظہر ہے۔ یہ اس کی بادشاہی کا بیان ہے اور اس کے عزیز و مقتدر ہونے کا نشان ہے۔ یہ دنیا انسان کو بتاتی ہے کہ پروردگار عالم نے جس جنت کا وعدہ کر رکھا ہے اور جس کی وسعت وہ آسمان و زمین کے برابر قرار دیتا ہے، اس کی تیاری بھرپور طریقے سے جاری ہے۔ یہ ختم نہ ہونے والی کائنات انسانوں کو اطمینان دلاتی ہے کہ ان کے مالک نے ان کے لیے ختم نہ ہونے والا اجر تیار کر رکھا ہے۔ آج کا انسان جانتا ہے کہ ایک وقت میں ہماری جنت نظیر زمین بھی اس کائنات کی طرح ڈھنڈار و بے کار تھی، مگر آج سرسبزی،

حسن اور شادابی کا شاہکار ہے۔اسی طرح اس کائنات میں ہر لمحہ جب ایک نیا ستارہ پیدا ہوتا ہے تو وہ کسی نئے نیکوکار کے اجر کا بدلہ ہوتا ہے، پروردگار آہستہ آہستہ اس کو بھی جنت بنادے گا۔ یہاں تک کہ روز قیامت برپا ہوگا اور نیکوکار اپنے اس اجر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

کائنات کی تیسری سطح وہ ہے جو خوردبین یعنی مائیکرو اسکوپ کی آنکھ سے نظر آتی ہے۔ یہ دنیا خلیات (Cell) بیکٹیریا اور ایٹم کی دنیا ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جس سے خدا نے پہلی دو دنیاؤں کو تخلیق کیا ہے۔ یہ دنیا بھی اپنے اندر کچھ کم عجوبے نہیں رکھتی۔ یہی عجوبہ کیا کم ہے کہ انسان نظر نہ آنے والے خلیات کے مجموعے سے بنا ہے۔ عناصر آنکھ سے پوشیدہ رہنے والے ایٹموں سے بنے ہیں۔ پھر ان ایٹموں کا تجزیہ کرتے چلے جائیں تو اندر سے ایک جیسے ذرات یعنی الیکٹران اور پروٹان وغیرہ نکلتے ہیں۔ ان کی ترتیب میں معمولی تبدیلی سے کائنات کا ہر تنوع اور تخلیق وجود میں آتی ہے۔

اس دنیا میں خدا باریک بین ہے، لطیف و خبیر ہے، حی و قیوم ہے، سمیع و بصیر ہے اور دلوں کا حال جاننے والا علیم بذات الصدور ہے۔ یہ دنیا انسان کو اس علیم و خبیر ہستی کے حضور پیشی کا احساس دلاتی ہے۔ اس دنیا میں انسان دیکھتا ہے کہ خود اس کا اپنا وجود کتنی حقیر اور بے وقعت چیز سے جنم لیتا ہے۔ وہ ایک سے دوسرے مرحلے تک گزرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پورا آدمی بن جاتا ہے۔ پھر یہ انسان زندگی کے مختلف مراحل سے گزر کر موت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ مگر اس کی پہلی تخلیق اسے یہ پیغام دے چکی ہے کہ وہ اگر پہلی دفعہ پیدا ہوا ہے تو دوسری دفعہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور بلاشبہ وہ دوبارہ پیدا ہوگا۔ اس روز اسے اپنے اعمال کا جواب دینا ہوگا۔ اسے اپنی سیرت اور کردار کو محاسبے کے لیے پیش کرنا ہوگا۔

آج انسان کے پاس موقع ہے کہ وہ ان تینوں سطحوں پر خدا کی صفات کو دیکھے اور اس کی مرضی کے مطابق اپنی سیرت و کردار کو ڈھال لے۔ ایمان کو معرفت اور علم کو عمل میں ڈھال لے۔ جس نے یہ کیا وہ ختم نہ ہونے والی کائنات کی ختم نہ ہونے والی نعمتوں میں بسایا جائے گا۔ اور جو یہ نہ کرسکا وہ ابد تک اپنی بدنصیبی پر ماتم کرتا رہے گا۔

لیڈرشپ کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں اجتماعیت کے شعور کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس شعور کا نتیجہ ہے کہ وہ گھر اور خاندان بناتے، تنظیموں اور اداروں کی صورت گری کرتے، قوم اور معاشروں کو وجود بخشتے اور ملک اور ریاست کی تشکیل کرتے ہیں۔ ان کی اجتماعیت کا یہ شعور ان کی طاقتوں کو مجتمع کرتا اور انھیں اس قابل بناتا ہے کہ وہ کم تعداد اور وسائل میں ہونے کے باجود مشکل حالات پر قابو پاکر ان مقاصد کو حاصل کرلیں جنہیں وہ تنہا کسی صورت بھی حاصل نہیں کرسکتے تھے۔

اجتماعیت کا ایک لازمی تقاضہ ہے کہ انسان اپنے درمیان میں سے کسی شخص کو قیادت کے منصب کے لیے چنیں جو ان کی منتشر انفرادیت کو اپنی شخصیت اور فیصلوں کے ذریعے سے ایک اجتماعی شکل دے سکے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک بلند اور اعلیٰ مقام ہے جو ہر کسی کو نہیں مل سکتا۔ وقت اور حالات گرچہ بہت سوں کو لیڈر کے مقام پر پہنچا سکتے ہیں، مگر یہی وقت اور حالات کچھ عرصہ میں یہ فیصلہ کردیتے ہیں کہ کون حقیقی لیڈر ہے اور کون محض قسمت کی کرم نوازی کی بنا پر اس مقام پر پہنچا ہے۔ تاہم اس عرصہ میں وہ لیڈر اپنے ساتھ اپنی قوم، ملت، پیروؤں اور مقتدیوں کی بربادی کا سامان کرچکا ہوتا ہے۔ اس لیے اس بات کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ ایک حقیقی لیڈر کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں تاکہ صاحبانِ شعور، لیڈر کا انتخاب کرتے اور اس کے پلڑے میں اپنا وزن ڈالتے ہوئے درست فیصلہ کرسکیں۔

ایک حقیقی لیڈر عام لوگوں سے کئی اعتبار سے بلند اور برتر جگہ کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن ان میں سب سے اہم چیز اس کی اخلاقی حیثیت ہوتی ہے۔ لوگ کسی اعلیٰ مقصد کے لیے ایسے کسی آدمی کا ساتھ نہیں دے سکتے جس کی اخلاقی سطح انہیں اپنی ذات سے پست محسوس ہو۔ اگر ایسا کبھی ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے مفادات و تعصّبات نے ان لوگوں کو اکھٹا کیا ہے نہ کہ کسی

اعلیٰ وارفع مقصد نے۔

اعلیٰ اخلاقی شخصیت کے علاوہ بھی لیڈر کئی دیگر پہلوؤں سے عام لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ وہ لوگوں کو اپنی گفتگو، وجاہت، اخلاق وسیرت، علم وشخصیت، طاقت وذہانت اور دیگر وہبی (God Gifted) اور اکتسابی صلاحیتوں کی مدد سے متاثر کرتا، انھیں اپنا بناتا اور کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے انہیں اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ وہ ان کے مشورے اور تنقیدیں تحمل سے سنتا، اختلافات کو رفع کرتا اور غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کی یہی خصوصیات بہترین صلاحیت کے حامل لوگوں کو اس کے اردگرد اکھٹا کر دیتی ہیں اور پھر ان کی صلاحیتوں، وسائل اور توانائیوں کو مجتمع کر کے وہ اجتماعی مقاصد کو حاصل کرتا ہے۔

لیڈر کی ایک اور بنیادی خصوصیت مشکلات میں حوصلہ برقرار رکھنا اور دباؤ برداشت کرنے کی صلاحیت ہے۔ لیڈر پر حالات، دوست، دشمن سب یکساں طور پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ ایسے میں اگر اس میں حوصلہ اور برداشت نہ ہو تو حالات اس سے غلط فیصلہ کرا دیتے ہیں، مخالفین اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے اور دوست نامناسب اقدامات سرانجام دلوا دیتے ہیں۔ ایسی صورتحال سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ لیڈر حالات پر گہری نظر رکھتا ہو، متعلقہ شعبے کا پورا علم رکھتا ہو، اس میں تجزیہ وتحلیل کی بھرپور صلاحیت ہو، اپنے مقاصد اور ان کے حصول کے طریقۂ کار کے بارے میں اس کا ویژن بالکل واضح ہو۔

لیڈر کی ایک اور خصوصیت صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہے۔ لیڈر کا اصل کام فیصلہ کرنا ہے۔ وہ فیصلے کرتا ہے اور یہی فیصلے لوگوں کی تقدیر بناتے ہیں۔ درست فیصلوں کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقصد کے تقاضوں کے مطابق ہوتے ہیں نہ کہ رجحانات، مفادات، خواہشات اور جذبات کے مطابق۔

ٹھیک فیصلے کی ایک نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ ٹھیک وقت پر ہوتا ہے۔ ٹھیک وقت وہ ہوتا

ہے جب متوقع فائدہ زیادہ سے زیادہ اور نقصان کم سے کم ہو، کیونکہ ہر فیصلہ میں کچھ نفع ہوتا ہے اور اس کی کچھ قیمت ہوتی ہے۔ ٹھیک وقت کا علم حالات اور لوگوں کے بارے میں باخبر رہنے کی اس صفت کا نتیجہ ہے جو انسان کو مستقبل میں دیکھنے کی نگاہ عطا کرتی ہے۔ چنانچہ باخبر رہنے لیے اسے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کرنے چاہییں۔

فیصلہ غلط ہو جائے تو ایک حقیقی لیڈر ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ مگر اسے اپنی کمزوری کا تاثر کبھی نہیں دینا چاہیے۔ کمزور لوگ کبھی لیڈر نہیں بنتے۔ اصل چیز یہ ہے کہ وہ تجزیہ کر کے غلط فیصلے کی وجہ بننے والے اسباب کا تعین کرے اور ذمہ دار لوگوں کو تنبیہ کرے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر لوگوں کی کمزوریوں کی رعایت کرنے، ان سے چشم پوشی کرنے اور لوگوں کو معاف کرنے کی عادت بھی ہونی چاہیے۔

لیڈر انسان ہوتا ہے، مگر عام انسان نہیں ہوتا۔ وہ منتظم اور مینیجر بھی نہیں ہوتا۔ وہ اعلیٰ کردار، متاثر کن صلاحیتوں، صحیح وغلط کی تمیز، صبر وحلم اور حوصلہ مندی کے اوصاف کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہی چیزیں لیڈر کو لیڈر بناتی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

جنت کا حقیقی مستحق وہ ہے جو
قربانی کے درجے میں اس کا طلبگار رہے
آج کا مسلمان تو
خواہش کے درجے میں بھی اس کا طلبگار نہیں (ابو یحییٰ)

استقامت

میرے پاس اکثر لوگ ایک مسئلہ لے کر آتے ہیں۔ وہ یہ کہ اچھائی کے کسی کام کو شروع کرنے کے بعد وہ استقامت کے ساتھ اس پر قائم نہیں رہ پاتے۔ وہ نیکی کا ایک کام جوش وخروش کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔ مگر تھوڑا عرصہ نہیں گزرتا کہ ان کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جس نیکی کا آغاز انہوں نے کیا تھا وہ بھی کہیں اِدھر اُدھر ہو جاتی ہے۔

یہ مسئلہ کسی ایک انسان کا نہیں بلکہ انسانی سرشت کا ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے آدم کو ایک خاص درخت کا پھل کھانے سے منع کیا تھا۔ مگر وہ بھول گئے اور ہم نے ان میں عزم نہیں پایا، (طٰہ 115:20)۔ قرآن کی یہ بات اس حقیقت کا بیان ہے کہ انسان عہد اور ارادہ کر لیتا ہے۔ مگر جب اس کی توجہ دوسری طرف مبذول ہوتی ہے تو وہ پرانی بات کو بھول جاتا ہے۔ یہی چیز انسان کے عزم واستقامت کو توڑ دیتی ہے۔

اس مسئلے کا حل بار بار عزم وارادہ کرنا ہے۔ یہ عزم ظاہر ہے کہ خود پیدا نہیں ہوتا۔ خارج کی کسی تلقین سے آتا ہے۔ اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو نازل فرمایا اور اسے ایک یاد دہانی قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآن بار بار انسانوں کو صبر واستقامت کی تلقین کرتا ہے۔ صبر صرف غم برداشت کرنے کا نام نہیں بلکہ ہر طرح کے حالات میں اپنے موقف اور عمل پر جمے رہنے کا نام ہے۔

انسان جب بھی کوئی نیک عمل اختیار کرتا ہے تو فطری طور پر کچھ عرصے میں اس کی دلچسپی اس عمل کے ساتھ کم ہو جاتی ہے یا حالات اس عمل کے لیے سازگار نہیں رہتے۔ ایسے میں قرآنِ پاک کی صبر واستقامت کی تعلیم کو یاد رکھنا چاہیے۔ عمل چاہے تھوڑا ہو، مگر مستقل مزاجی کے ساتھ ہو۔ تھوڑا انفاق، تھوڑے نوافل جب عمر بھر کیے جاتے ہیں تو بہت ہو جاتے ہیں۔ بہت سارا عمل چند دفعہ کرنا کبھی اس کے برابر نہیں پہنچ سکتا۔ خدا کے ہاں معتبر عمل وہ نہیں جو چند دفعہ کیا جائے۔ معتبر عمل وہ ہے جو چاہے کم ہو، مگر عمر بھر پابندی کے ساتھ کیا جائے۔

حالات بڑے خراب ہیں

یہ صاحب ایک دفعہ پھر میرے روبرو تھے۔ پچھلے برس ان کی بات کا خلاصہ تھا کہ بہت ٹینشن ہے۔ اب ان کی بات کا خلاصہ تھا کہ حالات بڑے خراب ہیں اور بہتری کی کوئی امید نہیں۔ اس دفعہ وہ ملک چھوڑنے کے لیے پر تول رہے تھے۔

میں نے عرض کیا: حالات واقعی بہت خراب ہیں۔ مگر آپ کے باہر جانے سے حالات زیادہ خراب ہو جائیں گے۔ کیونکہ ایک اور اچھا آدمی قوم کے خیر وشر سے بے نیاز ہو کر اپنی اور اپنے بال بچوں کی زندگی کو مقصد حیات بنا لے گا۔ اس ملک کے حالات برے لوگوں نے خراب نہیں کیے۔ ان اچھے لوگوں نے خراب کیے ہیں جو خیر وشر کی کشمکش میں غیر جانبدار رہتے ہیں۔ جو اپنے بیوی بچوں اور نوکری اور کاروبار کے سوا کچھ سوچتے نہیں۔

آپ نے اس ملک کے بدترین حالات میں صرف اپنی دنیا کی تباہی کے آثار دیکھے ہیں۔ آپ یہ نہیں دیکھ سکے جو بندۂ مومن اس وقت ڈٹ گیا اور مقابلے پر کھڑا ہو گیا، مایوسی کے اندھیروں میں امید کے چراغ جلانے لگا، تعصب اور مفاد پرستی کے اس جنگل میں ایمان واخلاق کے پھول کھلانے لگا، کل قیامت کے دن وہ شخص نبیوں کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ خدا کی رحمتوں میں اسے سب سے بڑھ کر حصہ ملے گا۔ حشر کے دن وہ عرش الٰہی کے سائے میں کھڑا ہوگا۔ خدا کے مقرب ترین بندوں میں اس کا شمار ہوگا۔ نعمتیں دیتے وقت اسے آسمان وزمین کی بادشاہی اور خزانوں سے نوازا جائے گا۔ اس کے بہت چھوٹے عمل کو خدا بہت بڑی حیثیت دے دے گا۔ اس کی بڑی بڑی خطاؤں کو دیکھ کر بھی خدا ان کا احتساب نہیں کرے گا۔

ہاں حالات بہت خراب ہیں، اگر جینا صرف اسی دنیا کے ساٹھ ستر برس کا نام ہے۔ اگر موت کے بعد کوئی زندگی نہیں تو حالات بہت خراب ہیں۔ لیکن اگر خدا حق ہے، جنت حق ہے، جہنم حق ہے، نبی حق ہے، قیامت حق ہے تو یقین جانیے یہی بہترین حالات ہیں۔

سونا اور مٹی

انسانی تاریخ میں ہمیشہ سونے کو ایک قیمتی دھات سمجھا گیا ہے۔اس کی چمک دمک نے ہر دور میں انسانوں کی نظروں کو خیرہ کیا اور زنگ سے محفوظ رہنے کی صلاحیت نے ہمیشہ انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کیے رکھا ہے۔سونے کے برعکس انسانوں کے ہاں مٹی کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ایک شخص سونے کی انگوٹھی کے بدلے میں مٹی کی انگوٹھی کبھی نہیں لے گا۔یہ تبادلہ شاید اس وقت ممکن ہوتا اگر مٹی کی انگوٹھی طویل مدت تک قابل استعمال رہتی اور سونے کی فوراً ٹوٹ کر ضائع ہو جاتی۔ مگر سب جانتے ہیں کہ مٹی کی انگوٹھی اگر بنائی جائے تھوڑے ہی استعمال کے بعد ٹوٹ جائے گی اور سونے کی انگوٹھی طویل مدت تک قابل استعمال رہتی ہے۔

جو فرق سونے اور مٹی کی انگوٹھی میں ہے وہی فرق دنیا اور آخرت میں ہے۔آخرت سونے سے زیادہ قیمتی اور دلکش ہے اور دنیا اس کے مقابلے میں مٹی سے بھی کم ہے۔بات اگر اتنی ہوتی تب بھی آخرت اس قابل تھی کہ دنیا کے مقابلے میں اسے ترجیح دی جاتی ،مگر اس سے بڑی اور تلخ حقیقت یہ ہے کہ دنیا اور اس کی زندگی مختصر اور فانی ہے جبکہ آخرت سونے سے زیادہ قیمتی ہونے کے باوجود ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔اس لیے کوئی معقول آدمی کبھی دنیا کے عوض اپنی آخرت کو گنوانے کی حماقت نہیں کرسکتا۔

مگر اس کے باوجود بیشتر انسان دنیا کی فانی اور حقیر لذتوں کو اپنی منزل بنائے رکھتے ہیں۔اس کا سبب یہ ہے کہ اپنی زندگی آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے اصول پر گزارتے ہیں۔یعنی دنیا کا حقیر نفع سامنے اور آخرت کی اعلیٰ نعمتیں نگاہوں سے اوجھل ہو کر غیر اہم بن جاتی ہیں۔تاہم جو شخص ایمان کی بینائی پیدا کرلے وہ کبھی سونا دے کر مٹی نہیں لے گا۔ وہ کبھی آخرت کی قیمت پر دنیا کو قبول نہیں کرے گا۔وہ کبھی فانی دنیا کے لیے ابدی آخرت کا نقصان نہیں اٹھائے گا۔

بسم اللہ

خدا کی بندگی اور اس کی یاد میں جینا دینی مطالبات کا خلاصہ ہے۔مگر اس کا طریقہ دنیا چھوڑنا نہیں بلکہ اس میں رہتے ہوئے رب کو یاد رکھنا ہے۔اسی پس منظر میں کھانے پینے سے قبل یہ سنت مقرر کی گئی ہے کہ اللہ کا نام لے کر اور سیدھے ہاتھ سے کھایا پیا جائے۔

ایک زمانے تک ہمارے ہاں دستور تھا کہ کھانے کے وقت اہتمام کے ساتھ بچوں کو بسم اللہ پڑھائی جاتی تھی۔مگر بدقسمتی سے اکثر گھروں میں اب یہ رواج ختم ہوگیا ہے۔ یہ محض ایک معاشرتی رواج نہ تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ بچے زندگی بھر جب کبھی کچھ کھائیں پیئیں تو اللہ کا نام لینا ان کی گھٹی میں پڑ جائے۔دین نے یہ طریقہ اس لیے مقرر کیا تھا کہ زندگی کے عظیم ترین حقائق کی یاد دہانی انسانوں کو حاصل ہوتی رہے۔

پانی اور خوراک زندگی کو برقرار رکھنے والی بنیادی نعمتیں ہیں۔انسان کی ساری سعی و جہد کا بنیادی مقصد خوراک کا حصول ہے۔انسان جو کچھ کماتا ہے اس کا پہلا استعمال وہ اسی خوراک کو حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے۔گویا کھانے کے وقت اللہ کا نام لینا کوئی سادہ بات نہیں۔یہ اپنی ساری سعی و جہد اور اس سے حاصل ہونے والی تمام نعمتوں کو خدا کے نام کر دینے کا عمل ہے۔ یہ اپنے وجود کی بقا کے لیے خدا کی فراہم کردہ نعمتوں کو اسی کی طرف منسوب کرنے کا عمل ہے۔جبکہ سیدھے ہاتھ سے کھانا زبان حال سے یہ دعا کرنا ہے کہ روز قیامت مجھے ان کامیاب لوگوں میں کر دیا جائے جن کو اپنا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں ملے گا اور وہ ہمیشہ خدا کی نعمتوں میں زندہ رہیں گے۔

کھانے کی صرف یہی اہمیت نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ان عظیم نعمتوں کی یاد دہانی ہے جن میں انسان دن رات جیتا ہے۔خوراک کو وجود میں لانے کے لیے پوری کائنات کی طاقتیں استعمال

ہوتی ہیں، تب ہی کھانے کی وہ چیز وجود میں آتی ہے جسے ہم بہت معمولی چیز سمجھ کر کھا جاتے ہیں۔

سورج اپنی حرارت نہ دے، سمندر اپنا پانی نہ دے، آسمان اپنے بادل نہ دے، دریا اپنی روانی نہ دے اور زمین اپنی زرخیزی نہ دے تو صفحۂ ہستی سے ہر سبزہ و نباتات اور حیوان کا خاتمہ ہوجائے۔ اس کے بعد یہ چھ فٹ کا انسان تڑپ تڑپ کر بھوک اور پیاس سے مرجائے گا اور کوئی نہیں ہوگا جو اس کی بھوک پیاس مٹا سکے۔ اس کی زندگی بچا سکے۔

خوراک کو عظیم ترین نعمت بنانے والی چیز غذائی تنوع (variety) بھی ہے۔ انسان کبھی یکسانیت پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ انسان کے دسترخوان پر اتنے ذائقے، رنگ اور خوشبوئیں جمع کردی گئی ہیں جس کی مثال کسی اور مخلوق کے لیے نہیں ملتی۔ سبزی، اناج، مرچ مصالحے، گوشت اور ڈیری وغیرہ میں ان گنت اقسام کی چیزیں انسان کو میٹھا، کھٹا، ترش، نمکین اور دیگر کئی طرح کے ذائقے کی چیزیں فراہم کرتے ہیں۔

پھر یہ خوراک جسم انسانی میں موجود ایک انتہائی پیچیدہ نظام ہضم کے ذریعے سے توانائی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ جس کے بعد انسان روزمرہ کے کام کاج کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ اس کے جسم میں نشوونما ہوتی ہے اور اس کی قوت اور زندگی میں اضافہ ہوتا ہے۔

خوراک جیسی بنیادی نعمت کے لیے کائناتی قوتوں کو حرکت میں لانے والا، خوراک میں ورائٹی اور ذائقہ پیدا کرنے والا، اسے ہاضمے کے خودکار عمل سے گزار کر انسان کو طاقت و توانائی اور زندگی فراہم کرنے والا رب بلاشبہ اس قابل ہے کہ جب کبھی کچھ کھایا پیا جائے، اسی کا نام لیا جائے۔ مگر بدقسمتی سے آج کے مسلمانوں کو یہ چھوٹا عمل بھی بہت گراں گزرنے لگا ہے۔ اہم ترین نعمتیں فراہم کرنے والا رب اتنا غیر اہم ہوگیا ہے کہ اس کے نام کے دو لفظ بھی زبان سے نکالنے یاد نہیں رہتے۔ اس سے زیادہ ہماری بدقسمتی اور کیا ہوسکتی ہے۔

بلو واٹر جیلی

اللہ میاں نے بلو واٹر جیلی کیوں پیدا کیے ہیں؟ واپسی کے سفر میں میری چھ سالہ بھتیجی طوبیٰ نے مجھ سے سوال کیا۔ سوال کا پس منظر یہ تھا کہ آج ساحل سمندر پر اس آبی مخلوق نے اسے کاٹ لیا تھا۔ اس کا زہر اتنا شدید ہوتا ہے کہ انسان دو گھنٹے تک شدید ترین اذیت سے تڑپتا رہتا ہے۔

جو سوال بلو واٹر جیلی کے بارے میں پیدا ہوتا ہے، وہ دنیا کے ہر دکھ و تکلیف کے بارے میں درست ہے کہ آخر یہ مصائب رکھے ہی کیوں گئے ہیں؟ اس سوال کا جواب طوبیٰ نے اپنے عمل سے دے دیا تھا۔ وہ جب تک تکلیف میں تھی یہی کہتی رہی کہ آئندہ پانی میں نہیں جاؤں گی، مگر جیسے ہی تکلیف ختم ہوئی وہ دوبارہ مزے کرنے سمندر کی موجوں میں چلی گئی۔

ہر انسان عمر بھر اسی طرح بچپنے میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ ساری عمر خواہش کے سمندر میں تیرنا اور لطف و سرور کی موجوں کو انجوائے کرنا چاہتا ہے۔ انجوائمنٹ کی یہ سوچ اسے بہت سطحی بنا دیتی ہے۔ وہ خدا، جنت اور جہنم جیسے غیر محسوس حقائق کو سنجیدگی کے ساتھ لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ موت کے سخت ترین امتحان میں کامیابی کے بجائے وقتی لذتوں کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے۔ مگر یہ رویہ انسان کو آخر کار جہنم کے اس گڑھے تک پہنچا سکتا ہے جہاں ہر لمحہ ہر طرف سے بلو واٹر سے زیادہ زہریلے کیڑوں اور آگ کے شعلوں کی یلغار ہوگی اور انسان ابد تک روتا اور تڑپتا رہے گا۔

ایسے میں اللہ تعالیٰ مصائب و آلام کے بلو واٹر اس کی زندگی میں بھیج کر اسے خواہش کے سمندر سے نکلنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب انسان اپنے رب کی بات سننے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ جس کے بعد انسان اور جنت کے بیچ میں صرف ایمان اور عمل صالح کا وہ میدان رہ جاتا ہے جسے عبور کرنا بے حسی کے صحرا کو پار کرنے کے مقابلے میں بہت آسان ہے۔

یہی مصیبت اور تکلیف کا سبب بننے والے ہر 'بلو واٹر' کی تخلیق کا اصل مقصد ہے۔

سچی خداپرستی

اس دنیا میں انسان ہر مرحلۂ زندگی میں کسی نہ کسی چیز کو اپنا اصل مسئلہ، اپنی بنیادی ترجیح اور اپنا Main Concern بناتا ہے۔ بچپن میں کھیل کود، لڑکپن میں تعلیم، نوجوانی میں کیریئر، جوانی میں شادی، ادھیڑ عمر میں مال اور اسٹیٹس اور بڑھاپے میں اولاد انسان کے لیے ہر چیز سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ خدا اور مذہب بھی لوگوں کے نزدیک اہم ہوتے ہیں، مگر یہ ان کی اصل زندگی نہیں بنتے بلکہ دنیادارانہ زندگی کا بس ایک جز ہوتے ہیں۔ یہ جز بھی اپنا ظہور قلب و روح کی سطح پر کم ہی کرتا ہے اور ان کی تمام تر خداپرستی کچھ ظاہری اعمال، مخصوص وضع قطع اور اپنے مسلک اور فرقہ سے متعلق اعمال و تصورات کے بیان و تعمیل تک محدود رہتی ہے۔

مگر یہ سچی خداپرستی نہیں۔ سچی خداپرستی خدا کو اپنی سب سے بڑی ترجیح بنانا ہے۔ اس کے حکم کو اپنی خواہش پر غالب کرنا ہے۔ اس کے دین کو ہر تعصب سے بلند ہو کر سمجھنا اور اختیار کرنا ہے۔ اس کی یاد کو اپنی ہر مشغولیت میں قائم رکھنا ہے۔ اس کی ملاقات کے شوق کو انسانوں میں عام کرنا ہے۔ اس کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانا اپنا سب سے بڑا مقصد بنانا ہے۔

یہ سچی خداپرستی اختیار کرنا کبھی بھی آسان نہ تھا۔ لیکن اِس دورِ خواہش میں جب دنیا آسائش و سہولیات اور نت نئی دلچسپیوں کی وجہ سے ہمیشہ سے زیادہ پرکشش ہو چکی ہے، سچی خداپرستی اختیار کرنا ہمیشہ سے زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ مگر یہی وجہ ہے کہ اب جو شخص اس خداپرستی، اس ربانیت کو اختیار کرے گا اس کا بدلہ جنت کا اعلیٰ ترین مقام ہوگا۔ یہ وہ مقام ہے جس کے لیے پچھلے لوگوں کو جان اور مال کی قربانی دینی پڑتی تھی، مگر آج صرف خواہش اور تعصب سے بلند ہو کر اعلیٰ اخلاقی رویہ اختیار کرنا اور سچی خداپرستی کو دوسروں میں منتقل کرنے کو اپنا مشن بنانا وہ کام ہے جو انسان کو ابدی فردوس کے اعلیٰ ترین مقام کا حقدار بنا سکتا ہے۔

خدا کی گنتی میں

''میں نے اپنے مینیجر سے کہا کہ ان لوگوں کو اب میری گنتی سے نکال دو۔ ان لوگوں کا مال معیاری نہیں، اس لیے ہم ان سے مال نہیں خریدیں گے...... میرا مینیجر چلا گیا تو میں سوچنے لگا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے میرے بارے میں یہی رائے قائم کر لی اور مجھے اپنی گنتی سے نکال دیا تو میرا کیا انجام ہوگا؟ مجھے بتائیے کہ میں کیسے جانوں کہ میں خدا کی گنتی میں ہوں یا نہیں؟ مجھے کیسے اطمینان ہو کہ خدا مجھے اپنے بندوں میں گنتا ہے یا نہیں؟''

میرے سامنے جو شخص بیٹھا تھا وہ پانچ وقت کا نمازی اور دیندار شخص تھا۔ اس کے اخلاقی اور عملی معاملات میں کوئی خرابی میرے علم میں نہیں تھی۔ آج کی مروجہ دینداری میں تو لوگ علم اور اخلاق کی ہر پستی میں اتر کر بھی اپنی نظر میں اعلیٰ و ارفع رہتے ہیں۔ ایسے میں اِس شخص کا یہ سوال بڑا عجیب تھا۔ مگر اس سوال کا جواب خود سوال میں پوشیدہ تھا۔ میں گویا ہوا:

''آپ نے اپنی گنتی سے غیر معیاری مال فراہم کرنے والے کو نکالا تھا۔ خدا بھی اپنی گنتی سے غیر معیاری ایمان اور عمل والے کو نکال دیتا ہے۔ یہ وہ ایمان ہوتا ہے جس میں خدا کے ساتھ غیر اللہ کی عظمت اور بڑائی بھی دل میں موجود ہوتی ہے۔ جس میں اللہ کے رسول کے ساتھ اپنے اکابرین، اپنے فرقے اور اپنے مسلک کا نقطۂ نظر بھی حق و باطل کا معیار ہوتے ہیں۔ جس میں عمل کے وقت اللہ کے ساتھ مخلوق کی رضا اور آخرت کے مفاد کے ساتھ ساتھ دنیا کا مفاد بھی پیش نظر ہوتا ہے۔ خدا کے دین کے ساتھ ساتھ انسان کے اپنے تعصّبات اور جذبات بھی صحیح و غلط کا فیصلہ کرتے ہیں۔ عدل و احسان کے ساتھ ساتھ ذاتی پسند و ناپسند اور انا کا خیال بھی رکھا جاتا ہے۔

ایسے غیر معیاری ایمان اور عمل والوں کو خدا اپنے مخلصین میں نہیں گنتا۔ چاہے وہ اپنی نظر میں کتنے ہی نیک ہوں۔ چاہے وہ دوسرے انسانوں کی نظر میں کتنے ہی دیندار ہوں۔''

تحقیق کی ذمہ داری

اس دنیا میں کوئی بھی انسان عالمِ شباب اور عالمِ شعور میں پیدا نہیں ہوتا۔ وہ بچپن اور لڑکپن کی ناپختہ سیڑھیوں سے گزر کر شعور کی پختہ عمر کو پہنچتا ہے۔ اس عمر تک پہنچنے سے قبل وہ اپنے اردگرد موجود دنیا کا حصہ ہوتا ہے۔ کچھ رسوم و آداب اس کے ماحول میں جاری وساری ہوتے ہیں۔ کچھ عرف وعادات اس کی معاشرتی زندگی کا جز ہوتے ہیں۔ کچھ اخلاقی، سماجی اور مذہبی تعلیمات اسے ماحول، تربیت اور ورثے میں ملتی ہیں۔ انسان اسی دنیا میں جیتا اور اسی سے اپنے اعمال و تصورات کا گھروندا بناتا ہے۔ دیگر چیزوں کی طرح انسان اپنے عقائد، عبادات، شعائر اور مراسم وغیرہ بھی اسی دنیا سے ایک ناپختہ عمر میں اخذ کرلیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ شعور کی عمر میں آنے کے بعد انسان معتقدات کی اس دنیا کو تباہ کرنے نکل کھڑا ہو۔ دین کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ جو کچھ وہ مان رہا ہے اور جو کچھ وہ کر رہا ہے اس میں جب جب کوئی سوال، کوئی کھٹک، کوئی شک پیدا ہو تو انسان سر جھٹک کر آگے نہ بڑھ جائے۔ اس کی فطرت جب کسی چیز کو قبول کرنے سے انکار کردے، اس کا ضمیر جب اس کی راہ میں آکر کھڑا ہو جائے، اس کی عقل جب کسی بات کو ماننے میں متردّد ہو جائے، کوئی بندۂ خدا جب اس کی توجہ کسی غلطی کی طرف مبذول کرادے، تو انسان پر لازم ہے کہ وہ ذرا دیر کو ٹھہر جائے۔ وہ صحیح وغلط اور حق و باطل میں فرق کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اپنے سینے کو تعصّبات اور ذہن کو تکبر سے خالی کر کے سچائی تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ یہی دین کا مطالبہ اور خدا کا پسندیدہ طریقہ ہے۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں۔ مسیحیت میں یہ مانا جاتا ہے کہ خدا ایک ہے۔ مگر اس کے ساتھ وہ تثلیث کے عقیدے کی شکل میں یہ بھی مانتے ہیں کہ خدا تین ہیں۔ یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس خدائی اکائی کے تین اجزا ہیں۔ یہ بات تمام مسیحی بچپن سے مانتے ہیں اور تربیت اور ماحول

سے یہ بات ان کے اندر راسخ ہو جاتی ہے۔ مگر شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد عقل یہ سوال اٹھاتی ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا ایک بھی ہو اور تین بھی ہو۔ وہ یا تو ایک ہوگا یا تین ہوں گے۔ اس سے بڑھ کر اگلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ جس ہستی کے نام اور تعلیمات پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے اس کا اپنا کلام انجیل کی شکل میں آج کے دن تک موجود ہے۔ پوری انجیل میں حضرت عیسیٰ نے نہ کہیں تثلیث کو بیان کیا ہے اور نہ اس کی دعوت دی ہے۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ ہر مسیحی کو اس بات پر متنبہ ہو جانا چاہیے۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنی عقل سے کام لے۔ اپنی مقدس کتاب میں خود مسیح کی تعلیم میں اصل بات کو تلاش کرے۔ یہ دیکھے کہ بائبل میں کبھی کسی نبی نے اس طرح کے کسی عقیدے کی کوئی بات نہیں کی۔ بائبل کے بعد آنے والے نبی جسے اب چرچ بھی سرکاری طور پر نبی تسلیم کرتا ہے، وہ اور اُن کی کتاب قرآن بھی اس عقیدے کی بھرپور تردید کرتے ہیں۔ اگر کوئی مسیحی متنبہ ہونے کے بعد بھی تحقیق و جستجو سے کام نہیں لیتا تو پھر لازم ہے کہ کل قیامت کے دن وہ خدا کے احتساب کی زد میں آجائے گا۔

یہی معاملہ مسلمانوں کا ہے۔ اگر مسلمان کچھ ایسے عقیدے بھی مانتے ہیں جو قرآن میں موجود نہیں۔ وہ ایسے نظریات اختیار کرتے ہیں جو ان کی بنیادی کتاب کا حصہ نہیں۔ وہ کچھ ایسے دینی اعمال سرانجام دیتے ہیں، جو ان کے دین کا مطالبہ نہیں تو جس لمحے انہیں تنبیہ ہو جائے یا کوئی شخص انہیں متوجہ کردے، انہیں رک کر تحقیق و جستجو سے کام لینا چاہیے۔ جس شخص نے بے نیازی سے سر جھٹکا، جس نے باپ دادا کے طریقے پر بھروسہ کیا، جس نے مذہبی اکابرین کی باتوں کو اللہ رسول کے حکم کے برابر جانا، وہ بلاشبہ خدا کے احتساب کی تلوار کی زد میں آجائے گا۔ اور جو بدنصیب ایک دفعہ اس تلوار کی زد میں آگیا، اس کی ابدی زندگی جہنم کے دہکتے شعلوں اور وہاں کے کھولتے پانی میں گزرے گی۔ یہ وہ انجام ہے جس سے ہر شخص کو پناہ مانگنی چاہیے۔

زندہ اور مردہ نماز

احادیث میں ایک واقعے کا ذکر اس طرح ملتا ہے کہ ایک شخص نے حضور کے پیچھے نماز میں رکوع سے اٹھتے ہوئے 'ربنا لك الحمد (پروردگار، حمد تیرے ہی لیے ہے)' کے بعد 'حمدا کثیرا طیبا مبارکا فیه (بہت زیادہ حمد، پاکیزہ اور بڑی بابرکت)' کے الفاظ کا اضافہ کر دیا۔ حضور نے اس شخص کے الفاظ پر یہ تبصرہ کیا کہ میں نے تیس سے زیادہ فرشتوں کو دیکھا ہے کہ ان الفاظ کو لکھنے کے لیے وہ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

یہ واقعہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ زندہ عبادت خدا کے ہاں کیسے مقبول ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں عبادات ایک رسمی چیز بن کر رہ گئی ہیں، لیکن درحقیقت یہ خدا کے ساتھ ایک زندہ تعلق پیدا کر لینے کا نام ہے۔ یہ تعلق تقاضا کرتا ہے کہ انسان مقررہ اعمال و اذکار ادا کرنے اور ممنوعات سے رکنے کے علاوہ ذہنی سطح پر بھی خدا کے ساتھ ایک شعوری رابطہ پیدا کرے۔ جیسے ہی یہ رابطہ پیدا ہوتا ہے، یہ زندہ کیفیات، احساسات، اذکار اور اعمال میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ کبھی آنسوؤں کی شکل میں بہہ نکلتا ہے، کبھی خدا کی عظمت اور کبریائی کے نئے پہلو دریافت کر لیتا ہے اور کبھی اس کی ثنا و تمجید اور تسبیح و تعریف کے نئے اسالیب میں ڈھل جاتا ہے۔

مگر بدقسمتی سے جہاں نماز رٹے رٹائے الفاظ کا وہ مجموعہ ہو جن کے معنی نماز پڑھنے والے کو خود معلوم نہ ہوں، وہاں پر نمازی اپنی طرف سے حمد و تسبیح کا کوئی اضافی جملہ کیسے کہہ سکے گا؟ جہاں نماز بے دلی کے ساتھ کی جانے والی اٹھک بیٹھک کا نام ہو وہاں خدا کے حضور آنسوؤں کا نذرانہ کون پیش کرے گا؟ جہاں لوگ نماز کے اندر خدا کو یاد نہیں کرتے وہاں نماز سے باہر خدا کو یاد رکھنے کی زحمت کون گوارا کرے گا؟ ایسے میں اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری نماز کو لینے کے لیے فرشتے آپس میں مسابقت کریں تو ہمیں اپنی نمازوں میں ایمانی زندگی پیدا کرنی ہوگی۔

خدا کا قرب

مسلمان اہل علم اور مختلف نقطہ نظر سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں جن آیاتِ قرآنی پر سب سے زیادہ بحث ہوتی ہے، ان میں سے ایک سورۂ مائدہ کی درج ذیل آیت ہے:

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور صرف اسی کے قرب کے طالب بنو اور اس کی راہ میں برابر جدوجہد کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ''، (مائدہ 35:5)۔

اس آیت کے زیر بحث آنے کا سبب اصل عربی عبارت میں 'وسیلے' کے الفاظ کا موجود ہونا ہے۔ ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور کسی صالح بندہ کا وسیلہ پیش کرنا خود قرآن کریم کا مطالبہ ہے۔ تاہم یہ آیت ایک بالکل برعکس بات بیان کرتی ہے۔ یہ بات آیت کے صحیح ترجمے ہی سے واضح ہے۔ وسیلہ عربی زبان میں قرب کو کہتے ہیں۔ آیت کا حکم یہ ہے کہ اللہ کا وسیلہ یعنی اس کا قرب تلاش کرو۔ کسی مقرب بندے کو اس کے حضور پیش کرنے کے بجائے خود اس کے مقرب بنو جس کا آسان طریقہ اس آیت کے مطابق اس کی راہ میں جدوجہد کرنا ہے۔

قرآن میں تقویٰ کا حکم تو اکثر جگہ آیا ہے، لیکن محبت اور قرب کا ذکر کم تر کیا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ محبت ایک سطحی انسان کو بے خوف اور بے عمل بنا سکتی ہے۔ جس کے بعد سخت اندیشہ ہے کہ انسان خدا کی پکڑ میں آجائے گا۔ لیکن خدا کی محبت اور اس کے قرب کا خواہشمند ہونا انسان کی زندگی کا سب سے بڑا مشن ہونا چاہیے۔ انسان کی خواہش ہونی چاہیے کہ کل قیامت کے دن جب اعمال نامہ پیش ہو تو خدا بندے کو اپنے مقربین کے ساتھ کھڑا کرے۔ جب جنت کی بستی میں خدا کا دربار لگے تو انسان خدا کے درباریوں میں، کسی پچھلی صف ہی میں سہی، موجود رہے۔ اور کبھی کبھار ایسا بھی ہو کہ خدا ایک بندۂ عاجز کو اپنے حضور طلب کر کے ون ٹو ون ملاقات کا شرف بخش دے۔

لوگوں کو معلوم نہیں خدا کیسی اعلیٰ ہستی ہے۔ اس کا قرب کتنی غیر معمولی بات ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن میں اس کے قرب کی خواہش پیدا ہوگئی اور پھر یہ خواہش دعا اور عمل میں ڈھل گئی۔

نکاح کیا نہیں ہے؟

دورِ جدید آزادی کا دور ہے۔ اس دور میں آزادی کی لہر مغرب سے اٹھی اور ہر نسل، رنگ اور تہذیب اور ان کی اقدار کو اپنی رو میں بہا کر لے گئی۔ اس بہاؤ کا شکار دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ عفت کی وہ قدر بھی ہوئی، جو نکاح کی زنجیر سے مرد و عورت کو میاں بیوی کے مقدس اور پاکیزہ رشتے میں جوڑے رکھتی ہے۔

آج کی مغربی دنیا میں نکاح کوئی قانونی اور سماجی تقاضا نہیں ہے بلکہ اسے ثقافتی نوعیت کی ایک اضافی چیز سمجھا جاتا ہے۔ رہا مشرق تو اس میں نکاح کی زنجیر مغرب کی طرح ٹوٹی تو نہیں، مگر کمزور ضرور ہوگئی ہے۔ مسلم قوموں میں نکاح آج بھی ایک مطلوب شے ہے، لیکن میڈیا کی آزادروی اور نکاح کو مشکل بنا دینے والے معاشی اور سماجی حالات کی بنا پر لوگ اب دوسرے راستے ڈھونڈنے لگے ہیں۔ اس عمل میں نکاح کے نام پر بعض ایسے تعلق وجود میں آرہے ہیں جو رسمی طور پر نکاح اور اپنی حقیقی شکل میں بدکاری ہیں۔ ہمارے ملک پاکستان میں ان کا چلن عام نہیں لیکن عرب ممالک میں جہاں گرم آب و ہوا کے علاوہ دولت کی گرمی بھی عام ہے اور اس کے ساتھ مذہبی روایت کی پاسداری کا چلن بھی ابھی متروک نہیں ہوا، نکاح کی متعدد ایسی اقسام عام ہورہی ہیں۔ ان میں دورانِ سفر کیا گیا نکاح، بیرونِ ملک قیام کے دوران میں کیا گیا نکاح، معاشرے کی نظر سے چھپ کر کیا گیا نکاح، کسی خاص مدت کے لیے کیا گیا نکاح وغیرہ شامل ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہم فقہی انداز میں بحث کر کے نکاح کی ان اقسام میں پائی جانے والی غلطی بیان کریں، ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اصل نکاح اپنی روح کے اعتبار سے کیا ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں نکاح کے بارے میں یہ تصور رائج ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول کرلیں تو یہ نکاح کا عمل ہے۔ یہ نکاح کا ایک فقہی تصور ہے۔ نکاح

اپنی اصل کے اعتبار سے ایک مرد اور ایک عورت کے مستقل اور علانیہ رفاقت کے اس عہد کا نام ہے جس کا اظہار وہ معاشرے میں اپنے جاننے والوں کے حلقے میں کرتے ہیں۔ یہاں مستقل تعلق کا مطلب دوامی تعلق نہیں۔ میاں بیوی جب چاہیں یہ رشتہ ختم کر دیں۔ مگر نکاح کرتے وقت اس تعلق کو کسی خاص مدت اور حالات کا پابند نہیں کیا جا سکتا بلکہ اسے مستقلاً ساتھ نبھانے کے عزم سے کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس میں میاں اور بیوی دونوں پر ایک دوسرے کے حوالے سے کچھ حقوق و ذمہ داریاں عائد ہوجاتی ہیں۔ یہ تعلق چونکہ علانیہ بھی ہوتا ہے اس لیے معاشرہ ان حقوق و فرائض کا ضامن ہوتا ہے اور ان دونوں میاں بیوی کو اپنے ایک بنیادی یونٹ یعنی خاندان اور اس تعلق سے پیدا ہونے والے بچوں کو ان کی اولاد کے طور پر بلاتردد قبول کر لیتا ہے۔

یہی نکاح ہے اور صرف یہی نکاح ہے۔ قرآن اسی کو پاکدامنی، عصمت اور عفت سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ قرآن کے اپنے بیانات کے مطابق صرف دو صورتوں میں ظہور پذیر ہوسکتا ہے۔ ایک مسٰفحین اور دوسرا متخذی اخدان ہونا (مائدہ 5:5)۔ پہلے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا اصل مقصود صرف خواہش نفسانی کی امنڈتی موج کا نکاس ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک عارضی عمل ہے۔ اس کا مقصود میاں بیوی کے مستقل تعلق میں رہ کر اپنی حفاظت کرنا نہیں بلکہ جوانی کی مستی سے لطف اندوز ہونا ہے۔ ہم نے اردو میں بڑے محتاط انداز میں قرآن کے مدعا کو بیان کیا ہے وگرنہ قرآن کے الفاظ تو بالکل واضح ہیں کہ یہ نکاس جذبات کا ایک عارضی عمل ہے، جس میں مستقل رفاقت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔

اس عمل کی سب سے عام شکل پیشہ ور عورتوں کے پاس جانا ہے۔ مگر نکاح کے نام پر کیے جانے والے وہ تمام معاہدات جن میں مستقل رفاقت پیش نظر نہیں ہوتی بلکہ کسی خاص وقت یا حالات کی قید لگی ہوتی ہے اسی کے ذیل میں آتے ہیں۔ ان میں اصل خرابی یہ ہوتی ہے کہ مستقل

رفاقت نہ ہونے کی بنا پر میاں بیوی کی حیثیت میں جو حقوق و فرائض خود بخود عائد ہو جاتے ہیں وہ ایسے تعلقات میں زیر بحث نہیں آتے۔ فریقین کی سیرت و عادات، اولاد اور اس کی تربیت، خاندان اور اس کی تشکیل ایسے تعلقات میں قابلِ ذکر چیزیں نہیں ہوتیں بلکہ اصل مسئلہ وقتی جذبات کی تسکین ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایسے تعلقات کے جواز کا کوئی امکان نہیں رہ جاتا۔

مسٰفحین کے بعد دوسری چیز متخذی اخدان ہونا ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس میں مرد اور عورت کے بیچ میں تعلق تو کچھ مستقل نوعیت ہی کا ہوتا ہے، مگر یہ سب معاشرے کی نظر سے بچ کر چوری چھپے ہوتا ہے۔ یاری آشنائی کا یہ تعلق اعلانِ عام کے اس وصف سے محروم ہوتا ہے جو اس تعلق کو معاشرے کی طرف سے رشتہ کی سندِ قبولیت عطا کرتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حقوق و فرائض پر کوئی توجہ دلانے والا رہتا ہے اور نہ خاندان کا وہ ادارہ وجود میں آتا ہے جو زمانے کے ہر سرد و گرم اور مزاجوں کے ہر اختلاف کے باوجود ممکنہ حد تک اپنا وجود برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا تعلق مزاجوں کے معمولی اختلاف، خوف و پریشانی اور زندگی کے کسی معمولی سے مسئلے کی مار بھی نہیں سہہ پاتا اور اپنے پیچھے بدنامی، ناجائز اور لاوارث بچوں اور بے وفائی کا داغ لیے منتشر جذبات اور شکست خوردہ نفسیات پر مبنی شخصیات چھوڑ جاتا ہے۔

نکاح کیا ہوتا ہے یہ بات دنیا ہمیشہ سے جانتی تھی۔ نزولِ قرآن سے قبل بھی نکاح ہوتے تھے۔ نبوت سے قبل خود ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت خدیجہ سے اسی طرح ہوا۔ اس لیے قرآن نے یہ نہیں بتایا کہ نکاح کیا ہوتا ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے مسٰفحین اور متخذی اخدان کے الفاظ استعمال کر کے ہمیشہ کے لیے یہ بتادیا کہ نکاح کیا نہیں ہوتا۔ اسی کی بنیاد پر زمانۂ جاہلیت میں رائج نکاح سے انحراف کی بعض صورتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممنوع قرار دیا تھا اور اسی کی روشنی میں آج ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ نکاح کے نام پر معاشرے میں جو کچھ سامنے آتا ہے وہ درست ہے یا نہیں۔ اور جو غلط ہے وہ کس بنیاد پر غلط ہے۔

قرآن کریم کا طریقہ استدلال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان رسالت کے بعد تیرہ برس مکہ میں قیام کیا۔ اس عرصہ میں آپ نے قریش مکہ کو شرک سے ہٹا کر توحید کی طرف لانے کی بھرپور کوشش کی۔ قریش مکہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم سے منسوب کرتے تھے، مگر عملی طور پر وہ کئی سو برس سے دین شرک کو اختیار کیے ہوئے اور نسل در نسل سے شرک میں مبتلا تھے۔ وہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کا بتایا ہوا توحید کا راستہ کھو چکے تھے۔ دیگر کتب سماوی کو وہ اپنی کتابوں کے طور پر نہیں مانتے تھے۔ ایسے میں یہ ممکن نہیں تھا کہ ایسی کسی بنیاد پر ان سے توحید کو منوایا جاتا۔ کیونکہ کسی بھی مکالمے میں مسلمہ دلیل صرف وہی چیز بن سکتی ہے جسے دونوں فریق یکساں طور پر مانتے ہوں۔

اس بات کو ایک مثال سے یوں سمجھیں کہ عیسائی مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن پاک کو نہیں مانتے۔ اس لیے ایک عیسائی کو قرآن کی دعوت پیش تو کی جا سکتی ہے، مگر اس کی بنیاد پر اس سے کسی بات کو منوایا نہیں جا سکتا۔ البتہ توحید کی دعوت کی سچائی کو انجیل سے ثابت کیا جائے تو اس کا انکار کرنا اُس کے لیے ممکن نہیں ہوگا کیونکہ وہ انجیل کو مقدس کتاب کے طور پر مانتا ہے۔

قرآن کریم کے مخاطبین اور اہل مکہ کے درمیان متفقہ عقائد اور مسلمہ کتابوں کی غیر موجودگی کے باوجود مکہ مکرمہ میں قرآن کریم کا دو تہائی حصہ نازل ہوا۔ جس کے بعد قرآن نے یہ فیصلہ کر دیا کہ قریش مکہ پر بات بالکل واضح ہو چکی ہے، مگر وہ ضد اور ہٹ دھرمی کی بنیاد پر سچائی کو مان کر نہیں دے رہے۔ آخر کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا حکم ہوا۔ جس کے بعد سرداران قریش کو اہل ایمان کی تلواروں سے ہلاک کر دیا گیا۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ قریش پر حجت پوری ہو چکی ہے، مکالمے کے مسلمہ اصولوں کی روشنی

میں قریش پر دلیل قائم ہو چکی ہے۔ کیونکہ قریش، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، کسی ایسی کتاب یا مذہبی روایت کو مانتے ہی نہیں تھے جس کی اساس توحید پر ہو۔ قرآن کریم کا گہرا مطالعہ ہمیں اس سوال کا جواب فراہم کرتا ہے۔ وہ جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قریش کو جو دلائل دیے وہ عقلی اور فطری دلائل تھے۔ عقل وفطرت وہ دو چیزیں تھیں جو رسول اللہ صلی علیہ وسلم اور قریش مکہ دونوں کے لیے مسلمات کی حیثیت رکھتی تھیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دنیا میں جب بھی دو آدمیوں کے درمیان اختلاف ہو جائے اور ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ ہو جو حجت بن سکے تب بھی عقل کی بصیرت اور فطرت کی آواز وہ دو بنیادی چیزیں ہوتی ہیں جو ہمیشہ باقی رہتی ہیں۔ انہی کی بنیاد پر کوئی شخص بات سمجھنا چاہے تو ہر بات سمجھائی جا سکتی ہے اور ہر نزاع کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

یہی وہ دو چیزیں تھیں جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنے سارے استدلال کی بنیاد رکھی۔ اس کے علاوہ جو دلائل بھی پیش کیے گئے ہیں وہ ثانوی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً تنہا ایک رب کی عبادت کی دلیل جو قرآن میں جگہ جگہ دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ساری نعمتیں اور مہربانیاں جب ایک خدا ہی کی ہیں تو بندے کے سجدہ و نیاز کا مستحق بھی صرف وہی رب ہے۔ اس کے سوا کوئی اور عبادت کا مستحق نہیں۔ یہ سرتاسر ایک عقلی اور فطری دلیل ہے جو ہر انسان کی عقل کو اپیل کرتی ہے۔ کسی انسان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ یہ ثابت کر دے کہ بارش کوئی بت، فرشتہ، جن یا کوئی انسان برساتا ہے یا وہ ہوائیں چلاتا ہے یا فصل اگاتا ہے۔ کسی نے اگر غیر اللہ کو معبود ثابت کرنے کی کوشش کی تو قرآن نے عقلی دلائل سے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کی الوہیت کو یہ کہہ کر رد کیا گیا کہ وہ خود کھانا کھانے کے محتاج تھے، وہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں۔ بتوں کے بارے میں کہا گیا کہ مکھی بھی ان سے کچھ چھین کر لے جائے تو وہ واپس نہیں لے سکتے، وہ کیسے تمھارے کام آ سکتے ہیں۔ قریش مکہ کے پاس ان عقلی دلائل کا کوئی جواب نہیں تھا سوائے اس

کے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی بت پرستی کے طریقے پر پایا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن نے پھر واضح کر دیا کہ اس کی کیا ضمانت ہے کہ تمھارے باپ دادا کسی غلطی میں مبتلا نہیں ہو سکتے؟ وہ اگر غلطی میں مبتلا ہوئے ہیں تو تم ان کی وجہ سے گمراہ کیوں ہو رہے ہو؟ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ سارے عقلی دلائل ہیں اور انہی کی بنیاد پر قریش کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔

بدقسمتی سے آج مسلمانوں کے ہاں علمی معاملات میں قرآن کو کوئی فیصلہ کن دلیل کی حیثیت حاصل ہے اور نہ عقل وفطرت کو۔ اس سے زیادہ بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ آج کے مسلمانوں کے ہاں اصل استدلال وہ ہو چکا ہے جو قریش مکہ کے پاس تھا۔ یعنی ہم نے اپنے بڑوں اور بزرگوں کو یہی کچھ کرتے پایا ہے اور انہی کی بات اصل اتھارٹی اور سند ہے۔ مگر قرآن پاک کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ علم کی دنیا میں یہ کوئی استدلال نہیں۔ علم کی دنیا میں کوئی چیز دلیل اس وقت بنتی ہے جب تمام فریقوں کے مسلمات کے مطابق ہو۔ آج مسلمانوں کے درمیان مسلمات کی حیثیت یا تو خود قرآن وسنت کو حاصل ہے یا عقل وفطرت کے اس معیار کو جو ہر حال میں مسلمات میں شامل ہیں۔ اس لیے ان کے درمیان ہر نزاع کا فیصلہ انہی کی بنیاد پر ہونا چاہیے اور ہر سچائی کو پانے کا ذریعہ یہی چیزیں ہونی چاہییں۔

تاہم قرآن کریم ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ سچائی اس دنیا میں صرف اسی شخص کو ملتی ہے، جو کبر، حسد، دنیا پرستی، مفاد پرستی اور تعصب کے ہر شائبے سے خود کو پاک کر کے سچائی کا سچا طلبگار بن جائے۔ جو شخص ایسا کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہدایت کے راستے کو آسان کر دیتا ہے۔ مگر جس شخص کا سینہ ان جذبات کی دلدل بنا ہوا ہو اس کے پاس ہر دلیل کے جواب میں پیش کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی نکتہ نکل آتا ہے۔ مگر یہ طرز عمل انسان کو ہدایت سے ہمیشہ کے لیے دور کر دیتا ہے۔ یہ قرآن سے حاصل کرنے والی سب سے بڑی بات ہے۔

مسکراہٹ اور خوبصورتی

آج کے دور میں خوبصورت نظر آنا ہر مرد وزن کا مسئلہ بن گیا ہے۔خواتین تو خواتین اب اس غرض کے لیے مردوں کے بیوٹی پالر بھی وجود میں آرہے ہیں۔لوگ ان گنت پیسے خرچ کر کے، بہت سی مشقتیں جھیل کر اور نت نئے طریقے اختیار کر کے خوبصورت نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔مگر اس دوڑ میں لوگ اللہ تعالیٰ کے اس عطیہ کو بھول جاتے ہیں جو تمام عظیم نعمتوں کی طرح مفت دستیاب ہے اور بغیر کسی مشقت کے انسان کو بے حد خوبصورت بنا سکتا ہے۔یہ عظیم عطیہ الٰہی مسکراہٹ کی دولت ہے۔

مسکراہٹ ایک بدصورت انسان کو بھی خوبصورت بنا دیتی ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ مسکراتا ہوا آدمی دیکھنے والے کے دل کو ایک خوشگوار احساس منتقل کرتا ہے۔وہ اس کو مہربانی اور محبت کے جذبوں کی لطافت منتقل کرتا ہے۔یہ احساس اور یہ جذبات پتھر کو بھی پگھلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔چنانچہ مخاطب ایسے شخص کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔جو اثر بولنے والے کی خوبصورتی کا مخاطب پر ہوتا، اس سے کہیں زیادہ اثر اس کی مسکراہٹ کا ہو جاتا ہے۔

مسکراہٹ کا صرف یہی ایک فائدہ نہیں۔مسکرانے والا شخص خوبصورت نظر آنے کے علاوہ لوگوں کے دلوں کو خوش کر کے اپنے لیے اجر بھی کماتا ہے۔لوگوں سے محبت سے ملنا، نرمی سے پیش آنا، حسن اخلاق کے ساتھ معاملہ کرنا اہم ترین دینی تقاضے ہیں۔حدیث کے مطابق خوش خلقی کا اجر رات بھر عبادت اور دن بھر روزہ رکھنے جیسا ہے، (ترمذی، رقم 2003)۔مسکراہٹ خوش خلقی اور نرم گفتاری کا لازمی اور بنیادی حصہ ہے اور مسکرانے والا اپنی مسکراہٹ سے بغیر کسی محنت و مشقت کے ڈھیروں اجر کما لیتا ہے۔وہ لوگوں کے ساتھ ساتھ خدا کی نظر میں بھی اچھا ہو جاتا ہے۔

مسکراہٹ خدا کی عظیم نعمت ہے۔جو اس نعمت سے محروم رہا وہ بڑی بھلائی سے محروم رہا۔

مسکراہٹ اللہ کے لیے

مسکراہٹ ایک بے حد خوبصورت عمل ہے۔مگر خدا کو صرف وہی مسکراہٹ پسند ہے جو اس کی رضامندی اور اس کے بندوں کو خوشی دینے کے لیے اختیار کی جائے۔بدقسمتی سے آج کل یہی مسکراہٹ ناپید ہے اور اکثر لوگوں کی مسکراہٹ دراصل اپنے مفاد کے لیے ہوتی ہے۔

اس طرح کی پہلی مسکراہٹ وہ ہے جو کاروباری مفادات کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔یہ دکاندارانہ اور تجارتی مسکراہٹ ہے جو گاہک کو دیکھ کر چہرے پر آتی ہے۔گرچہ اس میں کوئی برائی نہیں اور یہ ایک اچھی چیز ہے، مگر چونکہ یہ مبنی بر مفاد مسکراہٹ ہوتی ہے، اس لیے بارہا اس کے ساتھ جھوٹ، دھوکہ اور فریب بھی شامل ہوتا ہے۔ایسی تمام صورتوں میں یہ مسکراہٹ خدا کے حضور اجر کے بجائے پکڑ کا سبب بن جائے گی۔

دوسری مسکراہٹ وہ ہوتی ہے جو طاقتور لوگوں کے سامنے ظاہر ہوتی ہے۔ان لوگوں کے سامنے جن سے انسان کا کوئی نفع یا مفاد وابستہ ہوتا ہے۔یہ کبھی کمزور، غریب اور ماتحتوں کے سامنے ظاہر نہیں ہوتی۔ایسی مسکراہٹ بھی خدا کی نظر میں غیر مطلوب ہے۔

غیر مطلوب مسکراہٹ کی تیسری قسم وہ ہے جو محض رسمی نوعیت کی ہوتی ہے۔یہ ملاقات کے مروجہ آداب میں سے ایک ادب ہوتا ہے جس کے پیچھے نہ انسان کی شخصیت ہوتی ہے نہ رب کی رضا کا جذبہ۔بس ایک خانہ پری کی چیز ہے جسے اختیار کر لیا جاتا ہے۔اس مسکراہٹ کی اصل خرابی یہی ہے کہ اس کے ساتھ حسن خلق کے دیگر لوازم یعنی دعا، خیر خواہی، قلبی محبت، چھوٹے بڑے کا لحاظ، رعایت اور درگزر وغیرہ نہیں ہوتے۔اس لیے اس مسکراہٹ کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔

مسکراہٹ خدا کی عظیم ترین نعمت ہے۔یہ آخرت کی اعلیٰ نعمتوں کے حصول کا آسان نسخہ ہے۔مگر جو لوگ خدا کی رضا اور بندوں کی خیر خواہی کے احساسات سے عاری ہوں ان کی مسکراہٹ قیامت کے دن ہر اجر سے محروم رہے گی۔

اصل بے وقوفی

قرآن کریم میں بیان ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کی قوم کو طوفان کے ذریعے غرق کرنے کا فیصلہ کرلیا تو انہیں حکم دیا کہ وہ ایک کشتی بنائیں۔ جب قوم نوح کے سردار حضرت نوح کے پاس سے گزرتے تو انہیں کشتی بناتا دیکھ کر ان کا مذاق اڑاتے، (ھود 38:11)۔ جن لوگوں نے ان کی رسالت کی تکذیب کی، ان کی دعوت کا مذاق اڑایا، ان آخرت فراموش اور ظاہر بین کفار کے لیے یہ بات ایک لطیفے سے کم نہ تھی کہ خشکی میں رہتے ہوئے کشتی تیار کی جائے۔

تاہم وقت نے جلد ہی اپنا فیصلہ سنا دیا۔ حکم الٰہی ہوا، طوفان اٹھا اور خشکی نایاب ہوگئی۔ مذاق اڑانے والے ان لہروں کا نشانہ بن گئے جو پہاڑوں جتنی بلند تھیں۔ قرآن مجید کے مطابق اسی طرح اصحاب رسول کا مذاق اڑایا گیا تھا، مگر قیامت کے دن یہ مذاق اڑانے والے اہل ایمان کے مذاق کا نشانہ بن جائیں گے، (مطففین 34:83)۔

حضرت نوح سے لے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک اور آپ سے لے کر آج کے زمانے تک خدا پرستانہ زندگی گزارنے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا پرست لوگ بندۂ مومن کا مذاق اڑائیں۔ بندۂ مومن کی زندگی کا مقصد قیامت کے طوفان سے بچنے کے لیے ایمان کی کشتی بنانا ہوتا ہے۔ وہ اس مقصد کے لیے اپنا وقت لگاتا، پیسہ خرچ کرتا اور صلاحیت کھپاتا ہے۔ مگر مادہ پرست لوگ اس عمل کو بے وقوفی سمجھتے ہیں، کیونکہ یہ نقد دنیا کا فائدہ چھوڑ کر آخرت کے ان دیکھے فائدہ کو ترجیح دینے کا عمل ہے۔ یہ بظاہر خشکی میں کھڑے ہو کر کشتی بنانے کا عمل ہے۔

مگر قرآن کریم کا فیصلہ یہ ہے کہ آج جن لوگوں کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، کل صرف وہی لوگ تباہی سے بچائے جائیں گے۔ رہے مذاق اڑانے والے تو عنقریب اہل ایمان ان کی بے وقوفی پر ہنس رہے ہوں گے کہ سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود ان لوگوں نے آنے والے وقت کی کچھ تیاری نہ کی۔ وہ عارضی دنیا کے پیچھے لگے رہے، مگر ابدی زندگی کا کچھ سامان نہ کیا۔ یہی اصل بیوقوفی ہے، مگر خود بے وقوفوں کو یہ بات معلوم نہیں۔

مسیار شادی

پچھلے دنوں عرب ممالک میں رائج شادی کی ایک قسم مسیار کا بہت ذکر رہا۔ اس کے جواز و عدم جواز پر کافی بحث ہوئی۔ اس ضمن میں بعض حلقوں کی طرف سے یہ بات اٹھائی گئی کہ متعہ اور مسیار میں کوئی فرق نہیں اور یہ ایک ہی نوعیت کی دو چیزیں ہیں۔

اس ضمن میں حقیقت یہ ہے کہ مسیار نکاح کی کوئی الگ قسم نہیں ہے۔ اس میں ہوتا صرف یہ ہے کہ بیوی اپنے کچھ حقوق جیسے رہائش اور نان نفقہ وغیرہ سے دستبردار ہو جاتی ہے۔ اپنی اصل شکل میں یہ تعلق نہ چوری چھپے ہوتا ہے نہ کسی عارضی مدت کے لیے۔ اگر یہ باتیں اس میں شامل ہوں تو یقیناً یہ تعلق ناجائز قرار پائے گا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح متعہ اس وجہ سے ناجائز ہے کہ اس میں مرد و عورت کا تعلق محض ایک عارضی مدت کے لیے ہوتا ہے۔ اس لیے مسیار اپنی اصل شکل میں کسی طرح متعہ جیسی کوئی چیز نہیں۔

رہا یہ سوال کہ مسیار کس درجہ میں گوارا کیا جاسکتا ہے تو ہمارے نزدیک یہ قانونی طور پر جائز لیکن ایک غیر مطلوب چیز ہے۔ قانونی طور پر ایک خاتون کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ نکاح کے تعلق میں اپنے کچھ حقوق چھوڑ دے، لیکن نکاح کی آئیڈیل شکل یہی ہے کہ مرد خاندان کی پوری ذمہ داری اٹھائے۔ عرب ممالک میں بھی یہ طریقہ اکثر مجبوری ہی میں اختیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً مہر زیادہ ہونے کی بنا پر کسی خاتون کا رشتہ نہیں ہوا اور اس کی عمر ڈھل گئی، یا کوئی لڑکی ماں باپ کی دیکھ بھال کی وجہ سے انہیں چھوڑ نہیں سکتی یا پھر وہ مطلقہ خواتین جنھیں مناسب بر نہ مل رہا ہو یہ شادی کرتی ہیں۔

عملی طور پر بھی اس تعلق کی کئی خرابیاں ہیں جو سامنے آ رہی ہیں۔ مثلاً باپ عموماً بچوں کے ساتھ نہیں رہتا۔ اسی طرح اس تعلق میں خواتین اپنے شوہروں کی دوسری تیسری بیوی بنتی ہیں اور اپنے کئی حقوق سے محروم رہتی ہیں۔ اس لیے بجز استثنائی معاملات کو چھوڑ کر مسیار کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔

اولاد ایک مشن

اولاد اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔مگر اس کے ساتھ وہ والدین پر ڈالی گئی ایک عظیم ذمہ داری بھی ہے۔ بدقسمتی سے آج اکثر والدین اس حقیقت سے نا آشنا ہو چکے ہیں۔جس کے نتیجے میں وہ خدا اور معاشرے دونوں کو برے انسان دینے کا سبب بن رہے ہیں۔

عام طور پر لوگوں کے لیے ان کی اولاد صرف محبت کا موضوع ہوتی ہے۔ وہ ان کی ہوں پر ہاں کہنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔اولاد کو لاڈ پیار کرنا، ان کے نخرے اٹھانا، اولاد کے لیے کپڑوں اور کھلونوں کے ڈھیر لگا دینا، ان کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو پورا کرنا ان کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ایسے والدین کے لیے ان کی اولاد ابتدا میں ایک کھلونا ہوتی ہے، مگر آہستہ آہستہ وہ خود اپنی اولاد کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بن جاتے ہیں۔ اولاد خواہش کی ڈگڈگی بجاتی ہے اور والدین بندر کی طرح اس ڈگڈگی پر ناچتے ہیں۔

ایسے والدین تعلیم وتربیت کے اعتبار سے اکثر اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے نزدیک اولاد کے حوالے سے اصل ذمہ داری صرف یہ ہوتی ہے کہ اسے کسی انگلش میڈیم اسکول میں داخل کرا دیا جائے۔ وہ اولاد کی تربیت کے تصور ہی سے واقف نہیں ہوتے۔اچھے آداب اور رویوں کی تلقین، نیکی اور معروف کی تعلیم، بڑے چھوٹے کا لحاظ اور خدا و بندوں کے حقوق کی نگہبانی کو بنیاد بنا کر تربیت کرنے کے بجائے یہ لوگ اولاد کو ٹی وی، موبائل فون اور انٹرنیٹ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اولاد کی ضدوں اور شرارتوں سے نجات کا یہ فوری اور زود اثر نسخہ ہوتا ہے۔مگر یہ نسخہ اکثر ان کی سیرت وشخصیت کو مسخ کر دیتا ہے۔

ایسے بچے جب بڑے ہوتے ہیں تو معاشرے میں مفاد اور خواہش کی لہر کو بڑھانے کا باعث بنتے ہیں۔صبر، ایثار، قربانی، سادگی، قناعت، عفو و درگزر، امانت و دیانت، عدل و انصاف اور

خوش خلقی جیسی اعلیٰ صفات سے عاری یہ لوگ معاشرے کو فساد سے بھر دیتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف دوسرے انسانوں کو دکھ دیتے ہیں بلکہ خود اپنے والدین کے بڑھاپے کو باعث اذیت بنا دیتے ہیں۔ یہ گویا والدین کی اس کوتاہی کی نقد سزا ہوتی ہے جو انہوں نے اپنی اولاد کی تربیت کے معاملے میں کی تھی۔اولاد کی تربیت میں کوتاہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا بڑا جرم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی سزا دینے کے لیے آخرت کا انتظار بھی نہیں کرتے۔

اس کے برعکس جو لوگ اپنی اولاد کی اعلیٰ تربیت کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیتے ہیں، ان کی اولاد دنیا و آخرت دونوں میں ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ثابت ہوتی ہے۔ایسے والدین کے لیے ان کی اولاد کوئی کھلونا نہیں ہوتی بلکہ ایک بھاری ذمہ داری اور ایک مقدس مشن ہوتا ہے۔ یہ مشن بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔وہ اس مشن کے لیے ہر ممکنہ قربانی دیتے ہیں اور اپنی موت تک اسے جاری رکھتے ہیں۔

وہ اپنے بچوں کو کھلونے ضرور لا کر دیتے ہیں، مگر خود ان کے ہاتھ میں کھلونا نہیں بنتے۔ وہ اپنے بچوں کی معصوم خواہشوں کو ممکنہ حد تک پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ساتھ ساتھ بچوں کو صبر اور سادگی کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ وہ بچوں کو اعلیٰ اور اچھی تعلیم ضرور دلواتے ہیں، مگر ان کی تربیت سے ہرگز غافل نہیں ہوتے۔ وہ اپنے بچوں پر اعتماد تو کرتے ہیں مگر ان کی ضد کے آگے مجبور ہو کر انھیں ٹی وی، موبائل اور انٹرنیٹ کے غلط استعمال کی اجازت ہرگز نہیں دیتے۔ وہ بچوں کی آزادی میں تو حائل نہیں ہوتے لیکن انہیں خدا کی غلامی کا سبق سکھانے میں بھی کوئی کوتاہی نہیں برتتے۔

اولاد کو اللہ تعالیٰ نے ایک آزمائش قرار دیا ہے۔اس آزمائش میں سرخرو ہونے کا واحد ذریعہ اولاد کی اچھی تربیت ہے۔یہی ہر ماں اور ہر باپ کا بنیادی مشن ہونا چاہیے۔

قیامت کی مثال

حاملہ خواتین کے بچوں کی صحت اور نشو ونما کا جائزہ لینے کے لیے ڈاکٹر الٹرا ساؤنڈ ٹیکنالوجی سے مدد لیتے ہیں۔ وہ اس عمل سے پیٹ کی اندھیری کوٹھری میں چھپے بچے کی جسامت، حرکات اور دیگر کئی اہم اور ضروری معلومات کا براہ راست مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ الٹرا ساؤنڈ کی اس ٹیکنالوجی میں مزید ترقی اس طرح ہوئی ہے کہ بچے کی نقل وحرکت اور جماہی اور مسکراہٹ جیسے دیگر اعمال کی سہ جہتی کلر ریکارڈنگ (Three Dimensional Color Recording) کر کے والدین کو دی جاسکتی ہے۔ گویا اب خارجی دنیا میں رہنے والے لوگ اس قابل ہو گئے ہیں کہ وہ ماں کے پیٹ میں پلنے والے بچے کی اندھیری دنیا کا رنگین مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

سائنس کی یہ ترقی دیکھ کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کبھی وہ وقت آسکتا ہے کہ بچے کو اس دنیا میں آنے سے قبل خارج کی دنیا کے حقائق سے مطلع کیا جا سکے گا؟ بظاہر یہ ممکن نہیں۔ لیکن سائنس یہ کر بھی لے، تب بھی ماں کے پیٹ میں بچے کے حواس اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ خارج کی دنیا کے پیغامات سمجھ سکیں۔ تاہم فرض کر لیں کہ بچے کے حواس کو اس قابل کر دیا جائے کہ وہ انسانی دنیا کے پیغامات سمجھنے لگیں تب بھی اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ خارجی دنیا کے حقائق کو اسی طرح سمجھ لے جس طرح ہم انسان سمجھتے ہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ بچہ ماں کے پیٹ میں گرچہ زندہ ہوتا ہے۔ وہ غذا لیتا، نشو ونما پاتا اور زندگی کے دیگر بہت سے افعال پوری طرح سرانجام دے رہا ہوتا ہے، مگر خارج کی دنیا اس کے تجربات سے اتنی مختلف ہوتی ہے کہ وہ کبھی ماں کے پیٹ میں رہتے ہوئے اس کو سمجھ نہیں سکتا۔ مثلاً خوراک ہی کو لے لیں۔ بچہ ماں کے پیٹ میں باقاعدہ خوراک لیتا ہے۔ مگر اس کی خوراک اور خارج میں پائی جانے والی خوراک میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

بچے کو خوراک ماں کے خون سے براہ راست ملتی ہے۔ جبکہ خارج میں انسان خوراک کے لیے منہ، دانتوں اور زبان کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ اعضا خوراک میں چھپے ان گنت ذائقوں کو محسوس کرتے اور انسان کو لذت کے ختم نہ ہونے والے خزانوں سے روشناس کراتے ہیں۔ پھل سبزی، دال، اناج، گوشت، مرغی اور دودھ دہی کو مرچ مصالحوں اور آگ برف سے ملا کر انسان ذائقوں کی جو لذیذ کائنات سجاتا ہے، اس کا ابلاغ کسی صورت اس معصوم بچے تک نہیں کیا جاسکتا جو اپنی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ یہی بتایا جاسکتا ہے کہ نئی دنیا میں اسے ایک بہتر غذا ملے گی۔

ماں کے پیٹ کی دنیا اور خارج کی دنیا میں جو فرق پایا جاتا ہے، ویسا ہی فرق آج کی دنیا اور اُس دنیا میں پایا جاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے جنت کی صورت میں قیامت کے بعد تخلیق کریں گے۔ اللہ تعالیٰ جنت کی اُس دنیا سے آج بھی واقف ہیں، مگر اِس دنیا کا انسان اُس دنیا کی حقیقت نہیں سمجھ سکتا۔ چنانچہ قرآن کریم میں بات سمجھانے کے لیے انسانوں کو موجودہ دنیا میں پائی جانے والی بہترین چیزوں کی مثال دے کر سمجھایا جاتا ہے۔ باغ، نہریں، سونا، چاندی اور ریشم وغیرہ اسی کی مثالیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جنت میں بس یہی کچھ ہوگا۔ یہ جنت کی زندگی کا وہ آغاز ہے جسے آج کا انسان سمجھ سکتا ہے، وگرنہ اس دنیا کی نعمتوں کا کوئی تصور آج کا انسان نہیں کر سکتا۔ بالکل پیٹ میں موجود اس بچے کی طرح جو خارج کی دنیا کا کوئی تصور نہیں کر سکتا۔ اسی لیے قران میں بیان کردہ نعمتوں کو 'نزل' یعنی ابتدائی مہمانی کا سامان کہا گیا ہے۔ جنت کی اصل نعمت اس ابتدائی ضیافت کے بعد دی جائے گی۔ جس طرح بچہ اس دنیا میں آنے کے بعد خون کی جگہ دودھ جیسی خوشگوار چیز بطور خوراک لیتا ہے اور اس ابتدائی سامان کے بعد پھر ساری زندگی لذیذ غذاؤں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

اہل جنت آنے والی دنیا میں، ختم نہ ہونے والی زندگی میں خدا کی لامحدود میزبانی، قدرت، صناعی اور انعام کا لطف اٹھائیں گے۔ وہ جوانی، صحت، طاقت، حسن اور اقتدار کی ختم نہ ہونے والی بادشاہی میں نعمتوں کی کہکشاؤں کو تسخیر کرتے ہوئے اپنی ابدی زندگی گزاریں گے۔

مگر یہ جنت اور یہ بادشاہی صرف ان لوگوں کا مقدر ہے جو اس فانی دنیا میں ایمان اور اخلاق کی بظاہر مشکل مگر درحقیقت آسان شاہراہ اختیار کرلیں۔ جو لوگ ایک دفعہ یہ ہمت کرلیں آنے والی دنیا میں ان کی زندگی میں کوئی حزن نہیں آسکتا، کوئی غم نہیں آسکتا، کوئی مایوسی، پریشانی، افسردگی، محرومی، اندیشہ، دکھ، غم، الم اور پچھتاوا ان کے گھر کی دہلیز تک نہیں آسکتا۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ یہی اصل کامیابی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

زندگی کے سفر میں آنے والا اندھیرا غار کا نہیں سرنگ کا ہوتا ہے
جس کے اگلے سرے پر ہمیشہ روشنی ہوتی ہے مگر
یہ بات حوصلے کے ساتھ چلتے رہنے والے ہی جان سکتے ہیں
مایوس ہو کر بیٹھ جانے والے نہیں (ابو یحییٰ)

اس دنیا میں کامیابی کسی اتفاق کا نام نہیں
کامیابی اپنے امکانات کو سمجھنے اور
انہیں استعمال کرنے کا نام ہے (ابو یحییٰ)

ہم اور ہمارے والدین

مجھ سے اکثر یہ پوچھا جاتا ہے کہ جن لوگوں کے والدین یا ان میں سے کسی ایک کا انتقال ہوگیا ہے اور وہ ان کی خدمت کا موقع نہ پاسکے یا انہیں راضی نہ کرسکے، وہ اس کی تلافی کے لیے کیا کریں؟ میں ایسے لوگوں کے لیے ایک سہ نکاتی فارمولا بیان کرتا ہوں۔ اپنے اور اپنے والدین کے لیے استغفار و دعا، بزرگوں کا احترام اور دوسروں کو اپنے والدین سے حسنِ سلوک کی تلقین۔

حقیقت یہ ہے کہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک خدا کی بندگی کے بعد دین کا سب سے بڑا مطالبہ ہے۔ قرآنِ کریم نے کئی مقامات پر اس حقیقت کو واضح کیا ہے۔ احادیث میں بار بار والدین کی فضیلت کئی پہلوؤں سے بیان ہوئی ہے۔ ایک حدیث کے مطابق جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ (نسائی) ایک دوسری حدیث میں باپ کو جنت کا دروازہ قرار دیا گیا ہے۔ (ترمذی)۔

والدین کی اس اہمیت کا سبب یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں جو کچھ پاتا ہے، اس میں سے بیشتر، عالم اسباب میں، والدین کی مہربانیوں سے انسان کو ملتا ہے۔ زندگی جیسی قیمتی چیز انسان کو والدین کے ذریعے سے ملتی ہے۔ بچپن کے کمزور ترین لمحات میں جب انسان اپنے اوپر سے مکھی تک نہیں اڑا سکتا، ماں اور باپ اس کی پرورش کی انتہائی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔ ماں اسے دکھ جھیل کر پیٹ میں رکھتی اور دکھ جھیل کر ہی جنم دیتی ہے۔ وہ اپنا آرام قربان کرکے اسے غذا فراہم کرتی اور اس کی گندگیوں کو بغیر کسی کراہت کے اس کے وجود سے دور کرتی ہے۔ جبکہ باپ اپنا سارا مال اور ساری محبت اولاد پر نچھاور کردیتا ہے۔ وہ ساری زندگی مشقت جھیل کر اولاد کے سر پر تحفظ اور سکھ کی چادر تانے رکھتا ہے۔

اسی لیے قرآن و حدیث میں واضح کیا گیا ہے کہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کے حصول کے لیے بنیادی شرائط میں سے ایک ہے۔ مگر اکثر لوگوں کی بدقسمتی ہے کہ والدین کی اس اہمیت کا انہیں احساس نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ والدین دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں اور جنت کا یہ دروازہ ان پر ہمیشہ کے لیے بند ہوجاتا ہے۔

ماں باپ کی قدر و قیمت

والدین کی قدر و قیمت ان کی زندگی میں کیوں نہیں ہوتی، اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ والدین کی ساری محنت اور قربانیاں ماضی کی ایک داستان ہوتی ہیں جو انسان کے کمزور حافظے میں اکثر محفوظ نہیں رہتیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ والدین بڑھاپے میں اکثر چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کی باتیں تلخ اور ان کے مطالبات غیر معقول محسوس ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ اپنے بیوی بچے ہونے کی وجہ سے انسان کے مفادات انہی کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں اور بوڑھے والدین صرف ایک بوجھ بن کر رہ جاتے ہیں۔

یہ اور ان جیسی دیگر وجوہات کی بنا پر انسان کو والدین سے اختلافات ہو جاتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کو فراموش کر دیتا ہے۔ اس کے پیسے کا بہترین مصرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اسے اپنے بیوی بچوں کی ضروریات پر خرچ کرے اور وہ والدین جنھوں نے اپنا سارا مال اولاد پر لٹا دیا تھا، ان پر پیسے صرف کرنا اسے بوجھ لگتا ہے۔ اس کی توانائی کا بہترین مصرف اپنے بیوی بچوں کی ذمہ داریاں اٹھانا ہوتا ہے اور بوڑھے والدین کی ذمہ داری اٹھانا اس کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔ بیوی بچوں کی خوشنودی اس کے ہر عمل کا مقصود ہوتی ہے، مگر بوڑھے والدین کی خوشنودی اس کے لیے ایک بے مصرف شے بن جاتی ہے۔ اپنے بچوں کو گھنٹوں گود میں اٹھا کر وہ نہیں تھکتا مگر بوڑھے والدین کے ہاتھ پاؤں اور جسم چند منٹ دبانے کے بعد اسے تھکن لاحق ہو جاتی ہے۔ بیوی بچوں، دوست احباب، کاروبار و ملازمت اور کھیل تفریح کو دینے کے لیے اس کے پاس ڈھیر سارا وقت ہوتا ہے۔ مگر بوڑھے والدین کے پاس بیٹھ کر ان سے باتیں کرنا اسے وقت کا زیاں محسوس ہوتا ہے۔ انسان یہ سب کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ والدین دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں اور انسان پر جنت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

اگر آپ کے والدین زندہ ہیں تو ان کی قدر کر لیجیے۔ یہ جنت کا وہ دروازہ ہے جو ایک دفعہ بند ہو گیا تو پھر کبھی نہیں کھلے گا۔

یہ پیشہ نہیں ہے

کہتے ہیں کہ کسی شخص نے ایک بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی اور اس سے اقتدار چھین کر اسے قید میں ڈال دیا۔ قید کے دوران اس بادشاہ نے نئے حکمران سے درخواست کی کہ اسے اور کوئی سہولت نہ ملے مگر بچوں کو پڑھانے کی اجازت مل جائے۔ نئے حکمران نے اس کی درخواست یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ میں نے بڑی مشکل سے تم سے ایک سلطنت چھینی ہے۔ میں اب ایک دوسری سلطنت تمہارے حوالے کیسے کر دوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک استاد کو اپنے شاگردوں پر ایک بادشاہ جیسے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ استاد کا اختیار بادشاہ سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ کیوں کہ ایک بادشاہ کا دائرۂ اقتدار صرف جسم تک ہوتا ہے مگر استاد کی پہنچ دل، دماغ اور روح تک ہوتی ہے۔

ایک بچے کی دنیا بہت محدود ہوتی ہے۔ اِس دنیا میں گھر کے بعد درس گاہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح والدین کے بعد وہ جن لوگوں کا اثر سب سے زیادہ قبول کرتا ہے وہ اس کے اساتذہ ہی ہوتے ہیں۔ جس طرح والدین بننا ایک پیشہ وارانہ کام نہیں اسی طرح تعلیم دینا بھی کوئی پیشہ نہیں ہے۔ تعلیم دینا اصل میں قوم کی تعمیر میں حصہ لینا ہے۔ تعلیم دینا تو کارِ نبوت میں سے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا (مشکوۃ)

یعنی مجھے استاد بنا کر بھیجا گیا ہے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ پڑھانا اور تعلیم دینا تو نبوت کے خصائل میں سے ہے۔ جو لوگ دوسروں کو تعلیم دیتے ہیں وہ اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی تکمیل کرتے ہیں۔ کسی شخص کی اس سے بڑی خوش قسمتی نہیں ہو سکتی کہ وہ آپ کے کام کو آگے بڑھائے۔ اور بلاشبہ ایک استاد اس عظیم منصب پر فائز ہوتا ہے۔

ایک استاد کا کردار فرد اور قوم دونوں کی زندگی میں بڑا غیر معمولی ہوتا ہے۔ ہر فرد اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اساتذہ کی زیرِ نگرانی گزارتا ہے۔ بچپن اور جوانی کا یہ حصہ بلاشبہ اس کی زندگی کا بہترین حصہ ہوتا ہے جس میں اس کی شخصیت پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہے۔ اس کا ذہن ایک سادہ تختی کی مانند ہوتا ہے۔ اساتذہ کے پاس دس پندرہ سال کا موقع ہوتا ہے کہ وہ جو چاہیں اس تختی پر لکھ ڈالیں۔ وہ چاہیں تو اس شخص کو ایک بہترین انسان بنا سکتے ہیں۔ وہ چاہیں تو معاشرے کو ایک دیانت دار، محنتی، با اخلاق اور با کردار شخص دے سکتے ہیں۔ تاہم ان کے لیے یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ وہ اس خالی ذہن پر بدکرداری کی سیاہی مل دیں۔ کوئی بھی استاد ایسا جان بوجھ کر نہیں کرتا۔

ایک استاد کسی طالب علم کو صرف اس وقت برا بناتا ہے جب وہ اس کے سامنے ایک برا کردار پیش کرے۔ جب طلبا کے سامنے ایک غیر ذمہ دار، مفاد پرست اور بے کردار انسان استاد کے روپ میں آتا ہے تو اسے بچوں کو بگاڑنے کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسے دیکھ کر اس کے طلبا خود بخود ویسے ہی ہو جاتے ہیں۔

فرد کے ساتھ ساتھ قومی زندگی میں بھی اساتذہ کی غیر معمولی اہمیت ہوتی ہے۔ آج کل قوموں کا عروج و زوال اس بات سے وابستہ ہے کہ وہ علم و ہنر میں کتنا آگے ہیں۔ یہ اساتذہ کی محنت اور توجہ ہوتی ہے جو کسی قوم میں اعلیٰ اذہان پیدا کرتی ہے۔ ہر بڑا سائنسدان، عالم، قائد اور عبقری (Genius) کبھی نہ کبھی ایک طالب علم رہا ہوتا ہے جہاں اس کا استاد وہ بنیاد رکھ دیتا ہے جس کی بنا پر ملک و قوم کو ایک مفید اور کارآمد شخص میسر آ جاتا ہے۔

استاد بننا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ ایک استاد اگر اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتا اور دوسرے پیشوں کی طرح اسے صرف ایک پیشہ سمجھتا ہے تو گویا وہ سوسائٹی کی بنیادیں کھوکھلی کرتا ہے۔ ایسا کرنے والے لوگ ایک روز خود بھی شدید نقصان اٹھاتے ہیں کیونکہ بہرحال انہیں اسی

معاشرے میں رہنا ہوتا ہے اور معاشرے کا نقصان آخر کار ان کا نقصان ثابت ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ اچھے اساتذہ حقیقی معنوں میں ملک و قوم اور مستقبل کے معمار ہوتے ہیں۔ یہ وہ خاموش مجاہد ہیں جن کی خدمات کا بدلہ اس دنیا میں دیا جانا ممکن نہیں۔ قیامت کے دن جب سب کچھ جاننے والا علیم و خبیر انصاف کے تخت پر بیٹھے گا تو جن لوگوں کو اس کی بارگاہ سے سب سے زیادہ رحمتیں اور درجات نصیب ہوں گے، ان میں سے ایک گروہ اچھے اساتذہ کا بھی ہوگا۔ اس لیے کہ ہر کسی کا عمل اس کی ذات کے ساتھ ختم ہو گیا تھا، مگر استاد کا عمل نسل در نسل اور انسان در انسان بڑھتا چلا گیا۔

استاد بننا پیشہ نہیں ہے۔ استاد بننا بڑی ذمہ داری کی بات ہے۔ استاد بننا ایک بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

لمبی قطار کی کوفت سے بچنا ہے تو
کریڈٹ لینے والوں کو چھوڑ کر
کام کرنے والوں کی قطار میں آ جائیں
یہاں بہت کم لوگ کھڑے ہوتے ہیں (ماخوذ)

خرچ کی عادت

اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہر مسلمان کی فطری خواہش ہوتی ہے۔قرآن کریم میں اس کا ایک انتہائی مؤثر اور یقینی طریقہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بتایا گیا ہے،(توبہ 9:99)۔

بہت سے لوگ اللہ کی قربت حاصل کرنے کے اس عظیم ذریعے سے اس لیے محروم رہ جاتے ہیں کہ وہ اپنی آمدنی اور اخراجات میں توازن نہیں رکھ پاتے۔ جب خرچ آمدن سے زیادہ ہو تو اللہ کی راہ میں دینے کے لیے پیسے نہیں بچ سکتے۔اس لیے ضروری ہے کہ بندۂ مومن اسراف سے بچے اور غیر ضروری اخراجات کو زندگی سے نکال پھینکے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ انفاق یعنی اللہ کے لیے خرچ کرنے کا مطلب ہے کہ کوئی بہت غریب آدمی اپنی انتہائی بنیادی ضرورت لے کر آئے تبھی ہم اسے کچھ دیں گے یا یہ کہ انفاق کے لیے بہت سارے پیسے دیے جانے ضروری ہیں۔ یہ تصورات ٹھیک نہیں۔اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے ان گنت مواقع دن رات ہمیں ملتے رہتے ہیں۔

مثلاً اپنے گھر والوں، دوست عزیزوں کے لیے چھوٹے چھوٹے تحائف انفاق کی ایک بہترین شکل ہیں کیونکہ اس سے محبت بڑھتی ہے۔کسی کے گھر جاتے ہوئے پھل فروٹ لے جانا، گھر آتے ہوئے خواتین کے لیے گجرے لے آنا، بظاہر یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں مگر جذبہ اللہ کی رضا ہو تو یہ چیزیں خدا سے قریب کرنے کے لیے بہت اہم ہیں۔

اسی طرح کسی غریب مزدور کو اس کے طے شدہ حق سے کچھ زیادہ دے دینا، سامان اٹھانے والوں اور گاڑی صاف کرنے والوں کو دس بیس روپے اضافی دے دینا، بظاہر بہت چھوٹا عمل ہے، مگر یہ عمل انسان میں انفاق کی عادت پیدا کرنے کے لیے بہت اہم ہے۔

انفاق ایک عادت ہے۔اسے اختیار کر لیجیے۔ یہ عادت خدا کی قربت کا یقینی ذریعہ ہے۔

اپنی زمین

یہ تیسری ملاقات تھی۔ پہلی دو ملاقاتوں میں وہ اس بات پر قائل ہو چکے تھے کہ حالات گرچہ بہت پریشان کن اور خراب ہیں، لیکن انہی حالات میں بڑا بڑی خیر، عافیت اور آسانی بھی پائی جاتی ہے۔ خاص کر کسی شخص کا اصل مقصود اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی ہو تو یہی بہترین حالات ہیں۔مگر اب ایک اور مسئلہ آ گیا۔ یہ مسئلہ مختصراً انہی کی زبانی سنیے۔

’امریکہ افغانستان میں بیٹھا ہے اور ہم پر ڈرون حملے کر رہا ہے۔حکومت میں سارے کرپٹ لوگ ہیں۔سیاستدان مخلص نہیں۔اصلاح کیسے ہوگی؟ کام کیسے شروع ہوگا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔‘

میں نے جواب میں عرض کیا۔آپ کو معلوم ہے ملک میں ہزاروں لاکھوں ٹن فصلیں کیسے پیدا ہوتی ہیں......ایسا اس وقت ہوتا ہے جب ہر کسان اپنے حصے کی زمین پر محنت کر کے فصل بوتا ہے۔زمین کم ہو یا زیادہ ہر کسان کی ساری توجہ اپنی زمین کی طرف ہوتی ہے۔اگر کسان اپنی زمین پر کام چھوڑ کر بنجر زمینوں کا رونا رونے لگے تو پھر کوئی فصل بھی پیدا نہیں ہوگی۔

ٹھیک اسی طرح آپ کا مسئلہ، آپ کی اپنی ذات ہے، آپ کے اردگرد کے قریبی لوگ ہیں۔کام یہاں ہونا ہے۔اصلاح یہاں سے ہونی ہے۔ یہ سوچنے میں وقت ضائع نہ کریں کہ دوسرے اپنے دائرۂ عمل میں اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کر رہے۔ یہ دیکھیے کہ آپ اپنے دائرے میں اپنا کام کر رہے ہیں یا نہیں۔آپ کام کر رہے ہیں تو یہ سب سے بڑا کام ہے نہ کہ دوسرے لوگوں کی بدعملی اور بے عملی دیکھ کر جلتے اور کڑھتے رہنا۔

ہم سب مل کر جب اپنی اپنی زمین پر کام کریں گے تو پھر ساری زمین کی اصلاح ہو جائے گی۔دوسری صورت میں نہ آپ کی اصلاح ہوگی نہ آپ کے قریبی ماحول کی اور نہ دوسروں کی۔

میں خوش نصیب تھا۔میری یہ بات بھی ان کی سمجھ میں آ گئی۔

دبئی کی جنت

اکیسویں صدی کے آغاز سے دبئی دنیا کا سب سے زیادہ تیزی سے ترقی کرتا ہوا شہر بن چکا ہے۔ آسمان کو چھو لینے والی بلند و بالا عمارات، عیش و آرام کی انتہاؤں کو پہنچ جانے والے محلات نما ہوٹل، سمندروں کے سینہ پر پام کے درخت اور دنیا کا نقشہ بناتے ہوئے مصنوعی جزیرے، بغیر ڈرائیور چلنے والا مکمل آٹو میٹک، تیز رفتار اور باسہولت ریلوے نظام اور ان کے علاقے کے دیگر متعدد تفریحی، تعلیمی اور تجارتی منصوبے جن کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی، اس شہر کی پہچان بن گئے ہیں۔

دبئی کی ترقی نے اسے دنیا بھر کے سیاحوں، فنکاروں، تاجروں اور سرمایہ کاروں کی توجہ کا مرکز بھی بنا دیا۔ خاص کر جائیداد اور سیاحت کے شعبے میں یہاں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری ہوئی۔ ان دونوں شعبوں کی ترقی چونکہ معاشی خوشحالی سے وابستہ ہے، اس لیے حالیہ عالمی معاشی بحران کے نتیجے میں دبئی کی ترقی کا عمل کافی متاثر ہوا ہے اور اس کے مستقبل کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔

دبئی کا مستقبل جو بھی ہو، یہاں ہونے والی تعمیرات اور فراہم کی جانے والی تفریح و تعیّشات نے انسانی طبیعت کے اس پہلو کو بہت نمایاں کر دیا ہے کہ انسان ایک لذت پسند مخلوق ہے۔ وہ دوسرے حیوانات کے برعکس ضروریات پوری ہونے پر قانع نہیں رہتا، بلکہ اس کا ذوق جمال اسے آمادہ کرتا ہے کہ وہ سہولت، خوبصورتی، تعیش، لذت اور غیر معمولی پن کو اپنا مقصود بنا لے۔ انسان کی اسی طبیعت کے جواب میں دبئی نے 'برج العرب' کی شکل میں دنیا کو پہلا سیون اسٹار ہوٹل دیا جہاں سہولت اور تعیش نے اپنی آخری حدوں کو چھو لیا۔ 'برج دبئی' بنا کر دنیا کی سب سے بلند عمارت تعمیر کی۔ 'ورلڈ' (World) کے نام سے سمندر میں ایسا مصنوعی جزیرہ بنایا جو عین دنیا کے نقشے کے مطابق بنا ہوا ہے۔ 'دبئی لینڈ' کی صورت میں دنیا کی وہ سب سے بڑی تفریح گاہ بنائی جو ڈزنی لینڈ سے تین گنا بڑی ہے۔ پام کے

درختوں کی شکل پر تین ایسے مصنوعی جزیرے بنائے جو چاند سے نظر آتے ہیں۔ مال آف امارات کی شکل میں مڈل ایسٹ کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر دیا جو صحرا میں جنت کا ایک نمونہ ہے۔

دبئی نے دنیا کو بے مثل تعمیرات ہی نہیں دیں بلکہ ان کے ساتھ کھیل، تفریح اور تعیش کے سارے اہتمام بھی جمع کر دیے۔ کچھ عرصہ قبل پام جمیرہ نامی مصنوعی جزیرے میں بننے والے عظیم الشان ہوٹل اٹلانٹس (Atlantis) کی افتتاحی تقریب اس کا ایک واضح ثبوت تھی۔ یہ ہوٹل خود اپنی ذات میں تفریح و تعیش کا ایک بے مثال نمونہ ہے جس کے مہنگے ترین سوئٹ (Suit) میں ایک رات قیام کا کرایہ 35 ہزار ڈالر ہے۔ اس تقریب میں دنیا بھر کے 2 ہزار سے زائد امیر ترین لوگ، شوبز اور اسپورٹس کی مشہور ترین شخصیات نے شرکت کی۔ اس رات جو پارٹی دی گئی اس پر دو کروڑ ڈالر خرچ ہوئے اور اس موقع پر کی جانے والی آتش بازی اپنی نوعیت کا خوبصورت ترین نظارہ تھا۔

دبئی میں ہونے والی یہ تعمیر و ترقی اور رونقیں خاموش زبان میں یہ پیغام دے رہی ہیں کہ پروردگار عالم نے جس جنت کا وعدہ انسان سے کر رکھا ہے وہ انسانیت کا خواب ہے۔ اس دنیا میں یہ خواب کبھی اپنی مکمل تعبیر نہیں پا سکتا۔ اکثر انسان تو غربت اور مصائب کے ایسے ستائے ہوتے ہیں کہ ان کے خواب ہمیشہ خواب ہی رہتے ہیں۔ اور جن کے خوابوں کی کچھ تعبیر سامنے آنے بھی لگے تو کبھی ان کا مال کسی معاشی بحران کی نذر ہو جاتا ہے اور کبھی زندگی کسی حادثے کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہاں جوانی، صحت، دولت اور زندگی سب عارضی ہیں۔ اس عارضی وجود کے ساتھ اس لافانی لذت کا حصول ممکن نہیں جو ہر انسان کا خواب ہے۔

لافانی لذت صرف لافانی جنت میں مل سکتی ہے۔ سردست یہ جنت قرآن مجید کے بیانات میں ملتی ہے یا پھر ستاروں اور کہکشاؤں کی تاریکیوں اور صحراؤں کی شکل میں ویران و ڈھنڈار پڑی

ہوئی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تیس چالیس سال قبل دبئ ایک تپتے ہوئے بے آب وگیاہ صحرا کے سوا کچھ نہ تھا۔عنقریب خدا ان تاریکیوں اور چٹیل میدانوں کو رنگ ونور اور سبزہ وآب کے سیلاب میں بدلنے والا ہے۔خدا کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں۔4.5ارب سال قبل ہماری زمین بھی آگ کا ایک گولا تھی۔ خدا نے اس کو زندگی اور خوبصورتی کا گہوارہ بنا دیا۔ بہت جلد وہ ساری کائنات کے ساتھ یہی کچھ کرنے والا ہے۔بہت جلد یہ جنت وجود میں آنے والی ہے۔

یہ جنت ان کو ملے گی جو بن دیکھے خدا پر ایمان لائے اور ہر اچھے برے حال میں اس کی بندگی پر قائم رہے۔جنھوں نے نفسانیت اور انانیت کے بجائے خدا پرستی اور حق پرستی کو اپنا شعار بنایا۔جنھوں نے خوشی اور غمی ہر حال میں خدا کو یاد رکھا۔خفیہ اور علانیہ ہر حال میں خدا سے ڈر کر رہے۔ ناراضی اور رضامندی میں ہمیشہ عدل کی بات کہی۔ امیری اور غریبی میں اعتدال اور انفاق پر قائم رہے۔ جو کٹنے والوں سے ملے، محروم کرنے والوں کو دیتے رہے، ظلم کرنے والوں کو معاف کرتے رہے۔ان کی خاموشی فکر، گفتگو ذکر اور نظر عبرت کی نظر رہی۔

لافانی لذت، لافانی زندگی، لافانی جنت انہی لوگوں کے لیے ہے۔ یہی لوگ جنت میں VIPs کے مقام پر ہوں گے۔ جنت کی ہر بلند ترین عمارت میں ان کا گھر ہوگا، بہترین ہوٹلوں میں ان کے لیے کمرے بک ہوں گے، ہر بڑی تقریب میں انھیں بلایا جائے گا، مہنگے ترین شاپنگ سنٹرز میں ان کو خریداری کی اجازت ہوگی۔کھیل وتفریح، عیش وعشرت اور عزت و سرفرازی کے ہر مقام پر یہ سب سے آگے ہوں گے۔

خدا کی جنت کا حصول آج بہت آسان ہے۔ بہت جلد وہ وقت آرہا ہے جب ساری پونجی لٹا کر اور ساری دنیا دے کر بھی جنت کی ایک انچ زمین حاصل کرنا ممکن نہ ہوگا۔ بہت خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس امکان کو آج سمجھ لیں اور اس موقع سے آج ہی فائدہ اٹھالیں۔ بہت بدنصیب ہیں وہ جو اس موقع کو ضائع کر دیں۔یہی لوگ ابدی خسارے کا شکار ہو جائیں گے۔

نفس اور شیطان

انسان بڑا خوش نصیب ہے......اسے جنت کی بے مثال نعمتوں اور لافانی بادشاہت کے حصول کا موقع ملا ہے۔انسان بڑا خوش نصیب ہے......اللہ کے پیغمبروں نے اس جنت تک پہنچنے کے راستے اسے کھول کر بتا دیے ہیں۔

انسان بڑا بدنصیب ہے......اس کا نفس دنیا کی حقیر اور عارضی لذتوں کے پیچھے لگ کر اسے اس سنہری موقع سے غافل کر دیتا ہے۔انسان بڑا بدنصیب ہے......مردود شیطان اسے معصیت اور سرکشی میں مبتلا کر کے باغِ بہشت کے بجائے نارِ جہنم میں دھکیل دیتا ہے۔

کوئی خوش نصیب اگر بدنصیبی سے بچنا چاہتا ہے تو اسے ان دونوں دشمنوں سے لڑ کر اپنی منزل تک پہنچنا ہوگا۔ان کے طریقۂ واردات سے آگہی حاصل کر کے انہیں نیچا دکھانا ہوگا۔ وگرنہ راستے کے یہ رہزن اس کی منزل کھوٹی کر دیں گے۔

ان دشمنوں میں سے پہلا شیطان ہے۔ یہ وہ دشمن ہے جس نے خدا کی عزت کی قسم کھا کر یہ چیلنج دیا تھا کہ اگر اسے مہلتِ عمل دی جائے تو وہ نسل انسانی کو برباد کر کے دم لے گا۔انسان زندگی کی سعی وجہد میں یہ بھول جاتا ہے کہ کسی نے اتنی بڑی قسم کھا کر، اپنی بربادی کی قیمت پر، اسے برباد کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ وہ بے خبری میں شیطان، اس کی ذریت اور انسانوں میں سے اس کے ایجنٹوں کے فریب میں آکر اپنی قبر آپ کھود لیتا ہے۔

انسان شیاطین کے فریب میں کیوں آجاتے ہیں؟ اس کی وجہ کچھ اور نہیں، انسان کا دوسرا دشمن ہے جو اس کے اپنے اندر موجود ہے۔اسے ہم نفس کے نام سے جانتے ہیں۔آپ اسے غدار کہیں، ففتھ کالمسٹ (Fifth Columnist) کہیں، بیوقوف کہیں، مفاد پرست کہیں یا کچھ اور۔ یہ ہمارے اندر شیطان کا ایجنٹ ہے جو اکثر حالات میں شیطان سے بڑا دشمن ثابت ہوتا ہے۔اس لیے پہلے اسی نفس کے متعلق بات ہونی چاہیے۔

نفس اصلاً انسان کا دشمن نہیں بلکہ اس کے اپنے وجود کا ایسا لازمی حصہ ہے جو اگر نہ ہو تو انسان اپنی زندگی برقرار نہیں رکھ سکتا۔ یہ پیٹ اور جنس کے تقاضوں میں اپنا اظہار کرتا ہے۔ یہ مال ومکان اور نام واولاد کو مرغوب رکھتا ہے۔ یہ لذت اور ذائقے اور حسن ودلکشی کا دلدادہ ہے۔ یہ عیش وعشرت کا دیوانہ ہے۔ یہ سب رکھنے والے

نے اس میں اس لیے رکھا ہے کہ ان خواہشات، جذبات اور مرغوبات کے بغیر زندگی، تمدن، خاندان اور معاشرت کچھ بھی باقی نہیں رہ سکتا۔

لیکن یہ نفس ضروریات سے آگے بڑھتا ہے اور ایک ناسمجھ بچے کی طرح - خیر و شر، نیک و بد اور جائز و ناجائز کی ہر تمیز سے بے نیاز ہوکر - اپنے مطالبات سامنے رکھ دیتا ہے۔ جب اس کی بات مانی جاتی ہے تو یہ بگڑنا شروع ہوجاتا ہے۔ اس کے مطالبات بڑھنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ لذت کا یہ پجاری حلال کی یکسانیت سے بیزار ہوجاتا ہے اور شریعت الٰہی کی حرمتوں کو بیڑیاں سمجھ کر توڑ ڈالتا اور حرص و ہوس کی وادیوں میں اتر جاتا ہے۔ اس کے منہ کو حرام لگ جاتا ہے۔ پھر حرام کی اس آگ کو کوئی ٹھنڈا نہیں کرسکتا۔ بجز نارِ جہنم کے جو دنیا کی آگ سے ستر گنا زیادہ ہے۔

نفس کی اس آگ کو بھڑکانے کے لیے شیاطین کے لشکر پہلے سے انسان کے خارج کا احاطہ کیے ہوتے ہیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ یہ شیطان جنوں ہی سے نہیں بلکہ انسانوں میں سے بھی ہوتے ہیں۔ یہ انسان وہ ہوتے ہیں جو خیر وصلاح کے ہر داعیے کو بھول کر اپنی خواہشات اور مفادات کے غلام بن جاتے ہیں۔ شیطان انہیں اپنا ایجنٹ بنالیتا ہے۔ پھر دونوں مل کر مکر و فریب اور گمراہی کے ایسے جال بنتے ہیں کہ الامان والحفیظ۔ یہ جال کہیں مذہب کے نام پر بُنا جاتا ہے کہیں میڈیا کے ذریعے سے پھینکا جاتا ہے۔ کہیں کوئی سیاسی لیڈر یہ کام کرتا ہے اور کہیں بڑے کاروباری لوگ ہوس زر میں شیطان کے مرید بن جاتے ہیں۔

نفس و شیطان کی اصل نوعیت کو جان لینے کے بعد سوال یہ ہے کہ ان کے شر سے کیسے بچا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں کے ہتھیاروں کو اور ان کے توڑ کو پہچانا جائے۔ تبھی یہ ممکن ہے کہ انسان روزِ قیامت جنت کی ابدی بادشاہی کا امیدوار ہوسکے گا۔

شیاطین کے دو بنیادی ہتھیار ہوتے ہیں۔ پہلا وسوسہ انگیزی اور دوسرا تزئین اعمال۔ وسوسہ انگیزی کا مفہوم تو بالکل واضح ہے۔ شیاطین جن دلوں میں خیالات ڈالتے ہیں۔ بار بار برائی کی طرف راغب کرتے ہیں۔ جبکہ شیاطینِ انس پروپیگنڈا، اشتہارات، دلفریب تقریروں، جذباتی نعروں، لچھے دار باتوں اور منطقی بحثوں سے لوگوں کو رام کرتے ہیں۔ شیاطین کا دوسرا ہتھیار تزئین اعمال ہے۔ یعنی یہ برائی کو کبھی برائی کی شکل میں پیش نہیں کرتے۔ بلکہ تاویل کا رنگ چڑھا کر ہر گندگی کو پاکی، ہر خامی کو خوبی اور ہر بدصورتی کو حسن بنا کر پیش کرتے ہیں۔ انسان اپنے باپ آدمؑ کی طرح دھوکے میں آکر ان کے پھندے میں پھنس جاتا ہے۔

آدمؑ کو تو ہدایت دینے والی خدا کی ذات تھی اس لیے وہ شیطان کے فریب سے نکل گئے مگر اولادِ آدم زندگی بھر شر کو خیر سمجھ کر اس سے چمٹی رہتی ہے۔

قرآن وحدیث میں اللہ کے ذکر اور اس سے مدد مانگنے کو شیاطین کے مکر و فریب سے بچنے کا واحد راستہ بتایا گیا ہے۔ اللہ کا ذکر اس کے کسی اسم کی مالا جپنے کا نام نہیں۔ یہ اللہ کی صفات کی معرفت اور اس کی یاد میں جینے کا نام ہے۔ یہ ان غیبی حقائق کو ذہن میں تازہ رکھنے کا نام ہے جو مادی دنیا کی تگ و دو میں انسان فراموش کردیتا ہے۔ یہ رب کائنات کی مدد و عافیت طلب کرنے کا نام ہے جو انسان کو برائی سے بچانے پر قادر ہے۔ ذکر و دعا میں جینے والا ایسا انسان کبھی شیطان کی وسوسہ انگیزی کا شکار نہیں ہوگا اور اگر ہوگا تو فوراً پلٹ کر توبہ کرلے گا۔ ذکر و دعا کی اس قسم کا سب سے اعلیٰ نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی شکل میں ہمارے پاس ہے۔ یہی وہ دعائیں ہیں جو انسان کو ذکر دوام کی لذت سے آشنا کرتی اور شیاطین کی وسوسہ انگیزی سے انسان کو محفوظ رکھتی ہیں۔

ذکر کی دوسری قسم جو تزئین اعمال کے شیطانی حربے سے بچاتی ہے قرآن کی تلاوت ہے۔ قرآن صاف بتاتا ہے کہ جو شخص ذکر کی اس قسم سے غفلت کرتا ہے اس پر ایک شیطان مسلط ہوجاتا ہے۔

> ’’اور جو خدا کے ذکر سے اعراض کرلیتا ہے تو ہم اس پر ایک شیطان مسلط کردیتے ہیں، جو اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور وہ ان کو (اللہ کی) راہ سے روکتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہدایت پر ہیں۔ تو یہاں تک کہ جب یہ ہمارے پاس آئے گا تو کہے گا کہ کاش! میرے اور تیرے درمیان مشرق کے دونوں کناروں کی دوری ہوتی! پس کیا ہی برا ساتھ ہوگا! اور جبکہ تم نے اپنے اوپر ظلم ڈھائے تو یہ چیز آج تم کو ذرا بھی نافع نہیں ہوگی کہ تم عذاب میں ایک دوسرے کے شریک ہو۔‘‘ (الزخرف 43:36 تا 39)

قرآن نہ صرف حق و باطل میں انسان کو بالکل درست راستہ بتاتا ہے بلکہ دین کی ترجیحات کے معاملے میں بھی انسان کو کبھی کسی غلطی میں مبتلا ہونے نہیں دیتا۔ چنانچہ قرآن کریم کو سوچ سمجھ کر اور تدبر سے پڑھنے والا شخص گناہ اور نیکی کی تفریق کو ہی اچھی طرح نہیں سمجھتا بلکہ وہ نیکیوں کے معاملے میں بھی خوب جانتا ہے کہ کس نیکی کا کیا مقام ہوتا ہے۔ ہماری اس بات کا پس منظر یہ ہے کہ عام لوگ باطل کو حق سمجھ کر گمراہ ہوتے ہیں جبکہ مذہبی لوگ دین کی ترجیحات سے ناواقفیت کی بنا پر ٹھوکر کھاتے ہیں۔ وہ مستحب کو واجب بنادیتے ہیں۔ خاص کو عام کردیتے

ہیں۔حکومت کو دیے گئے حکم کا مخاطب فرد کو بنا دیتے ہیں۔جس کے بعد افراط وتفریط کا پیدا ہونا یقینی ہے۔

افراط وتفریط میں مبتلا لوگ شیطان کی تزئین کا خاص نشانہ ہوتے ہیں۔ یہ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہودی حضرت عیسیٰ پر اعتراض کرتے تھے کہ ان کے پیروکار کھانے سے پہلے ہاتھ کیوں نہیں دھوتے۔عیسائیوں نے نیکی کے نام پر رہبانیت اختیار کرلی اور شریعت کو چھوڑ دیا۔جبکہ مشرکین عرب مردار کھاتے اور برہنہ ہوکر حرم کا طوف کرتے اور کہتے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ یہ سب شیطان کی تزئین کی مثالیں ہیں۔قرآن کریم کے علاوہ کوئی اور شے نہیں جو انسان کو اس قسم کی تزئین اعمال سے بچا سکے۔

تاہم قرآن کی یہ پناہ صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو آدمؑ کی طرح عجز کی نفسیات میں زندہ ہوں۔ جو اس امکان کو ہر لمحہ تسلیم کرتے ہوں کہ ان سے غلطی ہوسکتی ہے۔ پھر ان میں اتنا حوصلہ بھی ہو کہ غلطی کا اعتراف کرکے صحیح بات قبول کرلیں۔ یہی لوگ ہیں جو ہدایت پاتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اپنی غلطی کو ماننے سے انکار کردیتے ہیں،ان کے لیے ہدایت کا ہر دروازہ بند ہوجاتا ہے۔

شیطان کے بعد نفس کا معاملہ ہے۔ہم بیان کرچکے ہیں کہ نفس لذت اور مفادات کا غلام ہے۔ یہ کوئی خارجی شے نہیں بلکہ انسان کے اپنے اندر موجود ایک حقیقت ہے۔اس سے بچنے کا کوئی خارجی ذریعہ بھی موجود نہیں ہے۔اس سے لڑنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ہمت،ہمت اور صرف ہمت۔جب کسی حسین چہرے پر نگاہِ ثانی کا داعیہ پیدا ہو،جب حرام کا پیسہ آسانی سے ملتا نظر آئے،جب کاہلی اور غفلت کا غلبہ ہو تو ایسے میں صرف ہمت ہی وہ شے ہے جو نفس کے بے لگام گھوڑے کو قابو میں کرتی ہے۔

دین نے جو لازمی عبادات مقرر کی ہیں ان کی جہاں دیگر مصلحتیں ہیں وہیں یہ انسان کو ان دونوں دشمنوں سے مقابلہ کے لیے ہتھیار فراہم کرتی ہیں۔ان میں سے دو شیطان کے خلاف انسان کو تیار کرتی ہیں جبکہ دو نفس کے خلاف۔نماز اور حج خدا کی یاد اور اس کی قربت کا ذریعہ ہیں اور اس طرح یہ دونوں شیطانی حربوں کے خلاف ایک ڈھال بن جاتے اور شیطانی ترغیبات کے خلاف ایک مزاحمت پیدا کردیتے ہیں۔جبکہ روزہ اور زکوٰۃ کی عبادتیں انسان کے مادی تقاضوں پر ضرب لگاتی ہیں۔ یہ انسان کو اس ہمت سے آگاہ کرتی ہیں جو انسان کے اندر موجود ہے اور جس کی مدد سے وہ بھوک، پیاس اختیار کرتا اور اپنا مال دوسروں کو دیتا ہے۔یہی ہمت نفس کے خلاف انسان کا سب سے مؤثر دفاع ہے۔

بے شکل انسان

پانی اس کرۂ ارض پر زندگی کی بنیادی وجہ ہے۔ پانی کا زندگی کی بنیاد ہونا ہی اس کی اہمیت کا کافی بیان ہے،لیکن اس کے علاوہ پانی میں بعض بڑی دلچسپ اور عجیب خصوصیات پائی جاتی ہیں۔مثلاً یہ کہ پانی ہمیشہ نشیب کی طرف بہتا ہے،لیکن وہ بلند ترین درخت کے آخری سرے پر پہنچ کر پتیوں کو سیراب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پانی ایک بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ مائع ہونے کے علاوہ اپنا کوئی متعین حجم یا شکل بھی نہیں رکھتا۔وہ جس جگہ ہوگا اسی جگہ کے حساب سے خود کو ڈھال لے گا۔ پانی جگ میں کچھ اور شکل کا ہوتا ہے، گلاس میں کچھ اور۔ پہاڑی ندی میں پانی کا انداز الگ ہوتا ہے اور میدانی دریا میں بالکل جدا۔

ہر جگہ ایک نئی شکل اختیار کرلینا پانی کا بنیادی وصف ہے۔ اسی وجہ سے وہ ہر جگہ پہنچ کر جانداروں کی بقا اور زندگی کا سبب بن جاتا ہے۔تاہم انسانی معاشروں کی بقا اور زندگی پانی کی اس صفت کے بالکل برخلاف ایک دوسری صفت چاہتی ہے۔وہ یہ کہ انسان اپنی اخلاقی شخصیت کی صورت گری، حالات کے زیر اثر نہ کرے بلکہ اپنے اصولوں پر اپنی سیرت کی تعمیر کرے۔ وہ اپنے جسمانی وجود کی طرح اپنے اخلاقی وجود کو بھی ایک مستقل شکل دے۔

جو انسان غموں میں خدا کو یاد رکھے اور خوشی میں اسے بھول جائے......امیر سے مسکرا کر ملے اور غریب کے ساتھ بے رخی سے پیش آئے......طاقتور کے سامنے خاموش ہوجائے اور کمزور پر اپنا غصہ اتارے......تنہائی میں کچھ اور ہو اور محفل میں کچھ اور، ایسا انسان اپنی کوئی مستقل شکل نہیں رکھتا بلکہ وہ پانی کی طرح وقت، حالات اور لوگوں کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

یہ ’بے شکل انسان‘ خدا کی نظر میں ایک غیر مطلوب انسان ہے۔ ایسا انسان دنیا میں کچھ عارضی فائدے اٹھا سکتا ہے، مگر جنت میں وہ خدا کے ساتھ سے محروم کردیا جائے گا۔

بابر کا المیہ

انسانی وجود خواہشات کا ایک تپتا ہوا صحرا ہے۔ یہ صحرا اپنی سیرابی چاہتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر یہ دنیا دشتِ انساں کو سیرابی سے روشناس تو کراتی ہے، مگر تسکین کی منزل تک کبھی نہیں پہنچنے دیتی۔ یہاں خوشبو کی مہک، ذائقے کی لذت اور سریلے نغموں کی موسیقیت جیسی ان گنت نعمتیں لطف وراحت کا خوانِ لذت تو ضرور بچھاتی ہیں، مگر موت، بیماری، بڑھاپا، محدودیت اور بوریت کی بنا پر انسان اس خوان نعمت سے ہمیشہ بھوکا پیاسا اور محروم ہی اٹھتا ہے۔

فاتح ہند، بانی سلطنت مغلیہ ظہیر الدین بابر کی زندگی اس انسانی المیے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بابر 1483 میں پیدا ہوا اور اپنے باپ کے بعد صرف 12 برس کی عمر میں فرغانہ (موجودہ ازبکستان) کا حکمران بنا۔ مگر جلد ہی بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ زندگی کی اگلی تین دہائیاں اس نے وسط ایشیا اور افغانستان میں اقتدار حاصل کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے مسلسل جنگ و جدل میں گزاریں۔ 1526 میں ابراہیم کو پانی پت کی جنگ میں شکست دے کر ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم کیا اور یوں 43 برس کی عمر میں اسے وہ موقع میسر آ گیا کہ اس عظیم سلطنت کے حکمران کی حیثیت سے عیش وعشرت کی زندگی گزارے۔ مگر بدقسمتی سے صرف 47 برس کی عمر میں بیماری سے انتقال کر گیا۔ حالانکہ وہ جسمانی طور پر اتنا طاقتور تھا کہ دو آدمیوں کو کندھوں پر اٹھائے پہاڑ پر چڑھ جایا کرتا تھا۔

بابر کا المیہ ہر انسان کا المیہ ہے۔ انسان فاتح عالم ہی کیوں نہ ہو اس دنیا میں خواہشات کی تسکین نہیں پا سکتا۔ یہ چیز صرف فردوس کی اُس بستی میں ممکن ہے جہاں موت، بیماری، غم والم، محدودیت اور بوریت جیسی سب چیزیں ختم کر دی جائیں گی۔ یہ فردوس ہر باشعور انسان کا مقصود ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہی انسان کی ہر خواہش کی ابدی تسکین کا واحد ممکنہ ذریعہ ہے۔

بابرُ نہ، عیش کوش

مغلیہ سلطنت کا بانی ظہیر الدین بابر میدان جنگ کا ایک آزمودہ اور نڈر سالار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شاعر اور ادیب بھی تھا۔ 'بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست' (بابر عیش کر لو کہ یہ دنیا دوبارہ نہیں ملے گی)، جیسا ضرب المثل مصرعہ کہنے والا کوئی اور نہیں یہی فاتح ہند تھا۔ تاہم جب شہنشاہ ہند ہونے کی حیثیت میں عیش ومستی کے سارے اسباب اس کی دسترس میں تھے، صرف 47 برس کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی موت اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ یہ دنیا عیش کی جگہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آزمائش کی دنیا اُس آنے والی جنت کی پرلذت دنیا کے لیے خود کو اہل ثابت کرنے کی جگہ ہے۔

جنت کی اہلیت کیا ہے؟ یہ اپنے اندر ایک اعلیٰ اخلاقی شخصیت کی تعمیر کرنے کا مشن ہے۔ اس شخصیت کو اگر مختصر ترین الفاظ میں بیان کیا جائے تو یہ اخلاقی آلودگیوں سے پاک اور اعلیٰ اوصاف سے آراستہ ایک پاکیزہ شخصیت ہے۔ یہ شخصیت کبھی عیش وعشرت سے پیدا نہیں ہوتی۔ یہ شخصیت صبر و برداشت اور استقامت کی زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ صبر اختیار کرنے کے بعد ہی انسان اس قابل ہوتا ہے کہ اخلاقی آلائشوں سے بچنے اور اعلیٰ اوصاف اختیار کرنے کو زندگی کا مسئلہ بنائے۔ اس مقصد کے لیے علم حاصل کرے، مطالعہ کی مشقت جھیلے اور اچھی صحبت اور اساتذہ کے حصول میں سرگرم رہے۔ وہ 'بابر بہ عیش کوش' کے بجائے 'بابر نہ عیش کوش' کے اصول کو اختیار کرے اور دنیا کے بجائے آخرت کو مقصود بنائے۔ یہی لوگ ہیں کہ جنت کی ختم نہ ہونے والی نعمتیں، لذتیں، راحتیں، اور آسانیاں جن کا مقدر ہوں گی۔

رہے دنیا پرست تو ان کا انجام محرومی کے سوا کچھ اور نہیں۔ ایسے لوگوں کی پیاس نہ دنیا میں بجھے گی، نہ حشر میں اور نہ جہنم کی 'انگار وادی' میں۔

ہم کو نہیں

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو قیامت تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رکھنے کا اہتمام کیا ہے۔ یہ تحفظ قدیم الہامی کتابوں کو حاصل نہیں تھا۔ اس لیے ان میں معنوی تحریفات اور لفظی تبدیلیوں کا دروازہ کھلا رہا۔ تاہم اس کے باوجود ان کتابوں کے بہت سے مقامات پر دین کی اصل تعلیمات بعینہٖ موجود ہیں۔ بعض اوقات تو ان کے الفاظ بھی وہی ہیں جو قرآن کریم میں آئے ہیں۔ مثلاً سورۂ اعراف میں بت پرستی پر تنقید کرتے ہوئے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اسے ملاحظہ کیجیے:

''کیسے نادان ہیں یہ لوگ کہ ان کو خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں جو کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ جو نہ ان کی مدد کرسکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد پر قادر ہیں۔ اگر تم انھیں سیدھی راہ پر آنے کی دعوت دو تو وہ تمھارے پیچھے نہ آئیں، تم خواہ انھیں پکارو یا خاموش رہو، دونوں صورتوں میں تمھارے لیے یکساں ہی رہے۔ تم لوگ خدا کو چھوڑ کر جن لوگوں کو پکارتے ہو وہ تو محض بندے ہیں جیسے تم بندے ہو۔ ان سے دعائیں مانگ کر دیکھو، یہ تمھاری دعاؤں کا جواب دیں اگر ان کے بارے میں تمھارے خیالات صحیح ہیں۔ کیا یہ پاؤں رکھتے ہیں کہ ان سے چلیں؟ کیا یہ ہاتھ رکھتے ہیں کہ ان سے پکڑیں؟ کیا یہ آنکھیں رکھتے ہیں کہ ان سے دیکھیں؟ کیا یہ کان رکھتے ہیں کہ ان سے سنیں؟''، (اعراف 7:195-191)

یہی مضمون زبور میں جن الفاظ میں بیان ہوا ہے، اب اسے ملاحظہ کیجیے:

''ان کے بت چاندی اور سونا ہیں یعنی آدمی کی دستکاری۔ ان کے منہ ہیں پر وہ بولتے نہیں۔ آنکھیں ہیں پر وہ دیکھتے نہیں۔ ان کے کان ہیں پر وہ سنتے نہیں۔ ناک ہے پر

وہ سونگھتے نہیں۔ ان کے ہاتھ ہیں پر وہ چھوتے نہیں اور ان کے گلے سے آواز نہیں نکلتی۔ ان کے بنانے والے ان ہی کی مانند ہو جائیں گے۔ بلکہ سب جو اِن پر بھروسا رکھتے ہیں۔''، (زبور 115:8-4)

زبور کی جس حمد کا حوالہ ہم نے دیا ہے، اس کا آغاز بھی بڑا بے مثل ہے۔ اس کا پہلا بند اس طرح ہے:

''ہمکو نہیں! اے خداوند! ہم کو نہیں
بلکہ تو اپنے ہی نام کو
اپنی شفقت اور سچائی کی خاطر جلال بخش۔''، (زبور 115:1)

زبور کے یہ الفاظ ایک مخلص داعیِ حق کے دل سے نکلنے والے سچے ترین الفاظ ہیں۔ اس کے جذبات کی ترجمانی کے لیے اس سے زیادہ موزوں الفاظ ملنا مشکل ہے۔ بندۂ مومن کی اصل دلچسپی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتی ہے۔ اللہ کی بڑائی، اُس کی عظمت، اُس کی کبریائی، اُس کی حمد، اُس کی تعریف، اُس کا شکر، اُس کی تسبیح اور اُس ہی کی تقدیس کرنا اس کی زندگی کا مشن ہوتا ہے۔ وہ خدا کے دشمنوں کے خلاف لڑتا ہے۔ اس کے دین کی مدد کو اپنی زندگی کا مقصد بناتا ہے۔ شرک والحاد کے اندھیروں میں شمع توحید جلاتا ہے۔ بت پرستی اور دنیا پرستی کے دور میں خدا پرستی کا علم اٹھاتا ہے۔ شیطان اور اس کے لشکروں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔

اس راہ میں وہ ہر مشقت جھیلتا اور ہر تکلیف اٹھاتا ہے۔ ہر ملامت سنتا اور ہر ایذا سہتا ہے۔ ہر دشمنِ حق سے مقابلہ کرتا اور ہر میدان میں لڑتا ہے۔ لیکن اس ساری سعی و جہد کا مقصود صرف ایک ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جس رب سے اسے سب سے زیادہ محبت ہے، اس کی کبریائی کا پرچم ہر چوٹی پر گاڑ دیا جائے۔ جس خدا نے انسان کو سب کچھ دیا ہے، انسان اس خدا کا شکر گزار بن جائے۔ جس خدا کے ہاتھ میں دنیا و آخرت کا ہر نفع و ضرر ہے، لوگ اسی خدا کی عبادت کریں اور

اسی کے سامنے دست سوال دراز کریں۔

داعیِ حق کی دلچسپی کبھی اس بات سے نہیں ہوتی ہے کہ اس کی ستائش ہو اور لوگوں سے اسے کوئی صلہ ملے۔ اس کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی کہ لوگ اسے اچھا کہیں یا لعنت و ملامت کا ہدف بنائیں۔ اپنی ذات کی سربلندی، اپنے مفادات کا حصول، اپنے اسلاف کی عظمت اور اپنی قوم کے لیے کوئی تعصب، یہ اس کے مسائل نہیں ہوتے۔ اپنا فرقہ، اپنا مسلک، اپنے اکابرین، اپنی جماعت کی قسم کے الفاظ اس کی لغت میں نہیں ہوتے۔ مقلدین اور مریدوں سے اپنی عظمت کے ترانے پڑھوانا، اپنے نام کے ساتھ درجن بھر القاب لگوانا، اپنے پیروکاروں پر اپنی عظمت اور بزرگی کا سکہ بٹھانا، اپنی کرامات اپنے علم اور اپنی ذہانت و خطابت کا ڈھنڈورا پٹوانا کبھی اس کے پیش نظر نہیں ہوتا۔

وہ عارف باللہ ہوتا ہے۔ جانتا ہے کہ وہ صرف خاک ہے؛ وہ صرف راکھ ہے۔ اسے خدا کی عطاؤں میں سے اگر کچھ ملتا ہے تو وہ اسے گدائے بے نوا کو ایک شہنشاہ کی طرف سے ملنے والی بھیک سمجھتا ہے۔ اسے کوئی مادی کامیابی مل بھی جائے تو وہ اسے اپنے رب علیم و حکیم کی آزمائش سمجھتا ہے۔ کوئی خدمت اس سے لے لی جائے تو اسے اپنی سعادت سمجھتا ہے۔

یہی داعیِ حق ہوتا ہے اور صرف یہی داعیِ حق ہوتا ہے۔ ان احساسات سے ہٹ کر جو لوگ خدا کے نام پر کھڑے ہوتے ہیں وہ خدا کی نظر میں کسی مسخرے سے بڑھ کر نہیں ہوتے۔ یہ مسخرے جلد یا بدیر اپنے انجام کو پہنچ کر رہتے ہیں۔ رہے سچے داعیِ حق تو ان کی صدا ایک ہی ہوتی ہے۔

ہمکو نہیں! اے خداوند! ہم کو نہیں

بلکہ تو اپنے ہی نام کو

اپنی شفقت اور سچائی کی خاطر جلال بخش۔

بھیڑ کی نفسیات

دورِ جدید میں جہاں دیگر علوم و فنون میں غیر معمولی تحقیقات ہوئی ہیں وہیں، انسانی نفسیات پر بھی بڑا غیر معمولی کام ہوا ہے۔ انسانی نفسیات پر کیے گئے متعدد تجربات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ لوگ جب کسی ایک یا دو افراد کو کوئی نیا اور مختلف کام کرتا ہوا دیکھتے ہیں تو اس کا اثر کم ہی قبول کرتے ہیں۔ مگر کام کرنے والوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی، لوگ اتنا ہی زیادہ اس کی پیروی کریں گے۔ مثلاً بازار میں ایک شخص اچانک 'ٹائم بم، ٹائم بم' کی صدا بلند کرکے بھاگنا شروع کردے تو لوگ اسے دیکھ کر اس کی پیروی نہیں کریں گے۔ مگر بہت سارے افراد اگر یہی کریں تو باقی لوگ بلا تردّد ان کی پیروی کریں گے۔ انسانی نفسیات کے اس پہلو کو بھیڑ کی نفسیات کہا جاتا ہے۔

بھیڑ کی اسی نفسیات کا نتیجہ ہوتا ہے کہ کسی نئے کام کے آغاز یا رواج میں بہت کم لوگ شامل ہوا کرتے ہیں۔ خاص کر کے جب یہ کام آخرت کی دعوت پر لبیک کہنے کا ہو۔ اس لیے کہ اس دعوت میں انسان کو فوری ملنے والی دنیا پر آخرت کی یقینی مگر بعد میں ملنے والی نعمتوں اور مادی مفادات پر اخلاقی اصولوں کو ترجیح دینے کی مشکل چڑھائی چڑھنی پڑتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ابتدا میں پیغمبروں تک کا ساتھ دینے والے لوگ بہت کم ہوا کرتے تھے۔ مگر یہی لوگ تھے جنہیں 'سابقون' یعنی سبقت لے جانے والے کہا گیا۔ اور قرآن میں ان کا بدلہ یہ بیان کیا گیا کہ یہ لوگ جنت میں اللہ تعالیٰ کے مقربین میں شامل ہوں گے۔ (واقعہ 10-11:56)

آج دنیا میں سوا ارب سے زیادہ مسلمان موجود ہیں لیکن اس کے باوجود دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے کے تنگ راستے پر کوئی بھیڑ نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ نئے لوگ اس راستے پر آنے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن کوئی حوصلہ مند اگر آج بھی اس راستے پر چلنے کا عزم کرلے تو بلاشبہ خدا اسے سابقین میں گن لے گا اور قیامت کے دن اسے خدا کے قرب اور جنت کے اعلیٰ مقام سے سرفراز کیا جائے گا۔

گول اور مزاحمت

ہاکی ایک بے حد دلچسپ اور تیز رفتار کھیل ہے۔ اس میں کسی ٹیم کے جیتنے کا معیار یہ ہوتا ہے کہ اس نے مخالف ٹیم کے خلاف کتنے گول کیے ہیں۔ ٹیم کے گیارہ کھلاڑی مل کر یہ کوشش کرتے ہیں کہ گیند اپنے گول میں جانے کے بجائے مخالف ٹیم کے گول میں جائے۔ اس مقصد کے لیے کھلاڑی مل کر کھیلتے، مخالف کھلاڑیوں کو ڈاج دیتے اور آپس میں گیند ایک دوسرے کو پاس کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مخالف ٹیم کے آخری حفاظتی حصار یعنی ڈی میں داخل ہوتے اور پھر ہِٹ لگا کر گیند کو گول میں پھینکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مخالف ٹیم اس عمل میں زبردست مزاحمت کرتی ہے۔ مگر ہاکی کے کھیل میں کوئی کھلاڑی یہ تصور نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے ہاف سے گیند لے کر چلے اور مخالف ٹیم کے ہاف میں ان کی مزاحمت سے گھبرا کر خود ہی گیند چھوڑ دے۔ وہ آخری دم تک گیند مخالف گول میں پھینکنے کی کوشش کرتا ہے۔

ہاکی کے میدان کی طرح زندگی کے میدان میں بھی ہر انسان اپنے لیے ایک مقصد یا گول بناتا ہے اور پوری قوت سے اس کے حصول کے لیے سرگرم ہوجاتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے اس میدان میں بہت سے نادان لوگ اپنا ہدف اور گول متعین کرنے کے بعد بہت سا وقت، پیسہ اور توانائی اس کام میں لگاتے ہیں لیکن پھر کچھ عرصہ میں معمولی مزاحمت اور پریشانی سے گھبرا کر اپنے مقصد سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو بلا سوچے سمجھے اپنے اہداف متعین کرتے اور پورے جوش سے ان کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔ مگر حقیقت کی گرمی ان کے جوش کو بھاپ بنا کر اڑا دیتی ہے اور ان کے حصے میں وسائل کے زیاں، مقاصد سے محرومی اور زندگی میں ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔

زندگی میں کامیاب صرف وہی لوگ ہوا کرتے ہیں جو سوچ سمجھ کر اپنے اہداف کا تعین کرتے اور پھر ان کو اپنا سب سے بڑا مقصد بنا لیتے ہیں۔ ایسے لوگ مزاحمت اور رکاوٹوں سے گھبرائے بغیر اپنے مقصد کے لیے بھرپور جدوجہد کرتے ہیں اور پھر جلد یا بدیر اپنا مقصد پا لیتے ہیں۔

اصل کرنسی

قرآن کریم میں سورۂ مومنون (60-61:23) میں بیان ہوا ہے کہ سچے اہل ایمان اللہ کی راہ میں حسبِ توفیق جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اس کے بعد بھی ان کا دل ڈرتا رہتا ہے۔ کیونکہ وہ اس یقین میں جیتے ہیں کہ ایک روز انھیں اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے۔ اُس روز کی جانچ میں اگر ان کا یہ انفاق خالص اللہ کی رضا کے لیے نہیں ہوا تو سارا عمل غارت ہوجائے گا۔

ایک صحیح حدیث میں اس بات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن ایک شہید، ایک سخی اور ایک عالم کو ان کے تمام تر نیک کاموں کے باوجود جہنم میں اس لیے پھینک دیا جائے گا کہ ان کے اعمال کے پیچھے اصل نیت خدا کی رضا کی نہیں بلکہ لوگوں کی نظر میں بڑا بننے کی تھی، (مسلم، رقم 1905)۔

قرآن وحدیث کی ان تعلیمات کے بعد ہر بندۂ مومن پر لازم ہے کہ وہ اچھے عمل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی نیت کا جائزہ بھی ہر آن لیتا رہے۔ اگر نیت خدا کی رضا اور آخرت کی کامیابی کی ہے تو پھر انسان کو دنیا میں کسی صلے، کسی ستائش اور کسی بدلے کا امیدوار نہیں ہونا چاہیے، کسی تعریف پر خوش نہیں ہونا چاہیے اور کسی خاص مقام اور اہمیت کے حصول کا تقاضا نہیں کرنا چاہیے۔

دنیا میں لوگ اپنی کمائی چھپاتے ہیں۔ بندۂ مومن کو بھی اپنی آخرت کی کمائی یعنی نیکیاں دوسروں سے چھپانی چاہییں۔ وہ اگر اپنی یہ قیمتی کرنسی لوگوں سے چھپا نہ سکے تو کم از کم اسے یہ حماقت نہیں کرنی چاہیے کہ وہ نیکی کی کرنسی سے لوگوں کی تعریف، لوگوں کی نظر میں اپنا مقام اور اپنی بڑائی جیسی معمولی اور بے وقعت چیزوں کو خریدنا شروع کردے۔ یہ اپنی بہترین کمائی کو ضائع کرنے کا بدترین طریقہ ہے۔

عقل مند شخص وہ ہے جو اس کرنسی کو جنت میں اپنا گھر اور سامان خریدنے کے لیے محفوظ رکھے۔ اور بدنصیب ہے وہ شخص جو اس کرنسی کو اپنی تعریف سننے کے لیے دنیا میں خرچ کرگیا۔ کیونکہ اس کے بعد انسان کے پاس رہنے کے لیے جہنم کے سوا کوئی اور جگہ نہیں بچے گی۔

پریشانی

"تم میں سے کون ہے جو خدا کے محبوب پیغمبر ایوب کی طرح ہے؟ ایوب کو تو دنیا کے سامنے ایک نمونہ بنانا مقصود تھا۔ سو وہ پیکرِ صبر ہر مصیبت پر سرِ تسلیم خم کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دنیا نے جان لیا کہ مالک حقیقی کا حق اتنا زیادہ ہے کہ جب جان، مال، آبرو تینوں برباد ہو جائیں تب بھی زبان سے شکر گزاری کے الفاظ ہی نکلنے چاہییں۔ اس لیے کہ سب کچھ اُسی نے دیا ہے اور اگر اس سب کچھ میں سے کچھ اگر اُس نے لے بھی لیا تو شکوہ اور شکایت کیسی، مگر تم میں سے کون ہے جو خدا کے محبوب پیغمبر ایوب کی طرح ہے؟"

خدا کے اس عارف کی گفتگو سننے والوں کے دلوں میں اتر رہی تھی...... معرفت کی بارش غفلت بھرے سنگلاخ سینوں کو نرم کر رہی تھی۔ وہ ایک وقفے کے بعد پھر گویا ہوئے مگر اس دفعہ خواب کی سچی تعبیر دینے والے خدا کے سچے پیغمبر یوسفؑ کی طرح مسئلے کے ساتھ اس کا حل بھی بتانے لگے۔

"تمھارے رب کو معلوم ہے تم ایوب نہیں ہو۔ اس لیے وہ تم پر مصائب کسی اور وجہ سے بھیجتا ہے۔ کچھ لوگوں کے گناہ ان کی نیکیوں کو کھانے لگتے ہیں...... جس طرح آگ لکڑیوں کو کھاتی ہے۔ ان غافلوں کے پاس گناہوں کے گرم پانی کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ سو یہی گرم پانی آگ پر انڈھیل دیا جاتا ہے۔ اس پر وہ آہ و زاری کرتے اور خدا کو پکارتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اس پکار میں استغفار کو شامل کریں، سچی توبہ کو شامل کریں۔ پھر بخشش کی ٹھنڈی ہوا ہر آگ کو ٹھنڈا کر دے گی۔

کچھ مصائب قانونِ قدرت کا حصہ ہوتے ہیں۔ بیماری بہر حال آجاتی ہے، حادثہ بہر حال ہو جاتا ہے، ناگہانی ہو کر رہتی ہے...... انسان ان سے بچ نہیں سکتا۔ ایسے میں خدا سے اس کی عافیت اور آسانی مانگو۔ اس کے تحفظ کی چھتری میں پناہ چاہو۔ یہ چھتری جسے مل گئی وہ مصائبِ دھوپ سے نہ بھی بچے، ان کی جھلسا دینے والی تپش سے ضرور بچ جاتا ہے۔"

"کیا انسانی حکمت و تدبیر کا مصائب کے روکنے میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا؟"، ایک سامع نے

بیچ میں سوال کیا۔ عارف نے مسکرا کر جواب دیا:

"ہوتا ہے، بالکل ہوتا ہے۔ دیکھو خدا نے تمھیں جانور نہیں بنایا، انسان بنا کر پیدا کیا ہے۔ تمھیں عقل دی ہے، شعور دیا ہے۔ تم جیسے ہی اسے استعمال کرو گے بہتری تو آئے گی۔ تم اپنی غذا، سوچ اور معمولات کو ٹھیک کر لو۔ اکثر بیماریوں سے بچ جاؤ گے۔ تم منصوبہ بندی اور اعتدال سے کام لو تو افلاس اور محتاجی سے محفوظ رہو گے۔ میں اس کی نفی نہیں کر رہا۔ میں تو یہ بتا رہا ہوں کہ تدبیر کے باوجود جو مشکل آجائے اس سے کیسے نکلا جائے۔

اب آخری بات کو غور سے سنو جو اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔ مصیبت تمھیں بہتر بنانے کے لیے آتی ہے۔ تمھاری زندگی، عادات، رویے اور سوچ میں...... تمھاری سیرت، اخلاق، کردار اور ایمان میں کوئی کمی، کوئی کجی، کوئی غلطی ہوتی ہے جو تمھاری دنیا یا آخرت کے لیے تباہ کن ہوتی ہے۔ جس کے بعد خدا کوئی بہت بڑی مصیبت بھیجتا ہے۔ یہ مکمل تباہی سے پہلے ایک فیصلہ کن وارننگ ہوتی ہے۔

جیسے ہی تمھیں یہ احساس ہو فوراً اپنے رب کے قدموں میں بچھ جاؤ۔ اُس سے معافی مانگو۔ اُس سے آسانی مانگو۔ اُس سے عافیت مانگو۔ جب کوئی طریقہ مؤثر نہ ہو تو سمجھ لو کہ تمھارا رب تم میں کوئی بہت بڑی کمزوری دیکھ رہا ہے۔ جس کا تمھیں احساس نہیں۔ تمھارا عیب اور تمھاری خرابی ایک اژدہے کی طرح تمھیں دبوچے ہوئے ہیں، مگر تم غفلت اور فخر کے عالم میں اسے آغوشِ مادر سمجھے ہوئے ہو۔

اب وقت اعتراف کا ہے۔ اپنی خرابی اور عیب کو تسلیم کر لینے کا ہے۔ یہ سمجھ لینے کا ہے کہ اصل مصیبت خارج میں نہیں تمھارے اندر ہے۔ یہ عزم کرنے کا ہے کہ تم اپنی خرابی کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دو گے۔ اس عزم کے بعد زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ ہر مصیبت ٹل جائے گی۔

اور آخری بات یہ کہ تم نے یہ عزم نہیں کیا اور اپنے عیوب اور خامیوں کی تاویلوں میں الجھ گئے تو بس پھر انتظار کرنا...... اُس وقت کا جب تمھاری کشتی بھری جائے اور بھر کر ڈبو دی جائے۔"

زندہ معجزہ

علامہ اقبال برصغیر کے مسلمانوں کے ایک ملی رہنما ہونے کے علاوہ ایک فلسفی، سیاستدان اور عظیم فکری قائد بھی تھے۔ اقبال نے اپنے خیالات لوگوں تک پہنچانے کے لیے شاعری کے ذریعے کو اختیار کیا۔ انہیں شاعری پر اس قدر عبور تھا کہ لطیف انسانی جذبوں سے لے کر فلسفیانہ مضامین تک اور ملی جذبات سے لے کر ایمانی احساسات تک ان کی شاعری میں یکساں خوبی کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دیگر حیثیتوں کے ساتھ ساتھ انہیں ایک عظیم شاعر کے طور پر بھی یاد کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری کے مختلف ادوار ہیں۔ ان کی مشہور کتاب بانگ درا میں شاعری کے یہ ادوار سنین کے تعین کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ ان ادوار کی شاعری کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اقبال کے خیالات میں بتدریج ارتقا ہوا۔ اسی طرح ان کی شاعری، اسلوب اور ان کا انداز بیان بھی ایک ارتقائی عمل سے گزر کر بتدریج بہتر ہوئے اور ان کی اگلی کتابوں بال جبریل وغیرہ میں نقطۂ عروج پر پہنچ گئے۔

یہ تنہا اقبال کا معاملہ نہیں۔ اس دنیا میں ہر بڑا یا چھوٹا تخلیق کار، مصنف، مفکر، شاعر، ادیب ارتقا کے اسی عمل سے گزرتا ہے۔ وہ سیکھتا ہے، آغاز کرتا ہے، غلطیاں کرتا ہے، اصلاح کرتا ہے اور بتدریج اپنے کام میں بہتری لاتا ہے۔ پھر کہیں جا کر وہ آسمان فن و ادب پر ایک تابندہ ستارے کی طرح چمکتا ہے۔ یہ تو ممکن ہے تخلیق کار اپنے ابتدائی کام کو لوگوں میں لانے کے بجائے بعد میں کیے ہوئے اپنے بہتر کام کو پبلک میں لائے۔ لیکن دنیا کے بڑے سے بڑے تخلیق کار کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے تخلیقی کام کا آغاز کرے اور پہلے ہی دن آخری درجے کا کام کر گزرے۔ یہ ایک عالم گیر اصول ہے۔ معلوم تاریخ میں اس اصول سے صرف ایک شخصیت کا

استثنا ملتا ہے۔ یہ شخصیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہے اور اس کا زندہ ثبوت آپ کا پیش کردہ کلام قرآن پاک ہے۔

کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری پیغمبر مانے یا نہ مانے وہ اس حقیقت کا انکار نہیں کرسکتا کہ آپ کا پیش کیا ہوا کلام عربی ادب کا شاہکار تھا۔ قرآن کی ادبی حیثیت کیا تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں مخالفین کو جگہ جگہ یہ چیلنج دیا گیا ہے کہ وہ اس کے جواب میں اس جیسی ایک سورہ ہی بنا کر لے آئیں۔ مگر زبان و ادب میں اپنی تمام تر مہارت کے باوجود اہل عرب اس جیسا کلام نہ لا سکے۔

یہ اس کلام کی عظمت ہے، مگر دوسری طرف یہ بھی ایک معجزانہ حقیقت ہے کہ اس کلام کو ایک ایسے شخص نے لوگوں کے سامنے پیش کیا جسے پڑھنا لکھنا نہیں آتا تھا۔ جسے زندگی بھر شعر و ادب کا کوئی ذوق و شوق نہیں رہا۔ مگر جب اس ہستی نے یہ کلام پیش کیا تو پہلے دن ہی سے یہ کلام اپنی زبان، بیان، اسالیب اور مضامین کے لحاظ سے آخری درجہ کا کلام تھا۔ یہ کلام 23 برس تک اترتا رہا، مگر اس میں پیش کردہ افکار و خیالات میں کوئی تبدیلی یا زبان و بیان میں کسی ارتقا کا کوئی معمولی سا شائبہ بھی نہیں ملتا۔

اس معجزے کا سبب یہ ہے کہ یہ کلام انسانی کلام نہیں بلکہ خدائی کلام ہے۔ یہ اُس پروردگارِ کائنات کا کلام ہے جو سیکھتا نہیں سکھاتا ہے۔ جو ہر علم کا منبع اور ہر فن کا موجد ہے۔ جو ہر طرح کی غلطی، بھول، نسیان اور ارتقا سے پاک ہے۔ جس کا کوئی آغاز نہیں۔ جس کا کوئی اختتام نہیں۔ ایسا لامحدود رب، ایسا عظیم رب جب کلام کرے گا تو یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کے کلام میں کوئی غلطی، ارتقا یا تضاد پایا جائے۔

قرآن پاک پروردگار عالم کا کلام ہے۔ یہ سر تا سر ہدایت ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ سر تا سر ایک معجزہ بھی ہے۔ ایک زندۂ جاوید خدائی معجزہ۔

وہ کیوں عظیم تھے؟

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ جلیل القدر صحابۂ کرام میں سے ہیں۔ وہ بالکل ابتدا میں اسلام قبول کرنے والی شخصیتوں میں سے آٹھویں تھے۔ اسلام کے لیے ان کی خدمات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو ملنے والی بشارتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ کوئی مختصر مضمون نہیں کرسکتا۔

حضرت طلحہؓ جو خود ایک جلیل القدر صحابی تھے، ان میں اور حضرت عبدالرحمٰنؓ میں کسی بات پر رنجش ہوگئی۔ اس دوران میں حضرت طلحہؓ بیمار پڑے تو حضرت عبدالرحمٰنؓ ساری رنجش اور شکایت بھلا کر ان کی عیادت کرنے پہنچ گئے۔ طلحہؓ نے انھیں دیکھا تو کہا کہ آپ مجھ سے بہتر ہیں۔ آپ بیمار ہوتے تو میں عیادت کے لیے نہیں آتا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ صحابۂ کرام میں وہ دو بنیادی اوصاف کیا تھے جو انسانوں کو عظیم بنادیتے ہیں؟ پہلا وصف برتر اخلاق ہے اور دوسرا اعتراف۔ برتر اخلاق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان کا اخلاق حالات اور دوسروں کے رویے پر منحصر نہ ہو کہ جو میرے ساتھ اچھا ہے میں اس کے ساتھ اچھا ہوں گا۔ بلکہ انسان اعلیٰ اخلاق کو بطور ایک اصول کے اللہ کی رضا کے لیے اختیار کرے۔ یہاں تک کہ جب کسی سے اختلاف اور شکایت ہو تب بھی انسان آگے بڑھ کر اعلیٰ اخلاق اور خیرخواہی کا مظاہرہ کرے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا مظاہرہ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے شکایت کے باجود حضرت طلحہؓ کی عیادت کے لیے جا کر کیا۔

اس کے جواب میں حضرت طلحہؓ نے جو کچھ کیا وہ اعتراف تھا۔ یعنی انھوں نے اپنی انا اور عزت کو ایک طرف رکھ کر یہ مان لیا کہ عبدالرحمٰنؓ نے ان سے بہتر انسان ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ یہ اعتراف کرکے وہ بھی عبدالرحمٰنؓ کی سطح پر آگئے۔ کیونکہ اعلیٰ اخلاق جتنی بڑی نیکی ہے اعتراف بھی اُتنی ہی بڑی نیکی ہے۔ یہی وہ دو اوصاف تھے جنھوں نے صحابۂ کرام کو عظیم بنادیا اور یہی وہ دو اوصاف ہیں جو آج کے مسلمانوں میں ناپید ہیں اور مسلمان دنیا بھر میں ذلیل و رسوا ہیں۔

ٹریفک

کہا جاتا ہے کہ کسی معاشرے کی تہذیب و روایات اور اقدار و قانون کی حالت کا جائزہ لینا اگر مقصود ہو تو اس کا سب سے آسان طریقہ اس کے ٹریفک کے نظام کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس پہلو سے جب پاکستان کے شہروں پر رواں ٹریفک کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب، تنظیم، قانون کی پاسداری، حتیٰ کہ انسانی جان تک کی یہاں کوئی وقعت نہیں۔ ہمارا ٹریفک، ہماری پوری زندگی کی طرح قرآن مجید کی بیان کردہ اخلاقی تعلیم کے منافی چل رہا ہے۔

قرآن مجید کی اخلاقی تعلیم افراد اور اجتماعیت کے ہر شعبے کی اصلاح کا سب سے بہتر ذریعہ ہے۔ ٹریفک ہی کو اگر لے لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کریم کا ایک حکم ایسا ہے جو دیا تو پوری زندگی کے لیے گیا ہے، لیکن ٹریفک کی اصلاح کے لیے بھی اس سے اچھا اصول موجود نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”رحمٰن کے بندے وہ ہوتے ہیں جو زمین پر دھیمی چال چلتے ہیں اور جب جاہل ان کے منہ آتے ہیں تو وہ ان کو سلام کرکے رخصت ہوجاتے ہیں۔“ (فرقان 63:25)

ٹریفک کے سارے مسائل دو بنیادی وجوہات سے پیش آتے ہیں۔ ایک جلد بازی اور دوسروں سے آگے نکلنے کی سوچ اور دوسرا اپنی غلطی نہ مان کر دوسروں سے لڑنا اور بدکلامی۔ قرآن مجید کی یہ آیت بتاتی ہے کہ جو لوگ خدائے رحمٰن کی بندگی کا شرف حاصل کیے ہوتے ہیں ان کا اولین وصف یہ ہے کہ وہ راستوں میں اکڑتے نہیں، دوسروں کو پیچھے چھوڑنے کی کوشش میں جلد بازی نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی رفتار میں دھیما پن اور عاجزی نمایاں ہوتی ہے۔ دھیمے پن کی یہی وہ نفسیات ہے جو قانون کی پاسداری کی بنیادی شرط ہے اور اگر یہ ایک دفعہ پیدا ہوجائے تو سڑکوں پر سگنل توڑنے، تیز رفتاری اور خطرناک اُوورٹیکنگ وغیرہ جیسے جان لیوا کاموں سے انسان کو بچاتی ہے۔

اسی طرح لوگوں سے اگر کوئی چھوٹی موٹی غلطی ہوجائے تو اس آیت پر عمل کی صورت میں سڑکوں پر لڑائی جھگڑے کی نوبت نہ آئے گی۔ اول تو ہر شخص اپنی غلطی مان لے گا۔ اور اگر کوئی شخص جہالت کا مظاہرہ کرے گا بھی تو دوسرا شخص قرآن مجید کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اسے جواب دینے کے بجائے سلام کر کے رخصت ہوجائے گا۔

یہ رویہ عام ہونے کی صورت میں سڑکوں سے قانون شکنی، ایکسیڈنٹ میں موت اور معذوری اور لڑائی جھگڑے، بدکلامی اور ظلم وزیادتی جیسی تمام برائیاں ختم ہوجائیں گی۔ لوگ اپنی منزل پر ہوسکتا ہے کہ پانچ منٹ تاخیر سے پہنچیں لیکن خود کو اور دوسروں کو قبرستان، ہسپتال اور تھانے نہیں پہنچائیں گے۔ قانون کی خلاف ورزی ختم ہوجائے گی نتیجتاً رشوت کی گرم بازاری بھی ختم ہوجائے گی۔ لوگ راستے کو سکون واطمینان سے طے کریں گے اور عافیت کے ساتھ گھر پہنچیں گے۔

قرآن مجید کی تعلیم زندگی کے ہر مسئلے کا حل ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اسے سمجھ کر پڑھا جائے اور پورے شعور کے ساتھ اس پر عمل کیا جائے۔

☆☆☆☆☆☆☆

کسی معمولی نظر آنے والے انسان کی عزت کرنا
آپ کی شرافت کا ثبوت ہے
کسی معمولی نظر آنے والے انسان کو ذلیل کرنا
آپ کے پست ہونے کا ثبوت ہے
(ابو یحییٰ)

پیغمبر کی تعلیم اور شیطان کا طریقہ

اخبار کا خلاصہ یہ چند خبریں تھیں۔ ایک بوڑھی خاتون نے تھانے کی دیواروں سے سر ٹکراتے ہوئے جان دے دی۔ اس کے بیٹے کو پولیس نے جھوٹے کیس میں پھنسا کر بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ بیس سالہ بس ہوسٹس لڑکی جو اپنے گھر کی کفالت کے لیے نکلی تھی، اسے دو حیوانوں نے اسلحے کے زور پر اغوا کیا اور وحشیانہ تشدد اور اپنی شیطانی ہوس کا نشانہ بنایا۔ دہشت گردوں کا ایک معروف سیاست دان پر قاتلانہ حملہ۔ تین لوگ مارے گئے۔ یہ خبریں دیگ کے چند چاولوں کی طرح جرائم، دہشت گردی، حادثات، کرپشن، لاقانونیت اور وحشت کے اس پورے دور کا بیان ہیں جس میں ہم زندہ ہیں۔ میں نے پریشان ہو کر اخبار ایک کونے میں رکھ دیا۔

اسی لمحے میرے بیٹے کی معصوم غوغاں بلند ہوئی۔ مجھے احساس ہوا کہ سویرے اخبار پڑھنے کی جستجو میں اپنا روزانہ کا فریضہ بھول گیا ہوں۔ میں نے اپنے بیٹے کو رسول اللہ کی وہ ساری دعائیں سنانا شروع کیں جو آپ صبح سویرے اٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح عربی دعائیں سن کر خوش ہونے لگا، گو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ جب اپنی ماں کے پیٹ میں چار مہینے کا ہوا اور ایک حدیث نبوی (مسلم، رقم 2643) کے مطابق اس میں روح پھونکی گئی، اسی وقت سے وہ روزانہ قرآن سنتا تھا۔ اسی لیے وہ ذکر وتلاوت سے بہت مانوس تھا۔

اس کی خوشی دیکھ کر اخبار سے پیدا ہونے والی میری جھنجھلاہٹ ختم ہوگئی۔ میں نے جانا کہ رسول کریم کے الفاظ کتنے سچے ہیں جس میں وہ رب کریم کی تمام نعمتوں پر دل وجان سے اس کا شکر ادا کر کے اس کی حمد کرتے ہیں۔ ان دعاؤں کے الفاظ ہمیں احساس دلاتے ہیں کہ ہر انسان بدترین حالات کے باوجود بھی دراصل اللہ تعالیٰ کی بہترین نعمتوں میں زندہ ہوتا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ سرکار دوعالم میرے سامنے موجود ہیں اور مجھے تنبیہ کر رہے ہیں کہ میں کیوں ان کی پیروی کا

طریقہ چھوڑ کر شیطان کی پیروی کر رہا ہوں۔ نبی کا طریقہ شکر گزاری ہے۔شیطان کا طریقہ مایوسی ہے۔نبی کا طریقہ انسان میں مثبت سوچ پیدا کرتا ہے۔شیطان کا طریقہ انسان میں منفی ذہن پیدا کرتا ہے۔

مجھے احساس ہوا کہ جب کبھی ہم زندگی کو غلط رخ سے دیکھتے ہیں، ہم میں منفی سوچ پیدا ہوتی ہے۔ہم صرف مسائل کو دیکھتے ہیں اور مواقع کو نہیں۔ہم مصیبت کو دیکھتے ہیں نعمت کو نہیں۔ ہم صرف وہاں دیکھتے ہیں جہاں ہم کچھ نہیں کر سکتے، وہاں نہیں دیکھتے جہاں ہم دنیا بدل سکتے ہیں۔ جبکہ ہم میں سے ہر شخص کو اللہ نے نہ صرف ان گنت نعمتیں دی ہیں بلکہ ایسے مواقع بھی دیے ہیں جہاں ہم زندگیاں بنا سکتے ہیں، خوشیاں بکھیر سکتے ہیں، آسانیاں پھیلا سکتے ہیں۔

ہم اپنی اولاد اور متعلقین کی اچھی تربیت کر سکتے ہیں۔ہم کسی ضرورت مند کی کوئی ضرورت پوری کر کے قیمتی دعائیں سمیٹ سکتے ہیں۔ ہر کسی کو اچھے کام کی نصیحت اور برائی پر توجہ دلا کر پیغمبروں کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ہم کسی دکھی کے آنسو پونچھ سکتے اور محتاج کی حاجت روائی کر سکتے ہیں۔ کچھ اور نہیں تو کم از کم راستے سے پتھر ہٹا سکتے ہیں، کسی مسلمان کو سلام کر سکتے ہیں اور کسی انسان سے مسکرا کر مل سکتے ہیں۔

ہم یہ سب کر سکتے ہیں، مگر منفی سوچ کی وجہ سے نہیں کرتے اور صرف جھنجھلاہٹ اور مایوسی میں مبتلا رہتے ہیں۔اس کا نتیجہ نہ صرف یہ نکلتا ہے کہ ہم اعلیٰ ترین نیکیاں کرنے سے محروم رہتے ہیں بلکہ اس منفی سوچ کے زیر اثر ہم خود بھی بدعملی اور بدکلامی کا شکار ہو جاتے ہیں۔مگر اب وقت آ گیا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص یہ سمجھ لے کہ مایوسی ابلیس کا طریقہ ہے اور امید اور شکر گزاری خدا کے جلیل القدر پیغمبروں اور پیارے بندوں کا۔ ہمیں شیطان کو چھوڑ کر اللہ کے نبیوں اور پیاروں کا طریقہ چننا ہوگا۔اسی میں ہماری دنیا اور آخرت، ہمارے خاندان اور قوم سب کی نجات ہے۔

خواتین کی ناپاکی اور جنت

خواتین کے حوالے سے عبادات میں یہ قانون ہے کہ اپنی ماہواری کے ایام میں وہ روزے رکھیں گی اور نہ نماز ادا کریں گی۔ کچھ خواتین اس حوالے یہ سوال کرتی ہیں کہ یہ قانون کیوں بنایا گیا ہے۔ بلکہ ایک دفعہ مجھ سے پوچھے گئے ایک سوال میں ایک خاتون اسکالر کا یہ فتوی بھی نقل کیا گیا کہ خواتین کو ماہواری کے دنوں میں نماز روزے کا اہتمام کرتے رہنا چاہیے کیونکہ قرآن کریم میں ایسی کوئی پابندی بیان نہیں ہوئی۔

تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ بہت سے دیگر احکام کی طرح عبادات کا ماخذ بھی قرآن مجید نہیں بلکہ سنت ہے۔قرآن کریم میں عبادات کا ذکر تاکید، یاددہانی، اہمیت اور بیان حکمت کے پہلوؤں سے ہوا ہے۔ یہ عبادات قرآن مجید سے پہلے بھی انبیا کی ایک مستقل روایت کے طور پر جاری تھیں اور آخری دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں ضروری ترامیم اور اصلاحات کر کے انھیں قیامت تک کے لیے جاری کر دیا۔اسی سنت پر مبنی یہ قانون ہے کہ خواتین ماہواری کے دنوں میں نماز روزہ نہیں ادا کرسکتیں۔

اس کی حکمت قرآن مجید نے اس طرح بیان کی ہے کہ یہ ناپاکی کی ایک حالت ہے، (بقرہ 222:2)۔ظاہر ہے کہ ناپاکی کی حالت میں اللہ تعالیٰ سے عبادت کا تعلق قائم کرنا عبادت کی روح کے خلاف ہے۔انھی آیات میں قرآن مجید یہ بھی واضح کرتا ہے کہ اس حالت میں میاں بیوی کا تعلق بھی قائم نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ مسلمان اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے اور ہمیشہ سے یہ امت کا عمل رہا ہے کہ ماہواری کے ایام میں خواتین نہ نماز روزہ ادا کریں گی نہ ان سے میاں بیوی کا تعلق قائم ہوگا۔

قرآن مجید کے بیانات سے ایک دوسری بات بھی معلوم ہوتی ہے۔وہ یہ کہ خدا کی جنت میں دو نعمتیں سب سے زیادہ نمایاں ہوں گی۔ایک میاں بیوی کے پاکیزہ جوڑے اور دوسرے خدا کی

رضامندی کا پروانہ، (آل عمران 15:3)۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماہواری کے ایام میں، جب خواتین ناپاک ہوتی ہیں، اپنی رضا اور قربت دینے والی دو انتہائی اہم عبادات اور میاں بیوی کے تعلق پر پابندی لگا کر دراصل اپنے بندوں اور بندیوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ قیامت کے دن جو شخص ناپاک ہو کر اس کے حضور پیش ہوگا، اسے جنت میں ملنے والی میاں بیوی کے پاکیزہ تعلق اور اللہ تعالیٰ کی قربت جیسی عظیم نعمتوں سے محروم کر دیا جائے گا۔ یہ دو نعمتیں محض دو نعمتیں ہی نہیں بلکہ تمام مادی اور روحانی نعمتوں کی نمائندہ علامات ہیں۔

خدا کے نزدیک ناپاکی کیا ہے؟ یہ محض جسم سے نکلنے والے فضلات ہی نہیں بلکہ علم و اخلاق سے متعلق وہ تمام اعمال اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپاک ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر مبنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، غیر اللہ سے دعا اور مدد مانگنا، انسانوں کے ساتھ ظلم و ناانصافی، خیانت، بدعہدی، فواحش، منکرات، بخل، اسراف، ریاکاری، نمود و نمائش، الزام و بہتان، حسد و تکبر اور اس نوعیت کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان کو ناپاک کر دیتی ہیں۔

آج انسان جب ان اعمال میں سے کسی عمل کا مرتکب ہوتا ہے تو بظاہر اسے برا محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن ان میں سے ہر عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک غلیظ اور بدبودار عمل ہے۔ اس کا ارتکاب کرنے والا آہستہ آہستہ ناپاک ہوتا چلا جاتا ہے اور اگر اسی حالت میں انسان مر جائے تو ایسے بدبودار، گندے شخص کو خدا کی جنت میں داخل نہیں کیا جائے گا۔

خواتین کے ایام ماہواری میں نماز اور میاں بیوی کے تعلق سے روک کر اصل سبق یہ دیا گیا ہے کہ ناپاکی کا مطلب خدا اور اس کی نعمتوں سے محرومی ہے۔ دنیا میں یہ ناپاکی غیر اختیاری ہوتی ہے، مگر جان بوجھ کر ''ناپاک'' رہنے والوں پر قیامت کے دن یہ پابندی ہمیشہ کے لیے لگا دی جائے گی جبکہ اپنے ایمان اور اخلاق کو پاکیزہ رکھنے والوں کو ہر جسمانی اور روحانی گندگی سے نجات دے کر خدا کی قربت اور اُس کی نعمتوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آباد کر دیا جائے گا۔

تم میرے ساتھ ہوتے ہو گویا

غالب اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ ان کے اشعار کا صرف ایک دیوان شائع ہوا اور وہی انھیں لافانی بنا گیا۔ اُن کے بعد اَن گنت شعرا پیدا ہوئے، مگر جو مقبولیت اور تاثیر غالب کے حصے میں آئی ہے، دوسروں کو اس کا بہت کم حصہ نصیب ہوا ہے۔ تاہم یہی غالب ہیں جنھوں نے اپنے ایک ہم عصر شاعر مومن سے کہا تھا کہ میں تمھارے ایک شعر کے عوض اپنا دیوان دے سکتا ہوں۔ مومن کا یہ شعر اس طرح ہے۔

تم میرے ساتھ ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن کا یہ شعر اپنے محبوب کے خیال میں جینے کا ایک سادہ مگر انتہائی خوبصورت بیان ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ خدا کو اپنی زندگی بنا لینے والے بندۂ مؤمن کا حالِ دل بھی ہے۔ یہ مؤمن اگر تنہائی میں خدا کی یاد میں جیتا ہے تو مجلس میں بھی اسے فراموش نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ تین لوگ سرگوشی نہیں کرتے مگر چوتھا ان کے ساتھ خدا ہوتا ہے، پانچ نہیں کرتے مگر چھٹا ان کے ساتھ خدا ہوتا ہے، چاہے یہ لوگ کہیں بھی ہوں۔ یہی معاملہ اس سے کم اور زیادہ لوگوں کا ہے، (مجادلہ 7:58)۔

ایمان درحقیقت اسی کیفیت اور احساس میں جینے کا نام ہے کہ ہم جہاں کہیں اور جس حال میں ہیں، خدا ہر جگہ اور ہر لمحہ ہمارے ساتھ ہے؛ ہم کہتے ہیں، وہ سنتا ہے، ہم کرتے ہیں، وہ دیکھتا ہے، ہم سوچتے ہیں، وہ سمجھ لیتا ہے۔ یہی یقین انسان کو خدا کی یاد میں جینے پر آمادہ کرتا اور خلوت و جلوت میں اس کی اطاعت پر مجبور کرتا ہے۔ ایسا مؤمن خدا کو اپنی زندگی کے چند لمحے نہیں دیتا، وہ خدا کو اپنی زندگی بنا لیتا ہے۔ وہ خدا کی یاد کو کچھ وقت نہیں دیتا، اس کی یاد کو اپنی زندگی بنا لیتا ہے۔

حقیقی ایمان کلمہ کے الفاظ زبان سے ادا کر دینے کا نام نہیں۔ یہ ہر لمحہ خدا کی حضوری میں جینے کا نام ہے۔ اور ایسے ہی خدا کی یاد میں جینے والے مؤمنین ہیں جنھیں عنقریب خدا کی جنت میں اور اس کے پڑوس میں بسا دیا جائے گا۔

نئے اور پرانے گدھے

انسانوں نے جب متمدن زندگی کا آغاز کیا تو جنگل کے جن باسیوں نے انسانوں کا بھرپور ساتھ دیا ان میں گدھے کا نام بہت نمایاں ہے۔ انسانی فطرت پر یہ راز اول دن سے آشکارا تھا کہ یہ معصوم اور بے ضرر جانور بار برداری کے لیے بہترین ذریعہ ہے۔ چنانچہ تہذیب کی تعمیر اور تمدن کی ترقی میں گدھے کی سامان ڈھونے کی صلاحیت انسان کی بہترین معاون ثابت ہوئی اور مشینوں کے پھیلاؤ سے پہلے تک انسان اور ان کے سامان کو ڈھوکر گدھا تمدن کی تعمیر اور اس کے بقا واستحکام کا ایک اہم ترین حصہ رہا ہے۔ تاہم بار برداری کے غیر معمولی وصف کے باوجود گدھا انسانوں کے ہاں ’گدھا‘ ہی سمجھا جاتا ہے اور بے جا ہٹ دھرمی اور بے وقوفی کے استعارے کے طور پر اس کا نام استعمال ہوتا ہے۔

بے وقوفی کی تعبیر کے لیے گدھے کے استعارے کا پس منظر تو معلوم نہیں، لیکن قیاس یہ ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ گدھا انسانوں کے انتہائی قرب کے باوجود بعض دیگر جانوروں کی طرح تربیت یافتہ نہ ہوسکا۔ وہ ہزاروں برس تک انسانوں کے ساتھ رہ کر بس ایک ڈھونے والا رہا، سمجھنے والا نہ بن سکا۔ وہ کبھی نہ جان سکا کہ کیسی قیمتی اور اہم اشیا ہیں، جنھیں وہ ڈھوتا ہے۔ قرآن مجید (جمعہ 5:62) کے مطابق گدھے کی یہی مثال ان لوگوں کی ہے جو کتابِ الٰہی جیسی عظیم نعمت کے حامل ہوں، مگر وہ اس نعمت کو پا کر معرفت، تقویٰ اور حکمت پیدا کرنے کے بجائے فخر اور کفر اور غفلت میں مبتلا ہو جائیں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ گروہ گدھے جیسا ہے جو کتاب اللہ کو پائے اور اس کی ذمہ داریوں کو نہ اٹھائے۔ وہ اسے سمجھے نہ اسے سیکھے، وہ اس کا علم ہو نہ اس کا عمل، وہ اس کی سیرت ہو نہ اس کا اخلاق۔ یہ گدھے حق کو جھٹلاتے ہیں، مگر خود کو حق کا سب سے بڑا نمائندہ کہتے ہیں۔ یہ گدھے حاملِ کتاب ہونے پر فخر کرتے ہیں، مگر اس کا پیغام دوسروں تک نہیں پہنچاتے۔

پہلے یہ گدھے تورات ڈھوتے تھے اور آج کل قرآن ڈھوتے ہیں۔ مگر خدا کے نزدیک اس رویے کے مرتکبین کچھ بھی ڈھوئیں، وہ گدھے کے گدھے ہی رہتے ہیں۔

جماعت اور نیکی کا فروغ

مختلف احادیث میں یہ بات آئی ہے کہ جماعت کی نماز فرد کی نماز سے کئی گنا افضل ہے۔ عام طور پر اس فضیلت کو مسجد کی نماز سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ مسجد میں پنج وقتہ نماز باجماعت ہوتی ہے اور مسجد کی طرف بڑھنے والے ہر قدم پر ایک الگ نیکی کا ثواب ہے۔ اس لیے مسجد میں نماز پڑھنے کو ہی ترجیح حاصل ہے، مگر ہر وقت نہ مسجد جانے کا موقع ہوتا ہے اور نہ بعض حالات میں یہ ممکن ہوتا ہے۔ اسی لیے بہت سے لوگ گھر ہو یا دفتر وہیں جماعت کا اہتمام کر لیتے ہیں۔ اس جماعت کو بھی انفرادی نماز پر ویسی ہی فضیلت حاصل ہے۔

جماعت کی یہ فضیلت اپنے اندر بڑی حکمت رکھتی ہے۔ نماز ایک لازمی دینی فریضہ ہے جس کو ترک کرنے پر سخت ترین وعیدیں ہیں۔ جماعت کی نماز کی فضیلت اہل ایمان میں تحریک پیدا کرتی ہے کہ وہ نماز کے وقت تنہا نماز نہ پڑھیں، بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی نماز میں شریک کر کے ایک جماعت بنانے کی کوشش کریں۔ وہ کسی بے نمازی کو دیکھیں تو اسے بھی نماز ادا کرنے کی دعوت دیں۔ اسی طرح گھروں اور دفاتر میں موجود بے نمازی جو شاید تنہا نماز پڑھنے میں سستی محسوس کرتے، جماعت کو دیکھ کر اپنے اندر نماز پڑھنے کا ایک اضافی داعیہ محسوس کرتے ہیں۔ اکثر یہ مشاہدہ ہے کہ جماعت کی اس برکت سے لوگ دوسروں کی دیکھا دیکھی یا ان کی دعوت پر نماز ادا کر لیتے ہیں اور یہی چیز بتدریج ان میں نماز کی پابندی کرنے کی عادت کا سبب بن جاتی ہے۔

یوں جماعت کا تصور اور اس کی فضیلت دراصل مسلمانوں کے معاشرے میں نماز کو ایک تحریک اور تہذیب کی طرح عام کر دیتی ہے۔ یہ فضیلت نیکی کے فروغ اور خدا پرستی کے پھیلاؤ کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس لیے ہر نمازی کو جماعت سے نماز پڑھنے کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے اور مجبوری کے سوا کبھی تنہا نماز نہیں ادا کرنی چاہیے۔

آسودہ حال طبقات اور اسراف

"مجھے پانچ کلو گوشت دے دو"، "میرے لیے دو کلو چکن ڈرم اسٹک صاف کر کے بنا دو"، "مجھے دو کلو جھینگے اور تین کلو مچھلی تول دو"۔ پاکستان کے کسی بھی آسودہ حال علاقے کے بازار میں بولے اور سنے جانے والے یہ روزمرہ جملے ہیں جہاں نئے ماڈل کی گاڑیوں سے اتر کر شاپنگ کے لیے آتے ہوئے مرد و خواتین دوکاندار سے قیمت پوچھے اور بھاؤ تاؤ کیے بغیر بے دریغ اشیائے خورونوش خریدتے ہیں۔ بڑی بڑی سپر مارکیٹوں میں ٹرالی بھر کر ہزاروں روپے کا سودا خریدنے، شاپنگ سنٹرز سے ہر ماہ نئے کپڑے اور جوتے، ہر تقریب کے لیے نئے زیور بنوانے اور ہر برس فرنیچر اور گاڑی بدلنے والے بھی یہی آسودہ حال لوگ ہیں جن کی راہ میں مہنگائی کوئی رکاوٹ ڈالتی ہے اور نہ انھیں تنگی ہی کا کوئی اندیشہ ہوتا ہے۔

ان لوگوں میں حرام کھانے والے وہ لوگ ہی نہیں ہوتے جنھیں جہنم کی آگ میں جلنے سے قبل اپنی کمائی ہوئی غلاظت کو کہیں نہ کہیں خارج کرنا ہوتا ہے، بلکہ وہ ایماندار تاجر، کارپوریٹ ملازمین اور دیگر پروفیشنلز بھی ہوتے ہیں جن کے ذرائعِ آمدن پر کوئی انگلی اٹھانا ممکن نہیں ہوتا۔ خدا نے آزمائش کے اصول کے تحت ان کو مال و دولت سے نوازا ہوتا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ یہ لوگ اس مال سے جنت کی ختم نہ ہونے والی نعمتیں خریدتے ہیں یا وہ فانی لذتیں اور عارضی سہولیات جنھیں چھوڑ کر، چند برس کے اندر اندر انھیں، پروردگار کے حضور حساب کتاب کے لیے پیش ہونا ہوگا...... یہ وہ دن ہوگا جب سوال صرف مال کمانے سے متعلق ہی نہیں ہوگا بلکہ یہ بھی پوچھا جائے گا کہ اسے کیسے خرچ کیا؟

یہ سوال اتنا اہم ہے کہ قرآن مجید نے مال خرچ کرنے کو بڑی تفصیل سے اپنا موضوع بنایا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ انسان کے مال کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے اور اسی نے یہ مال انسان کو عطا کیا ہے۔ اس کا حکم یہ نہیں ہے کہ لوگ اس مال کو اپنی ضرویات یا زندگی کی خوبصورتی حاصل کرنے پر

خرچ نہ کریں۔ بس اس کی منشا یہ ہے کہ لوگ مال خرچ کرتے اسراف اور فضول خرچی سے بچیں۔ کیونکہ فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہوا کرتے ہیں۔

اسراف اور فضول خرچی کرنے والوں کے لیے شیطان کے بھائی کی تعبیر بڑی معنی خیز ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ انسانوں کے درمیان بھی بغض اور عداوت پیدا ہو جائے۔ جب لوگ بیجا مال خرچ کرتے ہیں تو اس کے نتیجے میں ان کے پاس کبھی اتنے پیسے بچتے ہی نہیں کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر سکیں جو ایک بنیادی دینی مطالبہ ہے۔ اللہ کے دین اور اس کے بندوں کی ضروریات کو نظر انداز کر کے اپنا مال ذاتی خواہشات کی تسکین کے لیے خرچ کرنا جب معمول بن جائے تو اس کا نتیجہ طبقاتی کشمکش، حسد اور نفرت کی شکل میں نکلتا ہے۔ غربا امیروں سے نفرت کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان کے درمیان سے مجرم اور ڈاکو پیدا ہوتے ہیں جو لوگوں کی جان، مال اور آبرو کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ یوں بیجا خرچ کرنے والے لوگ معاشرے میں نفرت، دشمنی اور فساد پیدا کرنے کا سبب بن کر شیطان کے مقاصد پورا کرتے ہیں۔

اپنی ضرویات پوری کرنا ہر شخص کا حق ہے۔ مگر انسان کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ جنت میں وہ خدا کی ہمیشہ رہنے والی نعمتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ کامیابی صرف اس شخص کا مقدر ہے جو اس دنیا میں اپنی ضروریات کو بے روک ٹوک بڑھنے نہ دے بلکہ ان کی حد بندی کرے۔ اپنی غیر ضروری خواہشات پر قابو پائے۔ وہ بے شک اپنی دنیا کی تعمیر پر خرچ کرے۔ مگر اس کے ساتھ وہ دوسرے ضرورت مندوں پر خرچ کر کے آخرت میں بھی اپنا سرمایہ محفوظ کرے۔ یہ کام کوئی فضول خرچ آدمی نہیں کر سکتا کیونکہ ایسے شخص کے پاس کبھی پیسے نہیں بچتے۔ فضول خرچ شخص اس دنیا میں شیطان کا بھائی ہوتا ہے۔ آنے والی دنیا میں وہ اپنے اسی بھائی کے ساتھ جہنم کی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔

گور پیا کوئی ہور

بابا بلھے شاہ (1757 - 1680) پنجابی زبان کے مشہور شاعر ہیں۔ وہ لوک شاعری کے کلاسیکل طرزِ کلام یعنی 'کافی' میں اشعار کہا کرتے تھے۔ بلھے شاہ کی کافیاں صدیوں سے عوام میں مقبول رہی ہیں۔ اس کا سبب ان کے کلام کی سادگی اور خوبصورتی ہی نہیں بلکہ اس میں پائے جانے والے حکیمانہ نکات اور انسانی نفسیات کی پیچیدہ گرہوں کا خوبصورت بیان بھی ہے۔ اس کا ایک خوبصورت نمونہ ان کی مشہور کافی 'میرا رانجھن ہن کوئی ہور' کا یہ لافانی مقطع (آخری شعر) ہے:

بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں گور پیا کوئی ہور

(بلھے شاہ ہمیں مرنا نہیں ہے، قبر میں کوئی اور پڑا ہے)

یہ حقیقت ہے کہ انسان کبھی اپنے آپ کو قبر میں پڑا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ کیوں کہ ایسا صرف انسان کی موت کے بعد ہوتا ہے جب انسان کچھ دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ انسان زندگی بھر دوسروں ہی کو قبر میں جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ آخر کار ایک روز وہ خود بھی قبر میں جا پہنچتا ہے۔ مگر انسان زندگی بھر اس طرح جیتا ہے جیسے کہ اسے مرنا ہی نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ قبر صرف دوسروں کے لیے بنی ہے، اسے کبھی قبر کے گڑھے کو نہیں بھرنا۔

انسان کی یہ سوچ دو طرح کے نتائج پیدا کرتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ غفلت کا شکار ہو کر ساری زندگی دنیا کی رونق اور اس کی فراخی کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے اور قبر کی وحشت اور تنگی کو بھول جاتا ہے۔ وہ اپنے وقت، دولت اور صلاحیت کا تمام تر استعمال صرف دنیا کے فوائد کے لیے کرتا ہے۔ وہ آخرت کے فائدوں اور نعمتوں کو بھولے رہتا ہے۔ یہاں تک کہ موت کا سفیر قبر کا بلاوا لیے اس کے دروازے پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ اس وقت انسان کو ہوش آتا ہے، مگر اب ہوش کا کیا فائدہ۔

اس سوچ کا دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان احتسابِ غیر کی نفسیات میں جیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ قبر صرف دوسروں کے لیے ہے۔ اس لیے احتساب بھی انھی کا ہونا چاہیے اور وہ خود ہر

احتساب سے پاک ہے۔ اس پر جب کرپشن کے الزام لگتے ہیں تو وہ چلا اٹھتا ہے کہ دوسروں کا احتساب کیوں نہیں ہو رہا؟ اس کی غلطی اور زیادتی جب اس پر واضح کی جاتی ہے تو وہ دوسروں کو اصلاح کا درس دینا شروع ہو جاتا ہے۔ جب اس کی کمزوری اس پر کھولی جاتی ہے تو وہ دوسروں کے عیوب گنوانے لگتا ہے۔

دنیا پرستی اور احتساب غیر دونوں عادتیں قبر کو بھولنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ ان میں سے احتساب غیر کی عادت کی اصلاح زیادہ مشکل کام ہے۔ اس لیے کہ یہ کرنے والا درحقیقت ایک سیاسی سوچ کو اصول کے لبادے میں چھپا دیتا ہے۔ ایسا آدمی بظاہر اصول پسندی اور قانون ضابطے کی بات کر رہا ہوتا ہے، مگر یہ محض اپنی بڑائی اور طاقت، اپنے مفادات اور بادشاہی کو قائم رکھنے کی ایک ناکام کوشش ہوتی ہے۔ یہ اصول کے نام پر سب سے بڑی بے اصولی ہوتی ہے جو اس وقت بالکل کھل کر سامنے آجاتی ہے جب کوئی طاقتور سامنے آ کھڑا ہو یا جب اپنے کسی عزیز اور پیارے کا کوئی مسئلہ سامنے آجائے۔ ایسے میں احتساب کی بات کرنے والوں کو قانون اور اصول سب بھول جاتے ہیں۔ اور انھیں طرح طرح کی حکمتیں اور مصلحتیں یاد آنے لگتی ہیں۔

افراد کی شخصیت کی کمزوریاں ڈھونڈنے والے خدائی فوجدار، سڑک پر لوگوں کو بلاوجہ روکنے والے سپاہی، دفتروں میں عام آدمی پر رشوت نہ دینے کے جرم میں جرمانہ کرنے والے کلرک، دفتروں میں تاخیر سے آنے والوں کی سرزنش کرنے والے افسر، بظاہر سب اصول کی بات کرتے ہیں۔ مگر اصول کی بات صرف اُسے زیب دیتی ہے جس کا پیمانہ سب لوگوں کے لیے یکساں ہو۔ جو دوسروں کا احتساب کرنے سے قبل اپنا احتساب کر چکا ہو۔ جو دوسروں کو سبق پڑھانے سے قبل اپنے سارے سبق یاد کر چکا ہو۔ جس کا پیمانہ یکساں نہیں، جس کو اپنا سبق یاد نہیں، اس کا احتسابِ غیر خدا کے حضور اس کا اپنا احتساب شدید تر کردے گا۔ کیونکہ قبر میں صرف دوسرے ہی نہیں جاتے۔ ایک روز آدمی خود بھی قبر میں جا پہنچتا ہے۔

بھوپال کی شہزادی کے اسباق زندگی

متحدہ ہندوستان پر جب انگریزوں کا قبضہ تھا، اُس وقت یہاں 563 شاہی ریاستیں موجود تھیں۔ ان میں سے ریاست بھوپال خوشحال اور اہم ترین ریاستوں میں سے ایک ریاست تھی۔ اس ریاست کے آخری حکمران نواب حمید اللہ خان کی صاحبزادی اور ریاست کی ولی عہد شہزادی عابدہ سلطان (1913-2002) کی خودنوشت سوانح حیات "Memories of a Rebel Princess" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

یہ کتاب ہر اعتبار سے ایک بہت دلچسپ اور سبق آموز کتاب ہے۔ شہزادی عابدہ سلطان ایک غیر معمولی شخصیت کی مالک تھیں۔ ان کی دادی سلطان جہاں بیگم جو بھوپال کی مسلسل چوتھی اور آخری خاتون حکمران تھیں، انھوں نے شہزادی کی تربیت بہت غیر معمولی انداز میں کی تھی۔ انگریز ہندوستان سے رخصت نہیں ہوتے اور شاہی ریاستیں پاکستان و ہندوستان میں ضم نہیں ہوتیں تو یقیناً شہزادی اپنے والد نواب حمید اللہ کے بعد پانچویں خاتون حکمران بن کر نمایاں ہوتیں۔

شہزادی پولو، کرکٹ اور اسکواش کی بہترین کھلاڑی، گھوڑے بازی کی ماہر اور بے مثل شکاری تھیں جنھوں نے اپنی زندگی میں 73 شیر مارے۔ 1941 میں انھوں نے اُس وقت جہاز اڑانے کی تربیت اور لائسنس لیا جب لوگ عام گاڑی چلانا بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ یہ اعزاز حاصل کرنے والی ہندوستان کی پہلی خاتون تھیں۔ آزادی کے وقت عابدہ سلطان بھوپال کی عیش وعشرت کی زندگی کو چھوڑ کر اپنے بیٹے شہریار محمد خان کے ہمراہ (جو بعد میں پاکستان کے سیکریٹری خارجہ بنے) پاکستان منتقل ہوگئیں۔

شہزادی کے حالات زندگی میں انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں سے بڑے اسباق پائے جاتے ہیں۔ ہم اختصار کے پیش نظر ان میں سے دو اسباق کو بیان کریں گے۔ ایک کا تعلق انفرادی

معاملات سے ہے اور دوسرے کا اجتماعی معاملات سے۔

شہزادی عابدہ کی داستان حیات کے ابتدائی اوراق اس صورتحال کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں جب مسلم اشرافیہ کا واسطہ انگریزی تہذیب سے پڑا اور وہ لوگ اس کے رنگ میں رنگتے چلے گئے۔ شہزادی کی تربیت چونکہ ان کی دادی نے اپنی نگرانی میں خود کی تھی اور ان کی مذہبی تعلیم کا اہتمام کیا تھا، اس لیے وہ تمام تر آزادی کے باوجود ایک مذہبی خاتون ہی رہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں ''اسلام کی عقیدت اور عزت مجھ میں بچپن سے ٹھونک ٹھونک کر رچا دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ میں اپنے آپ کو ایک ایسی مؤمن جانتی تھی جس کا ایمان قرآن کریم اور حدیث کے گہرے فہم پر قائم تھا۔''، (صفحہ 298)

نوجوانی کے ابتدائی دور میں جب وہ اپنے اہل خاندان کے ہمراہ یورپ گئیں تب بھی وہ تفریح اور کھیل میں تو آگے رہیں لیکن اپنے اہل خانہ کے برعکس رقص وسرور کی محفلوں اور اس نوعیت کی دیگر چیزوں میں انہوں نے زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ ان کے اپنے الفاظ میں ان کے خاندان کے دیگر افراد اور بہنوں کا معاملہ ایسا نہ رہا اور ان کے اپنے الفاظ میں ''مجھے کبھی بال روم رقص میں دلچسپی نہیں ہوئی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ مجھے کسی مرد کے بازوؤں میں گھرا رہنا قطعی پسند نہیں تھا۔'' (صفحہ 78)۔ تاہم ان کی بہنوں کا معاملہ مختلف تھا اور اب صورتحال یہ ہے کہ سیف علی خان اور سوہا علی خان جیسے انڈین اداکار انھی کی بہن کی اولاد میں سے ہیں۔

مغربی تہذیب سے جو چیلنج بیسویں صدی کے آغاز پر مسلم اشرافیہ کو درپیش تھا وہی آج مسلم عوام کو اکیسویں صدی کے آغاز پر انفارمیشن ایج میں درپیش ہے۔ آج بھی اس چیلنج میں وہی لوگ سرخرو ہوں گے جو اولاد کی تربیت کو اپنا مسئلہ بنالیں۔ وہ جدیدیت کے مخالف نہ ہوں، لیکن اپنی تہذیب، مذہب اور اقدار کی آبیاری اپنے بچوں کے دل و دماغ میں کرتے رہیں۔ یہی وہ لوگ

ہوں گے جن کی اولادیں ہر یلغار کے مقابلے میں سرخرو ہوں گی۔

شہزادی کی زندگی کا سب سے بڑا سبق غالبًا پاکستان کے حوالے سے ان کے تجربات ہیں۔ شہزادی بہت قربانیاں دے کر پاکستان آئی تھیں۔مگر یہاں آکر جو معاملات سامنے آئے وہ انتہائی حوصلہ شکن تھے۔ایک طرف متروکہ املاک کی تقسیم کے معاملے میں بدترین کرپشن کے معاملات سامنے آئے تو دوسری طرف مفاد پرست اور بے اصول سیاسی قیادت نے ان کے اپنے الفاظ میں ملک کو شرافت، اخلاقی اقدار اور اسلام کا قبرستان بنادیا، (صفحہ 297)۔رہی سہی کسر اس فکری قیادت نے پوری کردی جس نے لوگوں کی تعلیم و تربیت، ان کی اخلاقی اصلاح اور دین میں تحقیق کے بجائے حکمرانوں سے محاذ آرائی، دین کے بالجبر نفاذ اور فرقہ واریت کی راہ اختیار کرکے ملک کو تباہی کے راستے پر زیادہ دور تک دھکیل دیا۔اپنا سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آنے والی یہ شہزادی اپنی زندگی کی آخری دو دہائیوں یعنی 80 اور 90 کے عشروں میں جنھیں وہ زوال کے دو عشرے قرار دیتی ہیں، قومی انحطاط کا مشاہدہ کرتے ہوئے 11 مئی 2002 کو دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

آج ایک عشرہ مزید گزرنے کے بعد بھی پاکستان کی صورتحال کچھ بہتر نہیں ہے۔ہمارا اصل مسئلہ ہمارا اخلاقی زوال ہے جو ہر شعبۂ زندگی کے رگ و پے میں اتر گیا ہے۔ہمارے نزدیک اس مسئلے کا کوئی شارٹ ٹرم حل نہیں ہے۔یہ مسئلہ صرف اُس وقت حل ہوگا جب ہم میں سے ہر شخص اپنی ذمہ داری کو پہچانے۔ہم یہ حقیقت سمجھ لیں کہ دنیا و آخرت میں ہماری نجات اخلاقی بہتری پر موقوف ہے۔ہمارا ہر فرد اپنے دائرے میں ایک بہترین اخلاقی انسان بن جائے۔ہم اپنے تعصّبات اور مفادات سے بلند ہوکر سچی خدا پرستی اور انسان دوستی کو اپنا مسئلہ بنالیں۔یہی وہ واحد راستہ ہے جس پر چل کر ہمارے حالات جلد یا بدیر بہتری کی طرف گامزن ہوجائیں گے۔

عجیب دنیا

اس دنیا میں انسانوں میں ان گنت فرق پائے جاتے ہیں، مگر سب سے بڑا فرق مؤمن اور غافل کا فرق ہے۔غافل ایک عجیب دنیا میں رہ کر خدا سے بے خبر جیتا ہے اور مؤمن خدا کی ہر قدرت پر متعجب ہوکر اس کی یاد میں جیتا ہے۔

انسان اگر شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد اس دھرتی پر لاکر آباد کیا جاتا تو اس دنیا کو دیکھ کر انسانوں کی آنکھیں پھٹ جاتیں۔مگر انسان شعور کی عمر کو پہنچنے سے بہت قبل اس دنیا میں آتا ہے اور جب تک اس کا شعور چیزوں کا تجزیہ کرنے اور ان میں حیرت کا مادہ دریافت کرنے کے قابل ہوتا ہے، وہ اس دھرتی کی ہر عجیب بات کو ایک معمول کی بات سمجھ کر قبول کرچکا ہوتا ہے اور اسی لیے انسانوں کو یہ دنیا...... یہ بے حد عجیب دنیا، عجیب نہیں لگتی۔

اس دنیا میں انسان اپنے بازوؤں کے سہارے ہوا میں اڑنے لگیں تو ہر شخص پلٹ کر دیکھے گا، مگر پرندے فضائے بسیط میں اپنے پَر کھولے اور سمیٹے اڑتے پھرتے ہیں، مگر کسی کو عجیب نہیں لگتا۔اس دنیا میں کسی روز کوئی خلائی مخلوق زمین پر اتر آئے تو وہ دنیا بھر کی خبروں کا موضوع بن جائے گی۔مگر ہر روز لاکھوں کروڑوں بچے عجیب طریقے سے عدم سے وجود میں آتے ہیں، مگر یہ کسی کو عجیب نہیں لگتا۔اس دنیا میں اگر کسی درخت پر گھروں کا فرنیچر بنا بنایا لٹکنے لگے تو حیرتوں کے انبار لگ جائیں گے، مگر انہی درختوں پر رنگ برنگے پتے اور خوش رنگ اور خوشبودار پھول اور مزیدار پھل اگتے ہیں، مگر اسے دیکھ کر کسی کو حیرت نہیں ہوتی۔ستاروں کی جھلملاہٹ، ہوا کی سرسراہٹ، پرندوں کی چہچہاہٹ کسی کو حیرت میں نہیں ڈالتی۔

یہ سارے لوگ جنہیں خدا کی صناعی پر حیرت نہیں ہوتی، وہ غفلت میں جیتے ہیں۔وہ حقیقی ایمان کا ذائقہ نہیں چکھ سکتے۔حقیقی ایمان کا ذائقہ صرف وہ شخص چکھتا ہے جو خدا کی عجیب دنیا میں ہر لمحہ اس کی قدرت کا نظارہ کرے اور اسے اپنے ایمان میں اضافے کا سبب بنالے۔

خوشگوار ازدواجی زندگی

قرآن مجید میں ایک اصولی ہدایت دی گئی ہے جو خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز ہے۔ ہدایت یہ ہے کہ تم لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ پھر اگر تم انھیں ناپسند کرو تو ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت بہتری رکھ دے، (نساء 19:4)۔

یہ آیت زندگی کے دو بنیادی حقائق کا بہت نفیس بیان ہے جنھیں انسان اپنی سطحی طبیعت کی بنا پر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کی بنائی ہوئی موجودہ دنیا میں انسان آئیڈیل کی خواہش تو کرسکتا ہے، مگر وہ اسے مل نہیں سکتا۔ انسان اپنے ذہن میں جو مطلوب نقشہ بناتا ہے، اکثر اس دنیا میں حقیقت اس سے مختلف ہوتی ہے۔ انسان جب اس حقیقت کو قبول نہیں کرتا تو اسے یہ حقیقت ناپسند ہوجاتی ہے۔ لیکن انسان کی ناپسندیدگی سے یہ حقیقت بدل نہیں سکتی۔ نتیجتاً معاملہ خراب ہوگا، ناپسندیدگی نفرت تک جائے گی اور بات خاندان کی تباہی پر ختم ہوگی۔

اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے قرآن مجید ایک دوسری حقیقت لوگوں کے سامنے رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان اگر حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرے اور آئیڈیل کی تلاش کے بجائے حقیقت کی زمین پر کھڑے ہوکر اپنے زاویۂ نظر کو بدل لے تو کچھ ہی عرصے میں اسے معلوم ہوگا کہ جو چیز ابتدا میں اسے بری لگ رہی تھی، دراصل اس میں بہت خیر موجود تھا۔ بیوی اگر خوبصورت نہ ہو اور انسان اس بات کو جھیل جائے تو اسے معلوم ہوگا کہ بیوی اپنی شکل کی تلافی اپنی سیرت سے کرنے کی کوشش کرے گی اور اس کی زندگی جنت بنادے گی۔ بیوی دولتمند نہ ہو اور انسان اس بات کو نظر انداز کردے تو یہی بیوی اپنے حسنِ خلق اور خدمت سے اپنی جگہ بنالے گی۔

کامیاب ازدواجی زندگی کا راز خدا کی اسکیم کو سمجھ کر صبر کرنا ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں زندگی کے زیادہ خوبصورت رنگ گھر کے گلشن کو مہکا دیں گے، ورنہ زندگی بھر انسان کانٹے بکھیرتا اور دکھ سمیٹتا رہے گا۔

سب سے بڑی سچائی

قرآن مجید میں کئی مقامات پر دنیا کی زندگی کو ایک دھوکہ قرار دیا گیا ہے۔ بظاہر قرآن مجید کا یہ بیان ایک مبالغہ لگتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے اس تحریر کے الفاظ سے نظر ہٹا کر اپنی ذات اور اپنے ماحول کا جائزہ لیجیے۔ آپ کو کہیں کوئی دھوکہ نظر نہیں آئے گا۔ آپ کا جسم، در و دیوار اور آپ کے اردگرد کی ہر چیز ایک ناقابل تردید سچائی کی طرح آپ کے سامنے موجود ہے۔ آپ کو یقین آجائے گا کہ یہ کوئی دھوکہ نہیں، ایک حقیقت ہے۔ سچی اور ناقابل تردید حقیقت۔

تاہم سچائی یہ ہے کہ دنیا کی یہ ناقابل تردید حقیقت اللہ تعالیٰ نے اس طرح ڈیزائن کی ہے کہ تمام تر اصلیت کے باوجود یہ حقیقت ایک مکمل فریب ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں۔ آپ اس وقت دن یا رات کے جس پہر میں بھی ہیں، ذرا اس کی صبح کا تصور کیجیے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہ صبح اور جو کچھ آپ نے اس صبح میں کیا، اب صرف ایک احساس کی شکل میں آپ کے ذہن میں ہے۔ اس کے علاوہ یہ صبح کہیں اور موجود نہیں۔ اگلے دو چار دن میں آپ کے دل و دماغ سے یہ احساس بھی مٹ جائے گا۔ ہمیں اس مٹ جانے کا احساس اس لیے نہیں ہوتا کہ ہر لمحہ اور ہر پہر میں ہم موجودہ لمحے اور پہر کی سچائی یاد رکھتے ہیں، ماضی کے بارے میں بالکل نہیں سوچتے۔ اور اگر سوچتے ہیں تو اس پہلو سے نہیں۔

لیکن ہماری زندگی کی ہر صبح، ہر پہر اور ہر لمحے کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ایک فریب کامل ہے۔ ہماری ہر سچائی صرف اسی لمحے کی سچائی ہوتی ہے۔ اگلے لمحے یہ سچائی ختم ہوجاتی ہے۔ ذرا ایک لمحے رک کر غور کیجیے۔ تھوڑی دیر قبل جس وقت آپ نے اس تحریر سے نظر اٹھا کر اپنے اردگرد دیکھا تھا، وہ وقت اور وہ لمحات بھی اب تحلیل ہوچکے ہیں۔

یہ تو ماضی کا معاملہ ہے کہ ہر موجودہ لمحہ اگلے سیکنڈ فنا کی آغوش میں جا گرتا اور کچھ عرصے بعد

فراموشی کی موت مرجاتا ہے۔اس کے بعد تو بس ماہ وسال کی گنتی ہی باقی رہتی ہے جس میں آپ اپنی عمر کا حساب لگاتے رہتے ہیں۔رہا مستقبل تو وہ کس نے دیکھا ہے۔اور جب کبھی اس مستقبل کو دیکھا جائے گا تو بس ایک لمحہ میں ماضی کا عفریت اسے بھی نگل چکا ہوگا۔یہی دنیا کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے جسے غالب نے کیا خوب انداز میں بیان کیا ہے:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

زندگی لمحوں کا ایک ایسا تسلسل ہے جس میں زندگی......زندگی نہیں، بس ایک احساس زندگی ہے۔یہی قرآن کے ان الفاظ کا مطلب ہے کہ دنیا کی زندگی دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔اس کے ساتھ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ لمحوں کے اس تسلسل میں سفر کرتے ہوئے ہم ایک روز فنا کے گھاٹ اتر جائیں گے۔اس روز حقیقی زندگی شروع ہوگی۔اس روز لمحوں کا دریا وقت کے ابدی سمندر میں جا گرے گا۔وہ سمندر جس کا کوئی کنارہ اور کوئی اختتام نہیں۔اس روز اللہ تعالیٰ لوگوں سے دریافت کریں گے کہ تم دنیا میں کتنا رہے تو وہ کہیں گے کہ بس ایک صبح یا ایک شام۔

قرآن کا مقصد نزول ہمیں زندگی کی اس سب سے بڑی سچائی سے آگاہ کرنا ہے۔وہ بتاتا ہے کہ وقت کے اس بہاؤ میں ہم اگر کچھ کر سکتے ہیں تو وہ کسی عمل کی تخلیق ہے۔یہ عمل اگر دنیا اور متعلقاتِ دنیا یعنی بیوی، اولاد، مال، سواریوں، مکانوں اور کاروبار کے لیے کیا گیا تو وہ عمل بھی فنا کے گھاٹ اتر جائے گا۔کیونکہ جب دنیا دھوکہ ہے تو اس کے لیے کیا گیا عمل کیسے حقیقت بن سکتا ہے۔سچا اور باقی رہنے والا عمل اگر کوئی ہے تو وہ عمل صالح ہے۔بقائے دوام کا راز خدا کی بندگی میں ہے۔اطاعت میں ہے۔خدمت خلق میں ہے۔

دنیا دھوکہ ہے۔آخرت حقیقت ہے۔دنیا کے لیے کیا ہوا عمل فانی ہے۔آخرت کے لیے کیا گیا عمل ابدی ہے۔یہی سب سے بڑی حقیقت اور یہی سب سے بڑی سچائی ہے۔

راکھ کے بادلوں کا پیغام

بحر اوقیانوس (اٹلانٹک) میں واقع آئس لینڈ نامی ملک میں اپریل 2010 کے مہینے میں ایک آتش فشاں پھٹا۔اس کے نتیجے میں بننے والے راکھ کے بادلوں نے شمالی بحر اوقیانوس، اور مغربی اور وسطی یورپ کا احاطہ کرلیا۔مجبوراً برطانیہ، شمالی اور وسطی یورپ کے ممالک نے اپنی فضائی حدود اور ہوائی اڈے بند کردیے۔جس کے بعد نہ صرف یورپ بلکہ اس کی فضائی حدود کو استعمال کر کے منزل پر پہنچنے والے دنیا بھر کے مسافر اپنی جگہ پھنس کر رہ گئے۔طالب علم، مریض، کاروباری حضرات اور سیاح سب اپنی اپنی جگہ بے کسی اور بے بسی کی تصویر بنے بیٹھے رہ گئے۔سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔فضائی سفر جو انسانی ترقی کی معراج بن گیا ہے، انسانی عجز کی معراج بن کر سامنے آ گیا۔

عام انسان کے ساتھ ایسے واقعات زندگی میں بارہا پیش آتے ہیں، مگر اجتماعی اور عالمی طور پر ایسے واقعات کم پیش آتے ہیں۔آئس لینڈ کا یہ آتش فشاں راکھ کے بادلوں سے دنیا کو ایک پیغام دے رہا ہے......ایک ایسی دنیا جس کے باسیوں نے فضا میں پرندوں سے زیادہ تیز اڑنا تو سیکھ لیا لیکن زمین پر بندگی اور شکرگزاری کی چال چلنا نہ سیکھا...... پیغام یہ ہے کہ انسانیت اپنی معراج پر پہنچ کر بھی اپنے خالق و مالک کے رحم وکرم پر ہے۔وہ جب چاہے ان کی زندگی کا پہیہ معطل کر کے رکھ دے۔ان کے سارے ارادے باطل اور منصوبے غارت کردے۔وہ چاہے تو ان سے اڑنے کی صلاحیت چھین لے اور زمین پر زندہ رہنے کی سہولت واپس لے لے۔انسان خدا کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔خدا کے مقابلے میں انسان کے لیے واحد آپشن یہ ہے کہ وہ خدا کی شکرگزاری کو اپنی زندگی کا مقصد بنالے۔وہ زندگی کے ہر موقع اور دنیا کی ہر سہولت میں خدا کی عنایت کو دریافت کرے۔اس کی محبت اور بندگی سے سرشار ہوکر زندگی گزارے۔فرد کے لیے

بھی یہی راستہ درست ہے اور تمام انسانیت کے لیے بھی۔

اس عالمی واقعے میں ایک خاموش پیغام اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ انسانیت کی مہلتِ عمل ختم ہونے کو ہے۔ انسانیت نے صدیوں اس کرۂ ارض پر بلا شرکت غیر حکومت کی ہے۔ ہوا میں اڑنے، سمندر میں تیرنے اور زمین پر چلنے والی کروڑوں قسم کی مخلوقات پر فضیلت دے کر خدا نے انسانیت کو زمین کا اقتدار عطا کیا۔ مگر انسانیت بحیثیت مجموعی شکر گزار ثابت نہیں ہوئی۔ اس نے خدا کی دھرتی کو ظلم اور خونریزی سے بھر دیا۔ رحمت للعالمین جیسی ہستی کو پانے کے بعد بھی انسانیت خدا فراموشی اور ظلم کے حصار سے باہر نہیں نکلی۔ جھوٹ، مکر اور دجالیت کے فلسفوں نے خدا کے اپنے وجود پر سوالیہ نشانات پیدا کر دیے۔ زمین کی نعمتوں اور خزانوں پر چند افراد اور اقوام کا قبضہ ہو گیا۔ انسانوں نے دیگر مخلوقات کی آبادیوں اور ان کے رہنے کی جگہ کو برباد کر دیا۔ اس کے بعد انسان اب اس کرۂ زمین کے ماحول کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔

بس اب بہت ہو گیا۔ انسانیت کی مہلتِ عمل اب ختم کی جانے والی ہے۔ آئس لینڈ کے آتش فشاں سے اٹھنے والے راکھ کے بادلوں نے خاموش الفاظ میں خدا کی طرف سے یہ تنبیہہ کر دی ہے۔ جبکہ خدا کے کچھ بندے واضح الفاظ میں خدا کی طرف سے آخری عالمی وارننگ دے رہے ہیں۔ چند عشروں میں یہ وارننگ دنیا کے ہر ملک، ہر قوم اور ہر گھر میں پہنچ جائے گی۔ جس کے بعد انسانیت کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ ایک اشارہ ہو گا اور پوری زمین آتش فشاں بن کر پھٹ پڑے گی۔

آج کا انسان سب سے بڑھ کر خدا کی نعمتوں میں جی رہا ہے۔ مگر آج کا انسان ہی سب سے بڑھ کر خدا کو بھولا ہوا ہے۔ آئس لینڈ کے راکھ کے بادلوں کا پیغام یہ ہے کہ خدا کی دنیا میں خدا کو نظر انداز کر کے جینا ممکن نہیں۔ یہ آزمائش کی غرض سے عارضی طور پر گوارا تو کیا جا سکتا ہے۔ مگر زیادہ عرصے تک یہ صورتحال باقی نہیں رہ سکتی۔

بلاوہ اور پیغام

جسٹس مشیر عالم سپریم کورٹ کے جج ہیں۔ پچھلے دنوں ان کی عدالت میں ایک کیس کی سماعت کے دوران بڑا عبرتناک واقعہ پیش آیا جو ان کے دوست ڈاکٹر مظہر صاحب نے ہمیں سنایا۔ یہ کیس کسی سرکاری ملازم کا تھا جسے اس کی مدتِ ملازمت سے قبل ہی ریٹائر کر دیا گیا تھا۔ ان صاحب نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران میں جسٹس مشیر عالم نے مدعی سے سوال کیا کہ ان کی ریٹائرمنٹ میں کتنا عرصہ باقی ہے۔ مدعی نے جواب دیا کہ اس کی ریٹائرمنٹ میں ابھی دو برس باقی ہیں۔ یہ الفاظ مدعی نے ادا ہی کیے تھے کہ وہ زمین پر گرے اور ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

موت اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ مگر انسان اس موت کو نظر انداز کر کے جیتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں ہر چیز کا منصوبہ بناتا ہے سوائے موت کے بعد شروع ہونے والی زندگی کے۔ وہ زندگی میں ہر چیز کے لیے لڑتا ہے، سوائے موت کے بعد کی کامیابی کے لیے۔ شادی، بچے، تعلیم، گھر، ملازمت، کاروبار، ان میں سے ہر چیز زندگی بھر انسانی توجہ کا مرکز بنی رہتی ہے۔ انسان عین موت کے کنارے کھڑے ہو کر بھی زندگی کو دیکھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ موت کا فرشتہ خاموشی سے اس کے دروازے پر دستک دیتا اور جواب کا انتظار کیے بغیر مکانِ دل میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر مکین کی جان کو اس کی مرضی دریافت کیے بغیر اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ انسان سوچ بھی نہیں پاتا کہ نقدِ جاں ایک روز اچانک اتنی خاموشی سے مٹی میں مل جائے گی۔

اچانک آنے والی موت میں مرنے والے کے لیے بلاوہ ہوتا ہے، مگر اس میں زندوں کے لیے بھی ایک زندہ پیغام ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ تم بھی موت کی تیاری کر لو۔ یا اسے اچانک آئی ہے اور تمھیں مطلع کر کے آ رہی ہے۔ سو خدا سے ملنے کی تیاری کر لو۔ حیاتِ ابدی کے سامان کی تیاری کر لو۔

تعمیری اور تنقیدی ذہن

ہمارے ہاں افراد اور معاشرے کی خرابیوں پر تنقید کرنا ایک عام رویہ بن گیا ہے۔ لوگوں میں پیدا ہونے والا اخلاقی انحطاط، حکمرانوں اور سرکاری اہلکاروں کی کرپشن، تاجروں کی ملاوٹ اور ناجائز منافع خوری، عوام وخواص میں قانون کی خلاف ورزی اور ان جیسی متعدد چیزیں ہماری ہر گفتگو میں موضوعِ بحث اور باعثِ تنقید بنی رہتی ہیں۔ یہ تنقید اکثر حالات میں اصلاح کے کسی جذبے کے ساتھ نہیں کی جاتی۔ اس کا مقصد اپنی بھڑاس نکالنا یا پھر اپنی عملی خرابیوں اور کوتاہیوں کا جواز فراہم کرنا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ دوسروں پر تنقید کرتے ہیں اور ان کے برے رویے کی پیروی بھی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی تنقید کبھی کسی بہتری کا باعث نہیں بن سکتی۔

تنقید ہمیشہ وہ مؤثر ہوتی ہے جو اصلاحی اور تعمیری ذہن کے ساتھ کی جائے۔ ایسی تنقید کرنے والے لوگوں کی زندگی کا اصل مقصد اپنی اصلاح ہوتا ہے۔ وہ دوسروں پر تنقید کرنے سے پہلے اپنے ہر رویے کو بے رحمانہ احتساب سے گزارتے ہیں۔ وہ دوسروں کے عیوب پر نظر کرنے سے پہلے اپنی خرابیوں کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے سے قبل اپنے اور ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔

اس سوچ کے بعد انسان کے پاس یہ موقع ہی نہیں رہتا کہ وہ دوسروں کی خرابیاں ڈھونڈنے اور ان پر تنقید کرنے میں وقت ضائع کرے۔ اور اگر وہ یہ کرتا بھی ہے تو مکمل احساسِ ذمہ داری اور خیر خواہی کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ تنقید اس کے دل کا درد ہوتی ہے، اس کے دل کی بھڑاس نہیں ہوا کرتی۔ یہ اس کے اخلاص کا اظہار ہوتی ہے، اس کی بے عملی اور بدعملی کا نقاب نہیں ہوا کرتی۔ اس طرح کی تنقید معاشرے میں کبھی مایوسی نہیں پھیلاتی بلکہ اصلاح کا باعث ہوتی ہے۔

لہٰذا تنقید ضرور کیجیے، مگر اصلاح کے لیے نہ کہ معاشرے میں مایوسی پھیلانے کے لیے۔

بخل کا انجام

اپنی اور دوسروں کی جائز ضروریات کے لیے پیسے خرچ نہ کرنا، مال جمع کرتے اور گنتے رہنا بخل اور ایک بدترین اخلاقی رویہ ہے۔ یہ رویہ دنیا کی محبت سے پیدا ہوتا ہے اور تین قسم کے کرداروں میں ڈھل جاتا ہے جو ایک ساتھ یا الگ الگ پائے جاسکتے ہیں۔

پہلا کردار وہ ہے جو مال کو سینت سینت کر رکھتا ہے اور ہمیشہ اسے گننے میں مشغول رہتا ہے۔ ایسا شخص مال کو نہ اپنے اوپر خرچ کرتا ہے اور نہ اپنے لواحقین کی ضروریات پر۔ یہ مال کی محبت کی وہ بدترین قسم ہے جس میں انسان اپنے مال سے خود بھی فائدہ نہیں اٹھاتا، دوسروں کے فائدہ اٹھانے کا تو سوال ہی کیا۔ لیکن ایسے انسان کو قیامت کے دن اپنے مال کا حساب بھی دینا ہوگا اور اپنے بخل کا بھی۔

دوسرا کردار وہ ہے جو مال کو اپنے اوپر تو خرچ کرنے میں اسراف کی حدوں کو چھو لیتا ہے، مگر بندوں اور دین کی ضروریات کے مواقع پر اسے اپنی مالی تنگی، کاروباری پریشانی اور ذاتی مسائل یاد آجاتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت مال رکھنے کے باوجود اپنے دکھڑے اس طرح روتے ہیں کہ کوئی شخص راہِ خدا میں خرچ کرنے کی دعوت اگر انھیں دے رہا ہو تو خود شرمندہ ہوجاتا ہے۔

تیسرا کردار وہ ہوتا ہے جو نہ صرف دوسروں پر مال خرچ نہیں کرتا بلکہ کوئی اور یہ دعوت دے یا کوشش کرے تو اسے بھی آگے بڑھ کر روک دیتا ہے۔ اس شخص کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ اگر دوسرے خرچ کریں گے تو اسے بھی شرما حضوری میں کچھ نہ کچھ خرچ کرنا پڑ جائے گا۔ چنانچہ وہ انفاق کی بات سن کر پہلے قدم پر آگے بڑھتا ہے اور اس کام میں اتنے عیب نکالتا ہے کہ دوسرے بھی خرچ کرنے سے باز آجاتے ہیں۔ یوں وہ ہشیاری سے خود کو اس آزمائش سے بچا لیتا ہے۔

بخل کی ان تمام اقسام کے بارے میں قرآن کا فیصلہ بہت واضح طور پر یہ ہے کہ ان کا مال آگ میں دہکایا جائے گا اور اس سے ان کا جسم داغا جائے گا۔ پھر ان کا مال طوق بنا کر ان کے گلے میں ڈال دیا جائے گا جو آگ بن کر ہمیشہ انھیں ڈستا رہے گا۔ سو مبارک ہو بخل کرنے والوں کو ان کا یہ ابدی انجام۔

عظیم بادشاہی

ہم نے طالبعلمی کے زمانے میں ایک عربی مقولہ پڑھا تھا جس کا مفہوم ہے کہ صحت ایک ایسا تاج ہے جسے پہن کر انسان بادشاہ ہوجاتا ہے، لیکن یہ تاج صرف بیماروں کو نظر آتا ہے۔

بلاشبہ یہ ایک انتہائی حکیمانہ بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عظیم ترین نعمتوں سے نوازا ہے۔ ان میں سب سے بڑی نعمت ایک صحت مند جسم ہے۔ انسانی جسم قدرت کی صناعی کا ایک بے مثل شاہکار ہے۔ یہ جسم اپنے اندر عجیب و غریب سسٹم اور طاقتیں رکھتا ہے۔ یہ گویا کہ ایک عظیم مملکت ہے جو انسانوں کو بنی بنائی مل جاتی ہے اور اس کے سہارے زندگی بھر انسان دنیا پر راج کرتا ہے۔ مگر اس مملکت کا ایک سسٹم اور ایک قوت بھی انسان نے بنائی ہے اور نہ انسان اس پر قدرت رکھتا ہے کہ ضائع ہوجانے پر اسے دوبارہ بنالے۔

عام حالات میں انسانوں کو یہ بات یاد نہیں رہتی۔ اس لیے بیماری آتی ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ ان کا جسم اور صحت جس کے لیے وہ ساری دولت دے سکتے ہیں، سرتاسر ایک عطیہ الٰہی ہے۔ ان کی یہ بادشاہی، ربِّ دو جہاں کی عطا ہے۔ وہ جب چاہے اس بادشاہی کو چھین لے۔ انسان بیماری کے اس پیغام کو سمجھ نہیں پاتا۔ اس کی ساری توجہ ڈاکٹر اور دوا کی طرف رہتی ہے۔ وہ صحت مند ہوکر بھول جاتا ہے کہ بیماری میں کس بے کسی اور بے بسی کے حال کو وہ جا پہنچا تھا۔ وہ صحت مند ہوکر ربِّ کائنات کا شکر ادا نہیں کرتا۔ اس کی عظمت اور نعمت کے اعتراف میں زندگی نہیں گزارتا۔ وہ اُس دنیا کی تیاری نہیں کرتا جہاں اسباب کے سارے پردے اٹھادیے جائیں گے اور یہ حقیقت برہنہ ہوکر سامنے آجائے گی کہ ہر نعمت صرف اللہ کی عطا ہی سے ملتی ہے۔

ایسے غافل جب مرکر اگلی دنیا میں پہنچیں گے تو دیکھیں گے کہ خدا اپنے نیک بندوں کو ابدی طور پر بادشاہ بنارہا ہے۔ وہ صحت مند جسم کے ساتھ دنیا کی ہر نعمت ان کی بادشاہی میں شامل کررہا ہے، مگر غافلوں کو اس بادشاہی کے بجائے جہنم کی قید میں پھینک دیا جائے گا۔ ان کے حصے میں عظیم بادشاہی کے بجائے عظیم محرومی آئے گی۔

قیامت اور موت کا فرق

قرآنِ مجید روزِ قیامت اس دنیا پر آنے والی تباہی کی بڑی تفصیل بیان کرتا ہے۔ اسے اصطلاحاً انذارِ قیامت کہا جاتا ہے۔ تباہی کی یہ تصویر اتنی خوفناک ہے کہ اس کے سننے اور پڑھنے ہی سے بہت سے لوگوں پر ڈپریشن طاری ہوجاتا ہے۔ قرآنِ مجید کے ایک طالبعلم کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے اس کی اتنی تفصیل بیان کی ہے۔ پچھلی کتابوں کی طرح قرآنِ مجید میں اس بارے میں خاموشی اختیار کرلی جاتی یا پھر زیادہ سے زیادہ لوگوں کی توجہ موت کی تیاری کی طرف مبذول کرادی جاتی۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موت اور قیامت میں ایک بنیادی فرق ہے جو انسانی نفسیات پر بہت اثر ڈالتا ہے۔ موت کے ذکر سے بھی انسان کو نصیحت ہوتی ہے۔ مگر موت کا مطلب اپنی موت ہوتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کی کل تگ و دو کا بہت کم حصہ اپنی ذات کے لیے ہوتا ہے۔ اس کی زیادہ تر سعی و جہد کا مرکز بیوی، بچے، گھر، کاروبار وغیرہ ہوتے ہیں۔ اس کا یقین ہوتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بھی یہ سب موجود رہیں گے۔ اس لیے وہ اپنی بقا سے کہیں زیادہ ان کی بقا کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ وہ عین بڑھاپے میں بھی سوچتا ہے کہ بیوی بچوں کے لیے کچھ کرجاؤں، کاروبار اور گھر کو بہتر بنالوں۔ یہ سوچ قبر کے عین کنارے کھڑے ہوکر بھی انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ دنیا کی سمت دیکھتا رہے اور اسی کے لیے کوشش کرتا رہے۔

اس کے برعکس قیامت کا انذار یہ بتاتا ہے کہ نہ صرف انسان کی اپنی ذات موت کے خطرے سے دوچار ہے، بلکہ اس کی آل و اولاد، بیوی و قرابت دار، مال و املاک، جائیداد و کاروبار اور دنیا کی ہر چیز اس کے ساتھ ہی ختم ہوجائے گی۔ وہ اگر اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے بہت کچھ بچا رہا ہے تو جان رکھے کہ نہ قیامت کے حادثے میں بچے بچیں گے اور نہ بچایا ہوا مال رہے گا۔

اس کی نہ قبر بنے گی نہ تجہیز و تکفین ہوگی۔ نہ اسے کندھا دیا جائے گا۔ نہ اس پر کوئی رونے والا ہوگا۔ نہ اس کی وراثت تقسیم ہوگی نہ وراثت میں تقسیم ہونے اور اس وراثت کو قبول کرنے کے لیے کوئی بچے گا۔ نہ گھر رہے گا نہ اس کا سامان۔ نہ کاروبار بچے گا نہ اس کا کوئی اہتمام۔ نہ برسی منائی جائے گی نہ یادگار تعمیر ہوگی۔

اگر کچھ ہوگا تو ایک نئی دنیا کا آغاز ہوگا۔ اس دنیا میں انسان اتنا مفلس اٹھے گا کہ پہننے کے لیے بھی کچھ نہ ہوگا۔ نہ کوئی دوسرا ہوگا جو اسے کچھ دے سکے۔ اُس دنیا میں نہ مال کام آئے گا نہ اولاد، نہ رشتے کام آئیں گے نہ تعلقات۔ صرف اعمال، ایمان اور اخلاق۔ یہی کرنسی ہوگی جس سے انسان لباس، گھر اور دیگر اسبابِ زندگی کا اہتمام کر سکے گا۔ اور جس کے پاس یہ کرنسی نہ ہوئی اس کے حصے میں جہنم کے قید خانے کے سوا کوئی اور جگہ نہ آئے گی۔

قیامت کا یہ تصور انسانی نفسیات میں زمین و آسمان کا فرق پیدا کر دیتا ہے۔ موت سے اول تو لوگ نصیحت پاتے نہیں۔ وہ ہر موت کو دوسروں کی موت سمجھتے ہیں اور اپنی موت کی تیاری نہیں کرتے۔ کرنا بھی چاہیں تو ان کی سوچ ہمیشہ اس میں اٹکی رہتی ہے کہ ان کے بعد ان کی اولاد کا کیا ہوگا۔ جبکہ قیامت کا انذار انسان کو یہ سوچ دیتا ہے کہ اولاد کے مرنے کے بعد اولاد کا کیا ہوگا۔ ایسا انسان اپنی فکر بھی کرتا ہے اور اولاد کی تربیت بھی کرتا ہے۔ وہ خود بھی راہِ خدا میں مال خرچ کرتا ہے اور اولاد کو بھی یہی سکھاتا ہے۔ وہ خود بھی نیک عمل کرتا ہے اور اولاد کو بھی اس کی تربیت دیتا ہے۔

قیامت کے انذار کی اہمیت آج ہمیشہ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ کیونکہ اب قیامت مستقبل کا نہیں بلکہ مستقبل قریب کا واقعہ بن چکا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آج پیدا ہونے والے بچے اپنی آنکھوں سے قیامت کا حادثہ دیکھ لیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ قیامت کی یاددہانی کو عام کیا جائے۔ یہی سوچ دنیا پرستی کے اس دور میں بہترین انسان پیدا کرسکتی ہے۔

مکڑی کا جالا

نزولِ قرآن کے وقت اللہ تعالیٰ نے مخاطب مشرکینِ عرب کو یہ چیلنج دیا تھا کہ تم اگر اس کتاب کو غیر اللہ کی تصنیف سمجھتے ہو تو خود بھی اس جیسی کوئی کتاب یا اس کی کسی ایک سورت کی مانند ہی کوئی کلام بنا کر دکھا دو۔ یہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور آپ کی دعوت کو جھوٹا ثابت کرنے کا ایسا آئیڈیل ذریعہ تھا جس کو کفارِ مکہ کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ مگر زبان و بیان اور شعر و خطابت پر اپنے تمام تر عبور و مہارت کے باوجود کفارِ مکہ نے اس چیلنج کا جواب دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس لیے کہ یہ ان کے بس کی بات ہی نہیں تھی۔ یوں یہ بات قرآن کی سچائی کا ایک زندہ ثبوت بن گئی۔

تاہم یہ انسانی طبیعت ہے کہ جب وہ کسی چیز کو اپنے تعصّبات کی بنا پر نہ ماننے کا فیصلہ کر لے تو وہ کوئی نہ کوئی نکتہ آفرینی کر کے ہر دلیل کا جواب دینے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ چنانچہ کفار قرآنِ مجید کے مقابلے کا کلام تو نہ پیش کر سکے البتہ انھیں جواب میں ایک نکتہ ضرور سوجھا جس سے وہ اپنے لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے کہ قرآن کوئی اعلیٰ کلام نہیں ہے۔ وہ کہتے کہ قرآن اعلیٰ کلام کیسے ہوسکتا ہے، اس میں تو معمولی حشرات جیسے مکھی اور مکڑی کی مثالوں سے اپنی اصل دعوت یعنی توحید کو ثابت کیا گیا ہے۔ ان کی اس نکتہ آفرینی کا جو جواب قرآنِ مجید دیتا ہے وہ سورۂ بقرہ آیت 26 میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ جن دو مقامات پر ان حشرات یعنی مکڑی اور مکھی کی مثالوں سے توحید کو واضح کیا گیا ہے وہ اتنے خوبصورت اور باکمال ہیں کہ تمام زمانوں کے مشرکانہ سوچ رکھنے والے اور اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا مددگار اور محافظ سمجھنے والے لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے بہت ہیں۔ یہ مقامات درج ذیل ہیں:

”اے لوگو! ایک تمثیل بیان کی جاتی ہے تو اس کو توجہ سے سنو! جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا کر سکنے پر قادر نہیں ہیں اگرچہ وہ اس کے لیے سب مل کر کوشش کریں، اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے اس کو بچا بھی نہیں پائیں گے۔ طالب اور مطلوب دونوں ہی کمزور ہیں! انھوں نے اللہ کی...... جیسا کہ اس کا حق ہے...... قدر نہیں

پہچانی! بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔''، (حج: 74-73)

''ان لوگوں کی تمثیل جنھوں نے اللہ کے سوا دوسرے کارساز بنائے ہیں بالکل مکڑی کی تمثیل ہے، جس نے ایک گھر بنایا اور بے شک تمام گھروں سے بودا گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے، کاش کہ وہ اس حقیقت کو جانتے! بے شک اللہ اچھی طرح جانتا ہے ان چیزوں کو جن کو یہ اس کے سوا پکارتے ہیں۔ اور وہ غالب اور حکمت والا ہے اور یہ تمثیلیں ہیں جن کو ہم لوگوں کے غور کرنے کے لیے بیان کرتے ہیں لیکن ان کو صرف اہلِ علم ہی سمجھتے ہیں۔''، (عنکبوت: 43-41)

یہ دونوں مقامات اس حقیقت کو بالکل کھول کر بیان کر رہے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی ہستی کو اس دنیا میں کوئی قوت اور طاقت حاصل نہیں۔ اللہ کے سوا جن ہستیوں پر بھروسہ کیا جاتا ہے، جن سے مدد مانگی جاتی ہے، جن کو لوگ اپنا محافظ اور حمایتی سمجھتے ہیں وہ اللہ کی مخلوقات میں سے ایک پست ترین چیز کو بھی تخلیق نہیں کر سکتے اور اگر خدا کی کوئی حقیر مخلوق ان کو کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو جو بیچارے خود اپنے آپ کو نقصان سے نہیں بچا سکتے وہ کسی اور کی مدد کیا کریں گے۔ ان پر بھروسہ کرنے والا شخص آخرت میں اپنے تحفظ کے لیے جو چھت بنا رہا ہے وہ مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ قیامت کا زلزلہ جو پہاڑوں کو بھی ہوا میں اڑا کر مٹی بنا دے گا۔ اس میں کسی مکڑی کے جالے کی کیا وقعت۔ قیامت کے دن غیر اللہ پر بھروسہ کرنے والے سارے لوگ جان لیں گے کہ پروردگار کے مقابلے میں کسی کی کوئی حیثیت نہیں اور سارا اختیار و اقتدار صرف اور صرف ایک اللہ کو حاصل ہے جو انسانوں کی واحد پناہ گاہ ہے۔

جس شخص نے اس حقیقت کو مان کر زندگی گزاری وہی بندۂ مومن ہے، باقی رہے غیر اللہ کو کارساز سمجھنے والے تو ان کی ہر دلیل تارِ عنکبوت (مکڑی کے جالے) کی طرح کمزور اور بے وقعت ہے۔ یہ دنیا میں بھی کسی دلیل کا سامنا نہیں کر سکتی اور آخرت میں بھی کسی ایسے شخص کو خدا کی پکڑ سے بچانے والی نہیں جس نے خدا کو چھوڑ کر اس کے غیر پر بھروسہ کیا۔

انسان کی کہانی

انسان کی کہانی بہت طویل ہے مگر اسے چند جملوں میں با آسانی بیان کیا جا سکتا ہے۔ کائنات 13.7 ارب سال قبل وجود میں آئی۔ نظامِ شمسی ساڑھے چار ارب سال پہلے بنا۔ زمین پر زندگی ساڑھے تین ارب سال پہلے وجود میں آئی۔ پھر نباتات اور حیوانات کی کھربوں اقسام وجود میں آتی رہیں۔ ہر نوع میں کھرب ہا کھرب وجود پیدا ہو کر مرتے رہے۔ آخر میں انسان وجود میں آیا۔ یہ سائنس کے علم کا کمال ہے کہ آج ہم انسان کی یہ کہانی جانتے ہیں۔

یہ انسان صفحۂ کائنات کا سب سے غیر معمولی نقش ہے۔ اس کی صلاحیت یہ ہے کہ یہ حقیر سا وجود کھربوں انواع کے بعد وجود میں آیا لیکن پھر بھی زمین کا حکمران بن گیا۔ مگر انسان کا المیہ یہ ہے کہ زندگی سے کہیں بڑھ کر فکر و تخیل، علم و شعور، ذوق و احساس، ذائقہ و لذت اور حیاتِ ابدی کا شعور رکھنے والا یہ انسان صرف ساٹھ ستر سال کی زندگی گزار کر مر جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے دنیا میں قرآن نام کی ایک کتاب موجود ہے۔ جو یہ بتاتی ہے کہ زمین کا یہ حکمران فانی نہیں بلکہ ابدی زندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ زندگی عنقریب شروع ہوگی۔ اس ابدی زندگی میں کامیاب وہ ہوگا جو اپنے رب کی بندگی اور اس کی مرضی پوری کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لے گا۔

13.7 ارب سال پر پھیلی اس داستان کا پہلا حصہ ختم ہونے کو ہے۔ بہت جلد دوسرا حصہ شروع ہونے کو ہے جب اس عالم کی جگہ نئے زمین و آسمان وجود میں آ جائیں گے۔ ہم سب کے پاس بس ایک اور صرف یہی ایک موقع ہے۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر اگر ہم نے کامیابی حاصل کر لی تو ہم ختم نہ ہونے والی دنیا میں کائنات کے بادشاہ بنا دیے جائیں گے۔ وگرنہ جہنم کا قید خانہ ہمارا ابدی انجام ہوگا۔ ہمارے پاس ایک ہی موقع ہے۔ یہ موقع نہ پہلے کبھی ملا ہے نہ آئندہ کبھی ملے گا۔ اسے استعمال کر لیجیے۔ قبل اس کے کہ یہ موقع ہمیشہ کے لیے چھن جائے۔

دو ماہ کا سبق

''سر! دو مہینے بستر پر پڑا رہنے کے بعد جو پہلی نماز میں نے مسجد میں ادا کی، اس میں ایک زبردست تبدیلی آئی''، یہ جملہ کہنے کے بعد وہ ایک لمحے کے لیے رکے اور پھر میری طرف جھکتے ہوئے بولے۔''مجھے نماز پڑھ کر گھر جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں نے پورے اطمینان اور توجہ کے ساتھ نوافل پڑھے اور جب میں گھر جانے کے لیے مسجد سے نکلا تو جانتے ہیں کیا ہوا؟''، یہ ان کا مجھ سے سوال نہیں، میرے تجسس کو مہمیز دینے کا ایک لاشعوری عمل تھا۔ میں خاموش رہا۔

یہ میرے ایک پرانے شناسا تھے جنھیں میں اکثر ان کی جلد باز طبیعت پر توجہ دلاتا رہتا تھا۔ پچھلے دنوں اسی جلد بازی کے ہاتھوں ان کا ایکسڈنٹ ہوا، پاؤں پر پلاسٹر چڑھا، دو مہینے عملاً معذور ہوگئے اور اب اس کے بعد آنے والی تبدیلی کی داستان میں ان کی زبانی سن رہا تھا۔

''مسجد سے گھر تک تنگ سے روڈ پر لوگ اور گاڑیاں ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ مجھے ہمیشہ گاڑی والوں پر غصہ آتا تھا جو ہارن دے کر پیدل چلنے والوں کو راستے سے ہٹاتے تھے۔ مگر اس روز مجھے کوئی غصہ نہیں آیا۔ کیونکہ مجھے جلدی نہیں تھی۔ بلکہ ایسا ہوا کہ ایک گاڑی والا اپنی کار لوگوں اور سڑک پر کھڑی گاڑیوں کے درمیان سے نکال کر بمشکل ریورس کر رہا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک پرانے ڈرائیور کے لیے بھی یہ مشکل کام ہوتا ہے۔ سو میں نے آگے پیچھے اس کی رہنمائی کرتے ہوئے اس کی گاڑی نکلوادی۔ مجھے گھر پہنچنے میں بس ایک منٹ ہی کی تاخیر ہوئی ہوگی، مگر اس نے جس لہجے میں میرا شکریہ ادا کیا، مجھے لگا کہ میری نماز اللہ کے ہاں قبول ہوگئی۔''

''آپ ٹھیک کہتے تھے۔ جلد بازی میں دنیا و آخرت کا نقصان ہے اور صبر و تحمل میں دنیا و آخرت کی بھلائی ہے۔''، انھوں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اور میں سوچنے لگا کہ یہ خوش نصیب ہیں جنھیں دو مہینے بستر پر گزارنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آگئی۔ بعض نادانوں کو یہ حقیقت زندگی بھر سمجھ میں نہیں آتی۔

اصل چہرہ

''استاد! یہ فرمائیے کہ انسان اپنے رب کی نظر میں اپنا مقام کیسے جان سکتا ہے؟ وہ کون سا آئینہ ہے جس میں انسان اپنا اصلی چہرہ دیکھ سکتا ہے''؟ مخاطب لمحے بھر کے لیے رکا اور پھر اپنے سوال کی مزید وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''مجھے وہ جواب معلوم ہے جو لوگ عام طور پر دیتے ہیں۔ یعنی یہ دیکھو کہ خدا تمھاری نظر میں کیسا ہے یا تم شریعت پر جس طرح عمل کرو گے ویسا ہی خدا کی نظر میں ہوگے۔ مگر یہ داخلی پیمانے ہیں جن میں انسان کی نظر دھوکہ کھاسکتی ہے۔ مجھے کوئی خارجی پیمانہ بتائیے جس میں انسان ویسا ہی نظر آئے جیسا وہ حقیقت میں ہوتا ہے۔''

عارف کا سر حسبِ عادت جھکا ہوا تھا۔ سوال ختم ہوا تو عارف نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور غور سے سائل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔''تم جانتے ہو کہ نبی کریم پر پہلے پہل کون لوگ ایمان لائے تھے؟'' اس نے اثبات میں سر ہلایا، مگر زبان سے کچھ نہ بولا۔ عارف نے اپنی بات کا خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا۔''آپ کی اہلیہ محترمہ خدیجۃ الکبریٰ، عزیز دوست ابوبکر، منہ بولے بیٹے زید بن حارث اور زیرِ کفالت چچازاد بھائی علی۔ ان سب میں کیا چیز مشترک تھی؟''

اس دفعہ عارف نے جواب ملنے کا انتظار کیا۔ یہ جواب ایک اور شریکِ مجلس کی طرف سے آیا۔''یہ نبی کے قریب ترین لوگ تھے''۔ عارف نے کہا:''یہ حقیقت ہے، مگر آدھی حقیقت ہے......'' وہ لمحہ بھر کو رکا اور پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

> ''پوری حقیقت یہ ہے کہ یہ سب لوگ نبی کے زیردست تھے یا پھر ان کے تعلق کی نوعیت ایسی تھی کہ ان سے کچھ بھی نہیں چھپایا جاسکتا۔ شب و روز کے ہر نرم و گرم کا ساتھ نبھانے والی بیوی، مزاج کے ہر موسم کا ساتھ دینے والے دوست اور طبیعت کے ہر ٹھہراؤ اور تیزی کے گواہ بن جانے والے زیردستوں کو جو حیثیت حاصل

ہوتی ہے وہ کسی اور قریبی شخص کو حاصل نہیں ہوتی۔

بیوی کے سامنے انسان ہر اخلاقی جامے کو اتار دیتا ہے۔ دوستوں کے ساتھ مزاج و رویے کی ہر نفاست کونے میں رکھ دی جاتی ہے۔ ماتحتوں کے سامنے طبیعت اور نفسیات پر مفاد اور غلبے کی سوچ ہی غالب رہتی ہے۔ انھی تین مقامات پر انسان کا اصل چہرہ نظر آتا ہے کیونکہ یہاں انسان کچھ بن نہیں سکتا، وہ جیسا ہوتا ہے ویسا ہی نظر آتا ہے۔ یہی وہ آئینہ ہے جس میں انسان کا اصل چہرہ خدا کو نظر آتا ہے۔''

مجلس پر سناٹا طاری تھا۔ اس سناٹے کو عارف کی لمحہ بہ لمحہ بلند ہوتی آواز چیر کر دلوں کا پردہ چاک کر رہی تھی۔ آخری جملے کے ساتھ عارف خاموش ہوئے تو سناٹے کی دبیز چادر نے اہل مجلس کی سماعتوں کا احاطہ کر لیا۔ دیر تک اس سناٹے کو توڑنے والی کوئی صدا بلند نہ ہوئی۔ آخر کار عارف نے سائل کو مخاطب کر کے بہت دھیمے انداز میں کہا:

''بے تکلفی کے لمحات ہوں یا کمزوروں کے ساتھ تمھارے معاملات، یہی وہ دو فیصلہ کن لمحے ہیں جو خدا کی نظر میں تمھارا مقام طے کر دیتے ہیں۔''

☆☆☆☆☆☆☆

زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے
آگے نکلنے کے لیے تیز چلنا ضروری نہیں
بلکہ ہر رکاوٹ کے باوجود چلتے رہنا
اور مسلسل چلتے رہنا ضروری ہے
(ابویحیٰ)

سیلابِ عظیم

جولائی 2010 کے آخر میں پاکستان میں تاریخ کا سب سے بڑا سیلاب آیا۔ پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس سیلاب نے جان و مال کی وہ تباہی برپا کی جس کا نظارہ ہر دردمند دل کو دہلانے کے لیے کافی تھا۔ اس سیلاب کی اگر اطلاع مل جاتی اور بچاؤ کی تیاری کر لی جاتی تو یقیناً اتنی تباہی نہیں پھیلتی۔

عجیب بات ہے کہ ایک عظیم سیلاب پوری دنیا کا رخ کرنے والا ہے۔ یہ سیلاب دریا کے پھیلاؤ سے نہیں بلکہ سمندروں کے ابل جانے سے واقع ہوگا۔ دریا چند سو فٹ چوڑے اور چند میٹر گہرے ہوتے ہیں۔ ان کا سیلاب پھیلاؤ میں چند کلومیٹر سے زیادہ تباہی نہیں مچاتا۔ مگر یہ عظیم سیلاب جو زلزلۂ قیامت کے ساتھ نمودار ہوگا لاکھوں مربع میل پر پھیلے ہوئے سمندروں سے ہزاروں فٹ اونچی لہریں اٹھائے گا۔ یہ لہریں طوفان بن کر شہروں اور بستیوں پر ٹوٹ پڑیں گی۔ بڑی بڑی عمارتیں، محلات، بستیاں اور شہر لمحہ بھر میں ان طوفانی لہروں کی زد میں آ کر ملیا میٹ ہو جائیں گے۔ انسانوں کا تو پوچھنا کیا۔ نہ کوئی چھت ہوگی کہ اس پر پناہ لی جا سکے نہ کوئی کشتی اس طوفان کے سامنے ٹھہر سکے گی۔ نہ کوئی بچانے والا ہوگا نہ کوئی نکالنے والا۔

اس عظیم سیلاب کی پیش گوئی پندرہ سو برس پہلے کی جا چکی ہے۔ ہر مسلمان کے گھر میں قرآنِ مجید میں یہ پیش گوئی لکھی ہوئی موجود ہے۔ اب اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا وقت آ رہا ہے۔ مگر کوئی نہیں جو اس پیش گوئی کو پڑھے اور سمجھے۔ کوئی نہیں جو اسے سنے اور دوسروں تک پہنچائے۔ کوئی نہیں جو اس سیلاب سے بچنے کے لیے نیکی کی کشتی اللہ کے احکام کی روشنی میں تیار کرے۔ جس طرح پیغمبر نوح نے اللہ کے حکم پر کشتی بنائی تھی۔ کیونکہ قیامت کے سیلاب سے صرف یہی کشتی بچا سکتی ہے۔ کیسی عجیب ہے یہ پیش گوئی اور کیسی عجیب ہے لوگوں کی بے حسی۔

اجڑی کھیتی کا سبق

’’بھلا دیکھو کہ جو کچھ تم بوتے ہو، تو کیا اسے تم اگاتے ہو یا اس کے اگانے والے ہم ہیں۔ ہم چاہیں تو اسے چورا چورا کر کے رکھ دیں اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہائے ہم تو مفت تاوان میں پھنس گئے بلکہ ہم تو ہیں ہی محروم۔‘‘ (واقعہ 56:63-67)

ان آیات میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ انسان اپنی زندگی کا جو بھی نقشہ بنالے، اس کی بقا کا تمام تر انحصار اللہ تعالیٰ کی عنایت پر منحصر ہے۔ وہ جب چاہیں اس نقشے کو بگاڑ کر رکھ دیں۔ اس کی ایک مثال پاکستان میں آنے والا حالیہ سیلاب ہے جس میں لاکھوں ایکڑ پر کھڑی فصلیں سیلاب کی نذر ہو گئیں۔ وہ لوگ جو کل تک اپنے علاقے میں انتہائی معزز اور مالدار سمجھے جاتے تھے، وہ دیکھتے ہی دیکھتے محروم و مقروض ہو کر مانگنے والوں کی صف میں آ کھڑے ہوئے۔

انسان ایک ایسی دنیا میں رہتا ہے جہاں اس کی بقا کا تمام تر انحصار اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت پر ہے۔ مگر اکثر لوگ یہ بات بھول کر فخر و غرور اور خدا فراموشی کی نفسیات میں جینے لگتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت وقفے وقفے سے دنیا کے مختلف علاقوں میں سیلاب اور دیگر آفات بھیج کر انسانوں کو ان کی بے بسی کی ایک یاددہانی کرا دیتے ہیں۔ اس یاددہانی کا مقصد عذاب دینا نہیں بلکہ انسانوں کو یہ سمجھانا ہوتا ہے کہ ان کے لیے جینے کی صرف ایک ہی راہ درست ہے۔ وہ یہ کہ انسان ہر نعمت کو اللہ تعالیٰ کی عنایت سمجھ کر شکر گزاری کی روش اختیار کرے۔ اور اگر کبھی مصیبت آ جائے تو اسے اللہ کی مرضی سمجھ کر صبر کا مظاہرہ کرے۔

انفرادی زندگی میں محرومی کے واقعات سے لوگ سبق حاصل نہیں کرتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ بڑے پیمانے پر محرومی کے واقعات کو جنم دیتے ہیں تاکہ لوگ ہدایت حاصل کریں۔ جو لوگ ان بڑے واقعات سے بھی ہدایت نہیں پاتے، عنقریب قیامت کے سیلاب میں ان کا سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ جس کے بعد سوائے ابدی محرومی کے اور کوئی چیز ان کے پاس نہ رہے گی۔

آج کے بت

حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ آج سے چار ہزار برس قبل کا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ایک خدا کی عبادت کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کو حرمِ مکہ کے پاس بسایا تاکہ ایک خدا کی عبادت کی رسم دوبارہ قائم ہو جائے۔ اس موقع پر جو دلنواز دعا آپ نے فرمائی اس کا ایک جملہ اس طرح قرآنِ مجید میں نقل ہوا ہے کہ اے میرے رب مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ پروردگار! ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کر ڈالا ہے، (ابراہیم 14:35-36)۔

عجیب بات ہے کہ چار ہزار برس بعد انسانیت ایک دفعہ پھر خدا فراموشی کے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ پہلی فراموشی عبادتِ رب کی تھی اور موجودہ فراموشی ملاقاتِ رب یعنی قیامت کے دن خدا کے حضور پیشی کی ہے۔ پہلے مٹی کے بتوں (Idols) نے انسانوں کو اپنی طرف کھینچ کر خدا سے دور کیا تھا اور اب آج American، Indian اور Pakistan Idols جیسے میڈیا شوز انسانوں کو اپنی طرف کھینچ کر خدا سے دور کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کا میڈیا کئی پہلوؤں سے ایک ’’بت‘‘ بن چکا ہے، جس کی ’’پرستش‘‘ ہر گھر میں صبح و شام کی جاتی ہے۔ یہ بت دنیا اور اس کی رنگینیوں، اس کی حسیناؤں، اس کے جھمیلوں، اس کی کہانیوں، اور اس کے مقابلوں میں انسانوں کو اس طرح الجھاتا ہے کہ انسان خدا و آخرت کو بھول جاتا ہے۔ ایسے میں کوئی بندۂ مومن اپنی اولاد کو اگر خدا پرست بنانا چاہے تو اس کی اولین ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اس ’’بت‘‘ کی پرستش سے دور رکھنے کے لیے عملی اقدامات بھی کرے اور پروردگار سے بھی وہی دعا کرتا رہے جو ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی کہ اے میرے رب مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ پروردگار ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کر ڈالا ہے۔ یہی اس دور میں بندگی رب کی رسم باقی رکھنے کا واحد طریقہ ہے۔

سب سے طویل فاصلہ

"انسان کے لیے دنیا کا سب سے طویل فاصلہ کون سا ہے؟"، یہ وہ سوال تھا جو عارف نے کچھ دیر قبل اٹھایا تھا اور اب حاضرین میں سے مختلف لوگ اپنا اپنا اندازہ بیان کر رہے تھے۔ بظاہر سب سے زیادہ صحیح جواب وہ تھا جس میں سیاروں اور ستاروں تک سفر کے فاصلے کو سب سے طویل فاصلہ کہا گیا تھا۔

"دنیا کا سب سے طویل فاصلہ خود وجود انسانی کے اندر پایا جاتا ہے۔"، لوگ خاموش ہوئے تو عارف نے کہنا شروع کیا۔ لوگ ہمہ تن گوش ہو کر معرفت کے ان موتیوں کو اپنے دامن دل میں سمیٹنے لگے۔ عارف نے اپنی بات جاری رکھی: "یہ فاصلہ دل و دماغ کے بیچ پایا جاتا ہے۔ مادی لحاظ سے یہ فاصلہ بمشکل ڈیڑھ فٹ کا ہوگا۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ فاصلہ اتنا طویل ہے کہ زندگی گزر جائے پھر بھی یہ فاصلہ طے نہیں ہوتا۔ انسان اگر مرجائے اور دوبارہ جی اٹھے، پھر مرجائے پھر جی اٹھے تب بھی وہ اس فاصلے کو عبور نہیں کر پاتا۔"

"تو کیا اس فاصلے کو عبور کرنا ممکن ہی نہیں؟"، ایک صاحب نے سوال کیا تو عارف گویا ہوئے: "یہ میں نے نہیں کہا۔ میں نے یہ کہا ہے کہ یہ فاصلہ بہت طویل ہوتا ہے، مگر یہ فاصلہ ناقابل عبور نہیں۔ سچائی دماغ تک لمحے بھر میں پہنچ جاتی ہے، اچھائی کو ذہن فوراً قبول کر لیتا ہے، مگر سچائی دل میں بس جائے اور اچھائی شخصیت کا حصہ بن جائے اور پھر دل کی دنیا بدل جائے اور ایک نیا انسان وجود میں آجائے، یہی اصل مشکل ہے۔

"اس مشکل کا کوئی حل ہے؟"، ایک طرف سے سوال اٹھا تو عارف نے کہا: "اس مشکل کا ایک ہی حل ہے...... مضبوط ارادہ۔ ڈیڑھ فٹ کا یہ فاصلہ صرف وہی شخص طے کر سکتا ہے جو مضبوط ارادے کو اپنی سواری بنالے۔ خواہشات و جذبات سمیت راہ کی ہر دیوار کو آہنی عزم سے پاش پاش کر دے۔ صرف ایسے ہی لوگ اس راستہ کو عبور کیا کرتے ہیں۔ باقی لوگوں کے لیے یہ راستہ تازیست ایک ناقابل عبور صحرا بنا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ موت کی وادی تک جا پہنچیں۔"

زیادہ بڑی خدمت

انسانوں کی غمخواری کرنا اور دکھ درد میں دوسرے کے کام آنا ایک بہت بڑی انسانی خوبی ہے۔ یہ خوبی اس وقت بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے جب کوئی مصیبت بڑے پیمانے پر آجائے اور بہت بڑی تعداد میں لوگ کسی پریشانی میں گھر جائیں۔ اس کی ایک مثال پاکستان میں آنے والا حالیہ سیلاب تھا۔ اس سیلاب سے ہونے والی تباہی کی تفصیلات جب میڈیا کے ذریعے لوگوں کے سامنے آئیں تو لوگوں کا جذبۂ ہمدردی پوری طرح بیدار ہو گیا۔ مہنگائی اور معاشی تنگی کے اس دور میں بھی لوگوں نے اربوں روپے سیلاب زدگان کی مدد کے لیے جمع کر دیے۔ بہت سے لوگوں نے اپنے آرام و اسباب کو چھوڑا اور ضرورت مندوں کی مدد کرنے کے لیے انتہائی تکلیف دہ حالات کا سامنا کرتے ہوئے گھروں سے نکل پڑے۔ مرد، عورت، نوجوان، بوڑھے، بچے، جس سے جو ہو سکا دامے، درمے، قدمے، سخنے، وہ اس نے کیا۔

دوسروں کے مصائب دور کرنے کا یہی جذبہ تمام سوشل ورک اور خدمت خلق کے کاموں کی بنیاد ہے۔ اس کام میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ لوگ مصیبت زدگان کی مدد کرتے ہوئے تردد کریں۔ جب انھیں کسی شخص پر اطمینان ہو جاتا ہے تو لوگ جان و مال ہر طرح سے ایسے کاموں کے لیے فعال ہو جاتے ہیں۔ انسانی ہمدردی بلاشبہ انسانیت کا اعلیٰ ترین وصف ہے اور یہی وہ جذبہ ہے جو انسانوں کو جانوروں سے افضل اور برتر بناتا ہے۔

دیگر انسانوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر انبیا علیھم السلام بھی خدمت خلق کے میدان میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے در سے کبھی سوالی خالی لوٹتا تھا اور نہ مصائب زدہ لوگ خود کو تنہا پاتے تھے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ سوشل ورک کبھی کسی نبی اور رسول کی زندگی کا مقصد نہیں بنا۔ اس کے بجائے ان کی زندگی کا اصل مقصد روز قیامت اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے خبردار کرنا اوران

اعمال کی ہدایت دینا ہوتا تھا جو اللہ تعالیٰ کے مطلوب اعمال ہیں۔کوئی نبی یا رسول اس طرح کی زندگی اور مقصد کے ساتھ جیتا ہوا نظر نہیں آتا جس طرح کا مقصد آج کے بعض انتہائی قابل احترام سوشل ورکر جیسے عبدالستار ایدھی کی زندگی کا ہے۔

بظاہر یہ بات عجیب ہے، مگر درحقیقت انبیا کا تمام تر کام لوگوں کی ہمدردی اور خیر خواہی کے لیے ہی ہوتا ہے۔فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ ایک عام سوشل ورکر صرف دنیا کے مسائل کو سامنے رکھ کر انسانوں کے ان مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے۔جبکہ نبی اور رسول کے سامنے آخرت کی دنیا کے مسائل ہوتے ہیں۔عام لوگوں کو دنیا کی محرومی نظر آتی ہے، خدا کے نبی یہ جانتے ہیں کہ آخرت کی محرومی کا مطلب کیا ہوتا ہے۔

دنیا میں انسان کے ساتھ پیش آنے والا بدترین سانحہ موت ہوتا ہے۔قیامت کے دن خدا کے مجرموں کو ملنے والا عذاب اتنا شدید ہوگا کہ اس روز ان کے لیے موت سب سے بڑی خوش قسمتی بن جائے گی۔دنیا میں معذوری اور آنسوؤں کا مشاہدہ انسانی ہمدردی کے جذبات ابھارتا ہے۔انبیا کی نظروں کے سامنے وہ جہنم ہوتی ہے جس کی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دینے والی آگ نہ جینے دے گی نہ مرنے دے گی۔عام لوگوں کو غربت و افلاس سب سے بڑا مسئلہ لگتے ہیں، قیامت کے دن سب سے بڑا مسئلہ جنت کی ابدی بادشاہی سے محرومی ہوگا۔

انبیا کی سیرت کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ بلاشبہ لوگوں کے دنیوی مصائب حل کرنا بڑی خدمت ہے، لیکن انھیں جہنم کا ایندھن بننے سے بچانا زیادہ بڑی خدمت ہے۔آج بھی جو لوگ اس کام کے لیے اٹھتے اور اس کام میں مالی اور عملی تعاون کرتے ہیں کل قیامت کے دن وہ انبیا کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔انہیں بیک وقت خدمت خلق کا اجر بھی ملے گا اور عبادت رب کا بھی۔وہ نصرت دین کا اجر بھی دیکھیں گے اور انسانوں کی خیر خواہی کا صلہ بھی پائیں گے۔

معرفت کی دعا

جن گھروں میں چھوٹے بچے ہوتے ہیں وہاں ایک واقعہ اکثر پیش آتا ہے۔وہ یہ کہ رات کے کسی پہر میں جب دنیا نیند کے مزے لے رہی ہوتی ہے، سوتا ہوا بچہ اپنی ماں کو پکارتا ہوا بیدار ہوجاتا ہے۔اس کی آواز سن کر اس کی ماں بھی فوراً بیدار ہوجاتی ہے۔بچہ بھوکا ہوتا ہے تو اسے دودھ دیتی ہے، بستر گیلا کر دیتا ہے تو کپڑے بدلتی ہے۔غرض بچے کو جو بھی تکلیف ہوتی ہے، ماں اپنی نیند اور آرام بھول کر اسے دور کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ماں کی یہی محبت اسے ماں بناتی ہے۔

لوگ ماں کو جانتے ہیں، خدا کو نہیں جانتے۔لوگوں کو یہ بات نہیں معلوم کہ جب خدا کو پکارا جاتا ہے تو وہ ایک ماں سے زیادہ تیزی سے اپنے بندے کی طرف لپکتا ہے۔شرط یہ ہے کہ بندے کی دعا معرفت کی دعا ہو، وہ مفاد کی دعا نہ ہو۔مفاد کی دعا وہ ہوتی ہے جس میں انسان خدا کو مسئلہ حل کرنے کی مشین سمجھ کر پکارتا ہے۔جب دعا قبول ہوجاتی ہے تو اسے بھول جاتا ہے۔اس کے پیش نظر صرف اپنی ذات ہوتی ہے۔خدا کی عنایت، مہربانی، صفات عالیہ اور شکر گزاری کا کوئی احساس اس کے دل میں نہیں ہوتا۔اللہ تعالیٰ بہت کریم ہیں۔وہ ایسی دعاؤں کا جواب بھی دیا کرتے ہیں۔مگر اس میں وہ انسانوں کی حکمت و مصلحت کی رعایت ضرور کرتے ہیں۔

اس کے برعکس معرفت کی دعا اس دل سے نکلتی ہے جو خدا کو اس کی عنایات اور صفات کے حوالے سے جانتا ہے۔ایسا دل بچے کی طرح ہی اپنی تکلیف پر تڑپ کر اپنے رب کو پکارتا ہے۔مگر اس کا پکارنا محض پکارنا نہیں ہوتا وہ خدا کی صفات کا اعلیٰ ترین بیان بھی ہوتا ہے۔وہ کسی بچے کی آواز پر ماں کو اٹھتے دیکھتا ہے تو کہتا ہے: ’’اے رب! یہ سوئی ماں روتے ہوئے بچے کے لیے اٹھ گئی۔میں کیسے مان لوں کہ وہ رب جسے نیند آتی ہے نہ اونگھ اپنے بندے کی آہ پر اس کے دکھ دور کرنے نہ اٹھے گا‘‘۔یہی وہ دعا ہے جس کے بعد ہر ناممکن ممکن ہوجاتا ہے۔آسمان و زمین کا مالک ماں سے زیادہ تیزی سے لپک کر اپنے غلام کی دستگیری کرتا ہے۔مگر بدقسمتی سے آج کثرت دعا کے اس دور میں یہی معرفت بھری دعا بہت کم ہے۔

کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

خدا کی ہستی سے زیادہ حسین وجود کسی کا نہیں۔ مگر اس کا یہ حسن اس کی صفات کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ سورج اس کے جلال کا ایک ادنیٰ پرتو ہے۔ بدر کامل اس کے جمال کا ایک حقیر نمونہ ہے۔ آسمان اس کی عظمت کا ایک معمولی سا نشان ہے۔ بارش اس کی رحمت کا محض ایک قطرہ ہے۔ زندگی اس کی قدرت کا صرف ایک اشارہ ہے۔ مخلوقات میں پائی جانے والی محبت اس کی شفقت کا بس ایک ذرہ ہے۔ خدا کی صفات کاملہ کا مخلوقات میں یہی ظہور وہ ذریعہ ہے جس سے بندۂ مومن یہ جانتا ہے کہ اس کا رب کیسا ہے۔

اس بے مثل خدا کی معرفت اگر کسی انسان کو حاصل ہوجائے تو وہ خود بھی کامل ہوجاتا ہے۔ خدا کی بندگی اس کی زندگی ہوجاتی ہے۔ مخلوق سے محبت اس کی عادت بن جاتی ہے۔ صبر اس کی سیرت اور شکر اس کا طریقہ بن جاتا ہے۔ خدا کی یاد اسے قوت دیتی ہے اور خدا کی لگن اسے ہر سرد و گرم میں باعمل رکھتی ہے۔ یہ بندۂ مومن ہوتا ہے جس کا دل خدا کا گھر بن جاتا ہے۔

خدا کے اس گھر میں کبھی کوئی منفی جذبہ جگہ نہیں بنا پاتا۔ حسد، تکبر، کینہ، نفرت، بخل، اسراف، نمود و نمائش، نفسانیت، غفلت، غیبت، تجسس، بدگمانی، حرام کی محبت جیسی گندگیاں کبھی اس گھر میں نہیں آسکتیں جس گھر میں خدا کی یاد رہتی ہو۔ اس کی خوارک، اس کی گفتگو، اس کی عادات سب اس کے قابو میں ہونے کے باوجود اس کے رب کی مرضی کے خلاف نہیں جاسکتیں۔ اور کبھی چلی جائیں تو وہ توبہ کے آنسوؤں سے اپنے ہر داغ کو دھوڈالتا ہے۔ یہ بندۂ مومن ایک مکمل آزاد وجود ہوتا ہے، لیکن یہ ایک مکمل پابند اور گرفتار شخص بن کر جیتا ہے۔ یہی آزاد مگر اسیر بندہ دراصل بندۂ خدا ہوتا ہے۔

تم نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

ٹیم ورک

اردو زبان کا ایک محاورہ ہے کہ ایک اکیلا دو گیارہ۔ یہ محاورہ اس بات کا بڑا خوبصورت بیان ہے کہ مل کر کام کرنا تنہا کام کرنے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے۔ تاہم مل کر کام کرنے کی ایک بہت بڑی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ لوگ ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے کے بجائے ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوط کرنے کی کوشش کریں۔ اپنی ذات کو نمایاں کرنے اور ذاتی مفاد کو اہمیت دینے کے بجائے مشترکہ مقاصد کو اہمیت دیں۔ جب اختلاف ہوجائے تو اسے انا کا مسئلہ بنانے کے بجائے اس حقیقت کو مان لیں کہ لوگ مختلف انداز سے سوچ سکتے ہیں۔

ایک کاروباری ادارے میں اتحاد عمل اس لیے وجود میں آجاتا ہے کہ وہاں اختلاف کی شکل میں کوئی بھی شخص خود علیحدہ ہوسکتا ہے یا مالک اسے الگ کر کے اسی صلاحیت کا دوسرا آدمی تنخواہ پر ملازم رکھ سکتا ہے۔ تاہم ایک غیر کاروباری ادارے میں صورتحال بہت مختلف ہوتی ہے۔ وہاں لوگ کسی مفاد کے گرد نہیں بلکہ کسی مشترکہ مقصد کے گرد جمع ہوتے ہیں۔ ایسے بامقصد لوگ بہت اعلیٰ انسان ہوا کرتے ہیں۔ تاہم ان اعلیٰ انسانوں کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ یہ قیمت ان کی رائے کا احترام، ان کی خودداری کا لحاظ اور ان کی صلاحیت کے لحاظ سے ان کو کام دینا ہوتا ہے۔

تاہم ایک دوسری چیز اس کے ساتھ بہت اہم ہے۔ وہ ان لوگوں کی مستقبل تربیت ہے۔ اس بات کی تربیت کہ لوگ خودداری کو خود پسندی اور انا میں تبدیل نہ کردیں۔ لوگ اپنی صلاحیت کے اظہار میں ادارے کے ڈسپلن اور بنیادی اصول کی خلاف ورزی نہ کریں۔ وہ اپنی رائے کے عشق میں دوسروں کی آراء اور خیالات کو نظر انداز نہ کرنے لگیں۔

اجتماعی کامیابی اسی دوطرفہ قیمت کا نام ہے۔ یعنی اعلیٰ انسانوں کا لحاظ رکھنا اور ان لوگوں کا اپنی اصلاح و تربیت کے لیے تیار رہنا۔ یہی دوطرفہ رویہ ٹیم ورک کو مؤثر بناتا ہے۔

مَلِيْكٍ مُّقْتَدِر

بادشاہ کا نام انسانی دنیا میں قوت، طاقت، دولت اور عظمت کا سب سے بڑا نشان رہا ہے۔ آج کے جمہوری دور میں بادشاہوں کے اختیارات تو کچھ کم ہوئے ہیں، لیکن باقی حیثیتوں میں آج بھی وہ معاشرے کے اعلیٰ ترین لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ تاہم آج کے نسبتاً کم اختیار والے بادشاہ ہوں یا ماضی کے مختار کل قسم کے بادشاہ، تمام بادشاہ اپنے اقتدار کی عظمت کے باوجود ان گنت قسم کی محتاجی کا شکار تھے۔ موت، بیماری، دوسروں پر انحصار، بغاوت کا خوف وغیرہ جیسی چیزوں سے لے کر بھوک، پیاس، نیند تک کچھ بھی ان کے قبضۂ قدرت میں نہ تھا۔ لیکن اس دنیا میں ایک بادشاہ اور ہے جو اپنے آپ کو 'مَلِيْكٍ مُّقْتَدِر' کہتا ہے۔ یعنی وہ صاحب اقتدار بادشاہ جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جو موت و بیماری سے بلند اور نیند اور اونگھ سے پاک ہے۔ جسے بغاوت کا اندیشہ ہے اور نہ بھوک کا۔ وہ کسی کا محتاج نہیں بلکہ ہر وجود اسی کا محتاج ہے۔

عجیب بات ہے کہ دنیا میں لوگوں کو ہر فانی اور محتاج بادشاہ کی عظمت نظر آجاتی ہے، مگر الحی القیوم کی عظمت دیکھنے والی آنکھیں بہت کم ہیں۔ بادشاہوں سے خوف وطمع رکھنے والے بہت ہیں، مگر خدائے ذوالجلال سے امید واندیشہ رکھنے والے بہت کم ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ صاحب اقتدار بادشاہ سب کچھ ہے، بس پیشانی کی آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ لیکن وہ انسان ہی کیا جو آنکھوں کی بصارت سے ہر چیز دیکھے۔ انسان تو وہ ہے جو عقل کی بصیرت سے حقائق کو پہچان لے۔

'ملیك مقتدر' ایسے ہی انسانوں کی تلاش میں ہے۔ جو غیب میں رہ کر خدا کو پہچان لیں۔ جو اس کی عظمت کے آثار دیکھ کر اس کی حمد، تسبیح اور تعریف کرسکیں۔ جن کی زبان اس کے ذکر اور جن کا دل اس کی یاد میں مشغول رہے۔ جو خالق کے لیے سراپا عبادت اور خلق کے لیے سراپا رحمت وشفقت ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو 'مَلِيْكٍ مُّقْتَدِر' عنقریب اپنے جیسا خودمختار، صاحب اقتدار بادشاہ بنادے گا۔ کبھی نہ ختم ہونے والی جنت میں، (القمر 55:54)۔

جنت کا نشہ

انسان ایک لذت پسند مخلوق واقع ہوا ہے۔ وہ جانوروں کی طرح ضرورت و جبلت کی تسکین تک محدود نہیں رہتا بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر اپنے ذوق جمال، لذت کام و دہن، حسنِ سماعت اور دیکھنے، سونگھنے، چھونے کی حسوں کی کامل تسکین چاہتا ہے۔ انسان بحرِ لذت کی گہرائی میں اتنا ڈوبنا چاہتا ہے کہ وہ نشے جیسی چیز کو اختیار کرلیتا ہے جو انسان کے جسم اور اس کی عقل دونوں کے لیے زہر قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

نشہ بلاشبہ انسان کی دریافت کردہ آخری لذت ہے جو انسان کو ایک مستقل کیف وسرور کے احساس میں ڈبوئے رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان کی فیصلہ کن محدودیت اس نشے کو رسوائی، شرف انسانی سے محرومی اور فرد اور خاندان کی تباہی میں تبدیل کردیتی ہے۔ نشے کی تمام تر برائی کے باوجود یہ اس حقیقت کا بہت عمدہ بیان ہے کہ انسان لذت کو محسوس کرنے کی انتہائی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے وہ ایک ایسی دنیا میں جی رہا ہے جہاں اس کی عقل اور اس کا جسم لذت محسوس کرنے کی اس صلاحیت کا ساتھ دینے سے قطعاً عاجز ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ خالق کائنات نے موجودہ دنیا تعارف لذت کے لیے بنائی ہے، تسکین لذت کے لیے نہیں۔ عنقریب وہ دنیا قائم ہورہی ہے جہاں انسانی صلاحیت اتنی بڑھ جائے گی کہ نشہ لذت وسرور کا سبب تو ہوگا مگر اس کے جسم وعقل کو کوئی نقصان نہ پہنچائے گا، (واقعہ 19:56)۔ یہ دنیا جنت کی دنیا ہوگی جہاں ہر محدودیت ختم ہوجائے گی اور اہل ایمان اپنی لذت کی آخری تسکین پالیں گے۔

یہ جنت ان لوگوں کا انعام ہے جو موجودہ دنیا میں شوق لذت کو ذوق اطاعت کے تابع رکھتے ہیں۔ جو حرام کی راہ سے لذت کی تسکین نہیں کرتے۔ جو اپنے قلب ونظر کو آوارگی، جسم کو رزق حرام، ہاتھ اور زبان کو ایذاپسندی سے بچاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کو عنقریب ہمیشہ باقی رہنے والی لذت بھری جنت میں جگہ دے دی جائے گی۔

کال سنٹرز

جدید دنیا میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور ٹیلی کمیونیکیشن کے شعبے میں ہونے والی ترقی نے جہاں اور کئی چیزوں کو جنم دیا ہے وہیں کال سنٹرز کی شکل میں کاروباری اداروں اور صارفین کے درمیان رابطے کو بہت آسان بنادیا ہے۔ بڑے بڑے ادارے اپنے کسٹمرز کے مسائل کے حل اور دیگر مقاصد کے لیے کال سنٹرز کا استعمال کرتے ہیں۔

بعض ادارے یہ اہتمام کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص کال سنٹر اسٹاف سے براہ راست گفتگو کرنا چاہے تو اس کی کال ریکارڈ کرلی جائے۔ اس کا مقصد عام طور پر کچھ اور بیان کیا جاتا ہے لیکن اس کا اصل مقصد تمام کالرز پر یہ واضح کرنا ہوتا ہے کہ ان کی گفتگو ریکارڈ ہورہی ہے، اس لیے وہ کوئی غیر ذمے دارانہ گفتگو نہ کریں۔ یہ بات براہِ راست صارفین سے نہیں کہی جاتی۔ اس کے بجائے انھیں کال کے آغاز پر یہ بتادیا جاتا ہے کہ آپ کی کال ریکارڈ کی جائے گی۔ یہ اطلاع ہی انسان کو محتاط کردینے کے لیے بہت ہے۔

انسان بالعموم بے خوفی کی نفسیات میں جیتے ہیں، مگر احتساب کا خوف اور نگرانی کا یقین وہ چیزیں ہیں جو انسان کو اپنی حد میں رہ کر جینا سکھاتے ہیں۔ احتساب اور نگرانی کا ٹھیک یہی تصور قرآن مجید انسانوں کو دیتا ہے۔ وہ انسانوں کو بتاتا ہے کہ انسان کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلتا مگر یہ کہ ایک مستعد نگران اسے نوٹ کرلیتا ہے، (ق:18)۔ فرشتے ہمہ وقت انسان کے ساتھ رہتے ہیں اور اس کے ہر قول و فعل کا پورا ریکارڈ رکھتے ہیں، (انفطار:12-11)۔ قیامت کے دن انسان اس ریکارڈ کے ساتھ اس طرح اللہ کے حضور پیش ہوگا کہ کوئی چھوٹی بڑی بات چھپی نہ رہ جائے گی، (کہف:49)۔

یہی وہ یقین ہے جس کی بنیاد پر کوئی شخص مؤمن کہلانے کا مستحق ہے اور یہی وہ یقین ہے جو ایک مؤمن کو خلوت و جلوت اور قول و فعل میں ہمیشہ محتاط رکھتا ہے۔

کرم والا اور دل والے

سوال بہت سادہ تھا۔ ’’اگر آپ کو کوئی شخص گالیاں دیتا رہا ہو تو کیا آپ کسی موقع پر اس شخص کی مدد کرنا گوارا کریں گے؟‘‘ حاضرین مجلس نے بلا توقف جواب دیا: ’’یہ بہت مشکل ہے۔ ہم کسی ایسے شخص کی مدد نہیں کریں گے جو ہمیں گالیاں دیتا ہو۔‘‘

’’آپ نے ٹھیک کہا کہ ہم ایسا نہیں کرتے۔‘‘ عارف نے لوگوں کی تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ’’مگر ایک ہستی ہے جو انتہائی حقیر اور پست لوگوں سے صبح و شام گالیاں بھی سنتی ہے اور ان کی داد رسی بھی کرتی رہتی ہے‘‘، عارف نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

’’یہ اللہ تعالیٰ کی بلند ترین ہستی ہے۔ ایک صحیح حدیث میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ابن آدم مجھے گالی دیتا ہے۔ اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ نے اولاد اختیار کی ہے۔ اس حدیث قدسی کے مطابق شرک اللہ تعالیٰ کو گالی دینے کے مترادف ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بدترین توہین ہے کہ اس کی ذات، صفات اور اختیارات میں کسی کو شریک سمجھا جائے، مگر آج بیشتر انسان؛ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، کھلے یا چھپے ہوئے شرک کا شکار ہیں۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ ان گالی دینے والوں اور اپنی بدترین توہین کرنے والوں کو کھانا دیتے ہیں، پانی دیتے ہیں اور اولاد دیتے ہیں۔ غرض وہ سب دیتے ہیں جس کی انھیں ضرورت ہوتی ہے۔‘‘

لمحہ بھر کے توقف کے بعد عارف نے لوگوں سے دریافت کیا: ’’جو کریم گالی دینے والوں کے ساتھ ایسا ہے، آپ بتائیے وہ وفاداروں کے ساتھ کیسا ہوگا؟‘‘ سوال یہ بھی واضح تھا، مگر اس سوال کا اہل مجلس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ایسے سوالوں کا دل والے زبان سے جواب نہیں دیا کرتے۔ کسی نے گردن جھکالی۔ کسی کی آنکھ سے آنسو بہہ نکلے اور کوئی اپنا احتساب کرنے لگا کہ وہ اس کریم و شفیق ہستی کے وفاداروں میں سے ہے یا نہیں۔

لغویات

قرآن کریم میں کئی مقامات پر اہل ایمان کی یہ صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ لغویات سے بچتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں۔لغویات اصلاً گناہ کے کام نہیں ہوتے، بلکہ یہ وہ پست رویے ہوتے ہیں جو اعلیٰ شرف انسانی کو مجروح کرتے ہیں یا پھر وہ لایعنی اور بے مقصد اعمال ہوتے ہیں جن سے انسان کا وقت ضائع ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو محدود وقت دے کر ایک اعلیٰ مقصد کے ساتھ اس دنیا میں بھیجا ہے۔ساٹھ ستر برس کی اس مختصر زندگی میں انسان کے سامنے ایک اعلیٰ مقصد رکھا گیا ہے کہ وہ خواہشات اور جذبات پر قابو پا کر اعلیٰ اخلاقی رویہ اختیار کرے، جس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ باقی رہنے والی جنت کا حقدار قرار پائے گا۔

بدقسمتی سے آج کے انسان کے سامنے یہ مقصد باقی نہیں رہا بلکہ وہ اپنی زندگی کی سب سے قیمتی متاع یعنی اپنے وقت کو لغویات میں بے دریغ ضائع کرتا ہے۔زمانۂ قدیم میں ان لغویات کی ایک شکل گھروں، بازاروں اور چوراہوں پر بے معنی گفتگو کا کیا جانا تھا اور دور جدید میں موبائل پر بے مقصد گفتگو، بلاضرورت میسجز کا تبادلہ اور انٹرنیٹ پر بلاضرورت چیٹنگ اور سرفنگ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔خاص کر نوجوان طبقہ اپنی بہترین صلاحیتوں، سیکھنے کے قیمتی اوقات اور والدین کی خون پسینے کی کمائی کو ان لغو چیزوں پر بے دریغ ضائع کرتا ہے۔انھی لغویات کی ایک شکل ٹیلیوژن کے وہ اکثر پروگرام ہوتے ہیں، جن میں تفریح کا عنصر بہت کم اور لغو باتوں، بے مقصد داستانوں اور وقت کے زیاں کے علاوہ گناہ کی مختلف شکلوں کی کثرت ہوا کرتی ہے۔

ہم میں سے ہر شخص کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہمیں زندگی کے محدود لمحے دیے گئے ہیں اور ہر لمحہ صرف ایک بار ملتا ہے۔اس لیے ہر لمحے کو یہ سوچ سمجھ کر خرچ کرنا چاہیے کہ اگر یہ گناہ و نافرمانی کے کاموں میں استعمال نہیں ہوا تو لغویات میں بھی ضائع نہیں ہونا چاہیے۔

سیرت مصطفیٰ بے مثل باخدا

حلم اور صبر کسی انسان کی شخصیت کو جاننے کا سب سے زیادہ اہم پیمانہ ہوتا ہے۔پھر حلم کو جانچنے کے بھی کئی مقامات ہوسکتے ہیں جن میں سے دو ایسے ہیں جو کسی انسان کے حلم کا آخری پیمانہ ہوتے ہیں۔ایک یہ کہ کسی شخص نے اپنی اولاد کے حوالے سے پیش آنے والے صدمات پر کس رویے کا مظاہرہ کیا اور دوسرا یہ کہ اپنے دشمنوں کے ظلم و زیادتی کے باوجود ان پر قابو پانے کے بعد انسان کا رویہ کیسا رہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ان دونوں مقامات پر حلم، صبر، برداشت اور عفو و درگزر کے آخری مقام پر نظر آتی ہے۔پہلے اولاد کے معاملے کو لے لیجیے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے متعدد اولادوں سے نوازا تھا۔حضرت خدیجہؓ سے آپ کی چار صاحبزادیاں حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ پیدا ہوئیں۔جبکہ دو بیٹے حضرت قاسم اور حضرت عبداللہ پیدا ہوئے جن کا لقب طاہر و طیب تھا۔آپ کے ایک صاحبزادے حضرت ابراہیم بی بی ماریہ سے پیدا ہوئے۔

حضرت فاطمہ کو چھوڑ کر آپ کی تمام اولادیں آپ کی آنکھوں کے سامنے اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔تینوں بیٹے بچپن کی عمر ہی میں انتقال کر گئے۔جبکہ تینوں بیٹیاں عین جوانی میں دنیا سے رخصت ہوئیں۔حضرت فاطمہؓ کا انتقال بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے صرف چھ ماہ بعد ہوگیا۔یہ باتیں کتابوں میں پڑھنا بہت آسان ہیں۔لیکن ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں کہ ہم میں سے کسی شخص کے ساتھ اگر یہ سانحہ پیش آ جائے تو کیا ہوگا۔ہم اپنی اولاد کا معمولی سا دکھ بھی برداشت نہیں کرسکتے۔مگر سرکار دوعالم کی ذات پر یہ آزمائش ٹوٹی کہ تینوں بیٹے بچپن کی اس عمر میں جب انسان بچوں کی ایک ایک ادا پر نثار ہو رہا ہوتا ہے، انتقال کر گئے اور بیٹیاں جوانی کی اس عمر میں جب موت کا تصور کرنا بھی بوجھل معلوم ہوتا ہے خالق حقیقی سے جا ملیں۔

مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صدمات کو کمال حوصلہ کے ساتھ برداشت کیا۔آپ کے

آخری صاحبزادے حضرت ابراہیم کا انتقال جنگ تبوک کے بعد بالکل آخری دور میں ہوا جب آپ کے وہ الفاظ تاریخ میں نقل ہوگئے جو آپ نے اس موقع پر ارشاد فرمائے تھے: ''ہماری آنکھیں بہہ رہی ہیں، دل افسردہ ہیں، مگر ہم زبان سے صرف وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہے''۔ دنیا میں کوئی اور شخص ہے جو صبر و برداشت کی یہ نظیر پیش کر سکے۔

دشمنوں کے معاملے میں بھی آپ کا حلم درجۂ کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ آپ کو اللہ کے راستے میں ہر وہ تکلیف دی گئی جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے اپنے قریب ترین رشتے داروں اور ہم قبیلہ لوگوں کی بدترین مخالفت جھیلی۔ صبح و شام طرح طرح کے توہین آمیز کلمات، خطابات اور طنزیہ جملے سنے۔ ہر طرح کا الزام، بہتان، ہجو گوئی، استہزا اور سوشل بائیکاٹ سہا۔ عین حرم پاک میں، مکہ کے بازاروں میں اور طائف کے پہاڑوں پر آپ اور آپ کے ساتھی ہر طرح کی مخالفت، ذلت اور تشدد کا شکار رہے۔ ہجرت کے بعد کبھی جنگ و جدل کی سختیاں جھیلیں تو کبھی محبوب ترین رشتے داروں اور عزیزوں کی کفار کے ہاتھوں انتہائی دردناک موت کا سانحہ جھیلا۔ کبھی یہود و منافقین کے ہاتھوں اپنے اہل خانہ پر بدترین بہتانوں کو برداشت کیا تو کبھی اپنی ذات کے حوالے سے غلیظ اسکینڈلوں کو سہا۔ مگر کبھی بددعا دی، نہ انتقام لیا۔

پھر ایک ایک کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے ہر ہر دشمن پر قابو دے دیا۔ آپ چاہتے تو ہر دشمن کو ہلاک کر دیتے اور کچھ نہ ہوتا۔ مگر رحمت للعالمین نے ہر دشمن کو معاف کر دیا۔ ہر ظالم کو بخش دیا۔ ہر قاتل کو چھوڑ دیا۔ جس نے معافی مانگی، جس نے سر جھکایا صرف وہی نہیں بخشا گیا بلکہ بھاگنے والے بھی اس بارگاہ سے پروانۂ عافیت پا گئے۔ اس حلم کے آگے ہر سر خم گیا۔ ہر گردن جھک گئی۔ ہر دشمن دوست اور ہر مخالف گرویدہ ہو گیا۔

صبرِ مصطفیٰ اور سیرتِ مصطفیٰ باخدا بے مثل ہے۔ مگر یہی صبر وہ وصف ہے جس کا کوئی ادنیٰ پرتو بھی مصطفیٰ کے 'عاشقوں' میں ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔

نجات سے بڑھ کر

انسانوں کی یہ طبیعت ہے کہ وہ اپنے ساتھ مہربانی کرنے والے کا احسان مانتے ہیں۔ اس کا شکریہ ادا کرنے سے لے کر اس کی خدمت تک جو بن پڑے وہ جواب میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک طرف انسانوں کی یہ طبیعت ہے اور دوسری طرف یہ کائنات ہے جس کا ذرہ ذرہ یہ گواہی دیتا ہے کہ اس پوری دنیا کو انسانوں کے لیے کسی ہستی نے مسخر کر رکھا ہے۔ اس نے دنیا میں انسان کی ہر ضرورت کا اہتمام اس کے مانگنے سے قبل ہی کر دیا ہے۔

انسان کے اندر پیاس ہے، وہ اپنے باہر صاف اور میٹھا پانی موجود پاتا ہے۔ انسان کے اندر بھوک ہے، وہ اپنے باہر لذیذ اور متنوع خوراک پاتا ہے۔ انسان کے اندر ذوق جمال ہے وہ اپنے باہر رنگ و خوشبو اور صوت و آہنگ سے آراستہ ایک دنیا پاتا ہے۔ یہ اور ان جیسی تمام چیزوں کی طرح انسانوں کے اندر پائے جانے والے جذبۂ شکر گزاری کی کامل تسکین کا ایک ذریعہ بھی اس دنیا میں موجود ہے۔ وہ یہ کہ انسان اُس مالک و خالق کی بندگی کرے جس نے اسے زندگی، صحت، لذت، خوشیوں اور آسانیوں بھری یہ دنیا عطا کی ہے۔

عام طور پر لوگوں کو خدا سے ڈرا کر اس کی بندگی کی طرف بلایا جاتا ہے، مگر درحقیقت خدا کی بندگی انسان کی اپنی فطری ضرورت ہے جو اس کی زندگی کو سکون سے بھر دیتی ہے۔ بندگی بلاشبہ نجات کی شرط ہے کہ غافل و سرکش خدا کے حضور نجات نہیں پائیں گے، مگر بندگی کرنا خدا کو کچھ دینا نہیں بلکہ یہ انسان کے اپنے اندر موجود جذبۂ شکر کی تسکین کا سامان کرنا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ انسان ہر نعمت کو خدا کا کرم سمجھے۔ وہ یاد رکھے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا کی مہربانی ہے۔ یہ حقیقت جان لینے کے بعد انسان نجات سے بڑھ کر اس رب کریم کی شکر گزاری کے لیے عمل کرتا ہے جس نے اسے سب کچھ بن مانگے دیا اور جو آنے والی دنیا میں اس سے بھی بڑھ کر اسے دینے والا ہے۔

نجات بلاشبہ انسانی ضرورت ہے، مگر شکر و محبت میں ڈوبی ہوئی بندگی اس سے کہیں بڑھ کر انسانی ضرورت ہے۔ خوش نصیب ہیں جو اس سعادت کو حاصل کرنے والے ہیں۔

مفادات اور گناہ

انسان طبعاً خود غرض واقع ہوا ہے۔ وہ اپنا فائدہ اور اپنا تحفظ سب سے پہلے دیکھتا ہے۔ یہ خود غرضی اس کے حیوانی وجود کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ وہ ایسا نہ کرے اور اپنے مفادات اور تحفظ کو پیشِ نظر نہ رکھے تو زیادہ وقت نہ گزرے گا کہ وہ موت کے گھاٹ اتر جائے گا یا اسے بہت سے نقصانات اٹھانے پڑیں گے۔

تحفظ اور مفادات کی یہی نفسیات ہے جو انسانوں کو بقائے زندگی کی جدوجہد پر آمادہ کرتی ہے۔ اسی کے لیے انسان شکار کرتا، کھیتی اگاتا، تجارت اور ملازمت کرتا رہا ہے۔ اسی کے لیے انسان مال جمع کرتا، گھر بناتا اور خاندان اور قبیلوں کی شکل میں جُڑ اور مل کر رہتا ہے۔

تاہم مفاد اور تحفظ کی یہ نفسیات ان جائز حدود تک محدود نہیں رہتی۔ بلکہ انسانی تاریخ میں ظلم وستم، ناانصافی، باہمی جھگڑوں اور اختلافات، دوسروں کی جان، مال اور آبرو کی پامالی، ان کی زمینوں پر قبضے، دوسرے ملکوں اور اقوام پر حملے اور انسانوں اور قوموں کو غلام بنا لینے تک کے جو سارے واقعات نظر آتے ہیں ان کے پیچھے اکثر یہی نفسیات کام کر رہی ہوتی ہے۔

غذا اور اجناس کی قلت کے زمانے میں بڑے تاجر اسی وجہ سے ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں۔ سرکاری اہلکار اور حکومتی مناصب پر فائز لوگ اسی وجہ سے رشوت لیتے اور ناجائز مال کھاتے ہیں۔ ایک کمزور کو کسی طاقتور کے ہاتھوں ظلم وستم کا شکار ہوتا دیکھ کر بھی کچھ کرنے کی قدرت کے باوجود لوگ اسی لیے خاموش رہتے ہیں۔

یہ رویہ بظاہر مفادات کا رویہ ہے۔ وقتی طور پر اس کے نتیجے میں انسان اپنے مفادات کا تحفظ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ زیادہ دن نہیں گزریں گے کہ عالم کا پروردگار عدلِ کامل کا دن شروع کر دے گا۔ اس دن رائی کے دانے کے برابر بھی کسی نے اگر

ظلم کر رکھا ہوگا تو وہ اُس سے اِس ظلم کا حساب لے گا۔

اگر کسی کا مال کھایا ہوگا تو اس کا حساب دینا ہوگا۔ کسی کو گالی دی ہوگی تو اس کا جواب دینا ہوگا۔ کسی کی زمین پر قبضہ کیا ہوگا تو اس بوجھ کو بہر حال اتارنا ہوگا۔ کسی کی آبرو پر حملہ کیا یا کسی پر بہتان لگایا یا کسی کو جسمانی یا ذہنی ایذا دی ہوگی تو ان میں سے ہر چیز پر مؤاخذے سے گزرنا ہوگا۔

یہ وہ دن ہوگا جب ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ سب سے بڑا مفاد اصل میں جنت کا حصول تھا۔ اور سب سے بڑا تحفظ جہنم کی آگ سے بچنا تھا۔ چنانچہ جن لوگوں نے دنیا کی زندگی میں جنت کے اس مفاد کو اور جہنم کے اس نقصان کو پیش نظر رکھا ہوگا وہی لوگ اُس روز سرخرو ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دنیوی مفادات سے پہلے ہمیشہ آخرت کے مفاد کے بارے میں سوچتے رہے۔ دنیا کے نقصان اور اس سے بچنے کی فکر سے پہلے جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کے بارے میں فکرمند رہے۔

ایسے لوگ کبھی اپنے مفاد اور تحفظ کے لیے کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ کسی کا مال ناجائز طریقے سے نہیں کھاتے۔ کسی کی آبرو پر حملہ نہیں کرتے۔ اور اگر کبھی کسی وجہ سے ایسا کوئی معاملہ ہو جائے تو فوراً توبہ کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ سامنے والے کی جو حق تلفی ہو جاتی ہے، اس کی پوری تلافی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی توبہ ان کے رب کے حضور مقبول ہوگی۔ رہے وہ لوگ جو اپنے مفاد اور اپنے بچاؤ کے لیے دوسروں کی جان، مال اور آبرو کو نقصان پہنچانے سے بالکل نہیں چوکتے، وہ دراصل سب سے بڑھ کر اپنا نقصان کر رہے ہیں۔ وہ جنت کو چھوڑ کر جہنم کو اپنا ٹھکانہ بنا رہے ہیں۔ جنت کی محرومی سے بڑی کوئی محرومی نہیں۔ اور جہنم کے نقصان سے بڑا کوئی نقصان نہیں۔

دو قسم کی دنیائیں

اس دنیا میں انسان جس طرح احساس اور لذت کا تجربہ کرتا ہے، کوئی دوسری مخلوق اس معاملے میں انسان کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتی۔ انسان کی زبان ذائقے، اس کی ناک خوشبو، اس کا لمس گداز، اس کی نظر رنگ اور اس کی سماعت نغمگی کو جس طرح محسوس کرتے اور اس سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں، وہ ایک انتہائی منفرد نوعیت کی صلاحیت ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان غم والم اور دکھ و تکلیف کو بھی دیگر جانداروں کے برعکس بہت زیادہ محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مادی وجود کے جلنے، کٹنے اور زخم و درد پر تو ہر حیوان تڑپ اٹھتا ہے، لیکن ذلت و محرومی، پستی و بدحالی، مایوسی و پچھتاوے اور غم والم کی آگ کو صرف انسان ہی اپنی جان کا روگ بناتا ہے۔

انسان کی یہ متضاد خصوصیت ایک ایسی دنیا میں پائی جاتی ہے جہاں بیک وقت خوشی و راحت اور غم والم کے سارے سامان بیک وقت موجود ہیں۔ یہاں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی، آگ بھی ہے اور پانی بھی، زہر بھی ہے اور شکر بھی، صحت بھی ہے اور بیماری بھی، موت بھی ہے اور زندگی بھی۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ عنقریب انسان کو ایک نئی دنیا میں بسایا جائے گا۔ اس دنیا کے ایک حصے میں ساری نعمتیں جمع ہوں گی اور دوسرا حصہ ہر طرح کے عذابوں کا گھر ہوگا۔ ایک میں لذت کبھی ختم نہ ہوگی اور دوسرے میں مصیبت۔ ایک میں خوشی کا ڈیرہ ہوگا اور دوسرے میں وحشت کا بسیرا ہوگا۔ پہلی دنیا ان لوگوں کو ملے گی جو خدائے رحمان سے بن دیکھے ڈرنے والے ہوں گے۔ جن کا دل خدا کی یاد اور جن کا وجود خلق کی خدمت کے لیے وقف ہوگا۔ رہی دوسری دنیا تو وہ خدا کو بھول کر جینے والوں کا انجام، مخلوق پر ظلم کرنے والوں کا ٹھکانہ اور حرام کی راہ کے مسافروں کی آخری اور ابدی منزل ہوگی۔

اب اس کا فیصلہ مجھے اور آپ کو کرنا ہے کہ ہم کس طرح کی دنیا میں ابدی طور پر رہنا چاہتے ہیں۔

جنت کی دریافت

پچھلے دنوں مجھے ایک صاحب نے اپنی ایک دریافت سے آگاہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ یہ دریافت ایک سکون بخش ’شاور تھراپی‘ ہے۔ بقول ان کے گرمیوں میں ٹھنڈے اور سردیوں میں نیم گرم پانی کی شاور سے نکلنے والی دھار جب سر اور پیٹھ پر پندرہ منٹ تک وقفے وقفے سے پڑتی رہے تو ساری ذہنی اور جسمانی تھکان ہوا ہوجاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بات شاید اور بھی لوگ جانتے ہوں، لیکن میرے لیے اہم یہ ہے کہ میں نے آدھی سے زیادہ زندگی گزرنے کے بعد اپنے تجربے سے یہ سکون بخش دریافت کی اور اس لیے یہ میرے لیے بہت قیمتی ہے۔

میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ نے اس عمل میں سکون بخشی کو دریافت کیا۔ لیکن اگر آپ چاہتے تو اس تجربے سے دو اور چیزیں بھی دریافت کرسکتے تھے۔ پہلی چیز جنت کی زندگی میں ملنے والی نعمتوں کی دریافت ہے۔ جس طرح آپ ساری زندگی شاور لیتے رہے، مگر ایک روز آپ کو معلوم ہوا کہ ایک خاص طریقے سے شاور لینے سے یہ تطہیر بدن کے ساتھ سکون ذہن کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جنت میں آپ کو جب کوئی نعمت ملے گی تو وہ بظاہر کسی پرانی نعمت کے جامے میں ہوگی، مگر درحقیقت وہ ایک بالکل نئے سرور اور سکون سے آپ کو روشناس کرائے گی۔ جنت میں ہر لمحہ، ہر پہر اور ہر روز انسان عنایتِ رب کے نت نئے پہلو دریافت کیا کرے گا۔ دریافتوں کا یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گا اور یہی انسان کی ابدی خوشی کا ضامن ہوگا۔

دوسری چیز اس دنیا میں رہتے ہوئے پروردگار عالم کی صفات عالیہ کے نت نئے گوشوں کی دریافت ہے۔ بندۂ مومن اس دنیا میں بند آنکھوں کے ساتھ نہیں جیتا بلکہ وہ انفس و آفاق کی نشانیوں، قرآن مجید کی آیات اور زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو دریافت کی نظر سے دیکھا کرتا ہے۔ مثلاً انسان ساری زندگی بے دردی سے میٹھا پانی کھانے پینے اور نہانے دھونے میں

ضائع کرتا رہتا ہے۔ ایک روز صبح اٹھنے پر جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں پانی نہیں ہے اور ایک پہر اسے بغیر پانی کے رہنا پڑے گا۔ کسی اور کے لیے یہ لمحے شاید جھنجھلاہٹ کے ہوں، مگر بندۂ مومن تڑپ کر کہہ اٹھتا ہے کہ پروردگار اس وسیع وعریض کائنات میں کہیں پانی نہیں۔ صرف استثنائی طور پر کرۂ ارض پر پانی پایا جاتا ہے، مگر وہ بھی ناقابل برداشت حد تک کھاری۔ اگر تیری نظرعنایت سورج، ہوا، سمندر اور بادل کو ملا کر بارش نہ برسائے تو ساری مخلوقات پیاس سے مرجائے۔ اس لمحے بندۂ مومن پر پانی کے ذریعے خدا کی رحمت اور ربوبیت کی ایک نئی دریافت سامنے آجائے گی۔

میں نے ان سے مزید عرض کیا کہ حال ہی میں ایک جہاز کراچی ایئرپورٹ کے پاس گر گیا۔ حادثے میں تمام مسافر ہلاک ہوگئے۔ مسافروں میں ایک شخص ایسا تھا جسے ڈینگی بخار ہوگیا تھا اور وہ مجبوری کی بنا پر روانہ نہ ہوسکا۔ ایک بندۂ مومن کے لیے یہ لمحے خدا کی حکمت کاملہ کی دریافت کے لمحے ہوتے ہیں کہ اس کے ہر کام میں کسی نہ کسی پہلو سے کوئی حکمت اور بہتری ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم خدا کی کبریائی کے جو نغمے بلند کرتا ہے، بندۂ مومن جدید سائنسی مطالعے کی بنیاد پر کائنات کی عظمت میں اس کی تصدیق پالیتا ہے۔ جو کائنات 13.7 ارب سال تک روشنی کی رفتار (۳ لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ) پر بھی ختم نہ ہو وہ اپنے خالق کی عظمت کا کیسا تعارف ہوگی۔ بندۂ مومن کے لیے ایسی ہر بات خدا کی عظمت و کبریائی کی ایک دریافت بن جاتی ہے۔

آپ بھی ''شاور تھراپی'' کے ساتھ خدا کی مہربانی کو دریافت کرسکتے تھے کہ کس طرح پانی کی دنیا میں موجودگی ایک معجزہ ہے۔ کس طرح اس کی دھاریں آپ کے لیے باعث سکون ہیں۔ عنایتِ رب کی یہ دریافت آپ کی زبان پر الحمدللہ کے وہ نغمے جاری کردیتی جو اہل جنت کا ترانہ ہیں۔ آج جن زبانوں پر یہ ترانہ جاری ہے، کل وہی جنت کے وارث بنائے جائیں گے۔

نوجوانوں کا مسئلہ

آج کل اکثر والدین اپنے بچوں اور خاص کر نوجوانوں کی بنا پر بہت پریشان رہتے ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کی دوستیاں، عشق ومحبت کے معاملات، ٹی وی، انٹرنیٹ اور موبائل کے ذریعے باآسانی دستیاب ہوجانے والے نامناسب مواد وغیرہ نے والدین کی فکروں میں بہت اضافہ کردیا ہے۔ بعض جگہوں پر معاملات آگے بڑھتے ہیں اور بات بے راہروی، ڈانس پارٹیوں میں شرکت اور منشیات وغیرہ تک جا پہنچتی ہے۔

یہ صورتحال انفارمیشن ایج کا وہ ضمنی نتیجہ ہے جس سے بچنا ممکن نہیں۔ آج موبائل، کیبل اور ڈش ٹی وی اور ان پر آنے والے ان گنت چینلز اور انٹرنیٹ وغیرہ زندگی کا ایک لازمی جز بن گئے ہیں۔ مخلوط تعلیمی اداروں کا عام ہونا اور معاشی صورتحال کی بنا پر تاخیر سے شادی وہ عوامل ہیں جنھوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے۔ اس صورتحال میں ناسمجھ بچوں اور نوجوانوں کے معاملات کی خرابی سامنے آنے پر حیرت نہیں ہونی چاہیے، بلکہ ایسا نہ ہونا باعث حیرت ہونا چاہیے۔

آج کل میڈیا پر ہر طرح کے چینل دستیاب ہیں۔ ان میں زیادہ تر لوگ فلموں اور ڈراموں کے وہ چینلز دیکھتے ہیں جو دراصل عشق ومحبت کی درسگاہیں ہوتی ہیں۔ ان درسگاہوں میں نوخیز ذہنوں کو کتابِ عشق کے ہر باب کا بالتفصیل نظری مطالعہ کرایا جاتا اور ساتھ میں عملی تربیت کے میدان میں اترنے کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے۔ اس عمر کا عشق ہارمون کی حرکت ہوتی ہے، جسے مزید متحرک کرنے کی خدمت انگلش اور ہندی فلموں کے فحش مناظر اور انٹرنیٹ کی بے لگام دنیا بخوبی سرانجام دیتی ہے۔

نوجوان اس 'تعلیم' کے زیور سے آراستہ ہوتے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ مخلوط تعلیمی اداروں میں صنفِ مخالف کا ساتھ اور قربت کے مواقع، موبائل اور چیٹنگ کے ذریعے سے بے روک و ٹوک گفتگو کے امکانات انھیں وہ مواقع دیتے ہیں کہ وہ اس 'تعلیم وتربیت' کے مطابق اپنی عملی

زندگی کا آغاز کریں۔ یوں والدین کے لیے مسائل کی ایک دنیا پیدا ہو جاتی ہے۔

اس معاملے میں والدین کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اپنے بچے اور بچی کا مسئلہ پیدا ہونے سے قبل آنکھیں بند کیے رہتے ہیں۔ وہ گھر میں بے روک وٹوک ہر طرح کے چینلز اطمینان سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اولاد پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ وہ بچوں کو موبائل لے کر دیتے ہیں، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کو ان کی بنیادی ضرورت سمجھ کر لگواتے ہیں، انہیں مخلوط تعلیمی اداروں میں بھیجتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ ان چیزوں کے ساتھ وہ سارے نتائج ناگزیر ہیں جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس مسئلے کا حل یہی ہے کہ والدین مسئلہ پیدا ہونے سے قبل محتاط رہیں۔ وہ بچوں کو ان کی فرمائش پر ہر چیز فوراً لے کر نہ دیں۔ چیز جب فوراً لے کر دے دی جاتی ہے تو بچے اسے اپنا حق سمجھتے ہیں اور اس میں والدین کا کوئی احسان اور اپنی کوئی ذمے داری محسوس نہیں کرتے۔ بچوں کو یہ سمجھانا ضروری ہے کہ دنیا میں ہر چیز کی قیمت دو صورتوں میں ادا کرنی ہوتی ہے۔ ایک پیسے کی شکل میں جو والدین دے رہے ہیں اور دوسری ذمے داری کی شکل میں جو بچے کو ادا کرنی ہوگی۔ چنانچہ جب انھیں کوئی سہولت اور آسانی فراہم کریں تو ان پر یہ واضح کریں کہ ان چیزوں کے غلط استعمالات کیا ہوتے ہیں تاکہ بچے اپنی ذمے داری سے آگاہ رہیں۔

سہولت دینے کے بعد بچوں کی مسلسل نگرانی کریں۔ اس کی سرگرمیوں اور خاص کر اس کے دوستوں پر نظر رکھیں۔ مگر یہ نگرانی پولیس کی نہیں بلکہ شفیق والدین اور ہمدرد دوست کی ہونی چاہیے۔ بچوں کے ساتھ درشتی، سختی اور لاتعلقی کے بجائے مسلسل محبت اور گفتگو کا ایک رابطہ استوار کیے رکھیں۔ بچے کو اعتماد دیں، لیکن اسے یہ بھی سکھائیں کہ والدین کا اعتماد توڑنا ایک بہت بڑا جرم ہے۔

اپنی اخلاقی اقدار سے بچوں کو روشناس کرائیں اور ان کی اہمیت بچوں کے دل و دماغ میں بٹھائیں۔ نیک صحبت اور اچھی کتابوں کو خود اختیار کریں، تبھی آپ کے بچے ان کو اختیار کریں گے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو برائی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہیں۔ بچوں کو بلوغ کی عمر کے

مسائل اور شادی کی اصل غایت و حقیقت سے آگاہ کریں کہ یہ دو افراد کا ملن نہیں بلکہ ایک خاندان کی بنیاد رکھنے کا عمل ہے جس میں لڑکے یا لڑکی کے علاوہ بھی کئی چیزیں دیکھنے کی ہوتی ہیں۔

تاہم اس سب کے بعد بھی بچوں کی طرف سے غلطی ہو جائے تو دھونس اور دھمکی کے بجائے پیار و محبت اور گفتگو سے مسئلے کو حل کریں۔ بچے کی تربیت اگر اچھی ہے تو یہ ممکن نہیں کہ وہ والدین کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائے گا۔ ایسے بچوں سے غلطی ہی ہوا کرتی ہے، جسے نظر انداز کرنا چاہیے یا معاف کر دینا چاہیے۔ یہ وہ احتیاطی تدابیر اور اہتمام ہے جس کے بعد امید کی جا سکتی ہے کہ بچوں کی طرف سے والدین کو وہ مسائل پیش نہ آئیں جو والدین کی راتوں کی نیند اڑا دیتے اور انہیں طرح طرح کی فکروں سے دوچار کر دیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

وہ آدمی نادان ہے جو ماضی سے نہیں سیکھتا
اور بار بار پرانی غلطیاں دہراتا ہے مگر
وہ آدمی زیادہ احمق ہے جو ماضی سے سیکھتا ہے
اور ہر دفعہ نئی غلطی کرتا ہے (ابو یحییٰ)

جب آپ کو ہر شخص سے شکایت ہونے لگے
تو دیکھ لیجیے کہ خرابی کہیں آپ ہی کے اندر تو نہیں
(ابو یحییٰ)

جنت اور عزتِ نفس

دورِ جدید میں جہاں دیگر علوم وفنون پر بہت غیر معمولی کام ہوا ہے وہیں وجودِ انسانی پر بھی ہر ہر پہلو سے بہت غیر معمولی تحقیقی کام ہوا ہے۔ خاص کر انسانی شخصیت، نفسیات اور رویوں پر ہونے والے کام کے نتیجے میں ہماری معلومات بہت بڑھ چکی ہیں۔ انسانی نفسیات پر ہونے والے کام سے یہ بات نمایاں ہوکر سامنے آئی ہے کہ بنیادی انسانی ضروریات میں جس طرح کھانا اور پانی شامل ہے اسی طرح عزتِ نفس بھی ایک بنیادی انسانی ضرورت ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دیگر بنیادی ضروریات مثلاً ہوا، پانی، کھانا وغیرہ تو انسان اور دیگر جانوروں میں مشترک ہیں، لیکن عزتِ نفس وہ ضرورت ہے جو صرف اور صرف انسان کا خاصہ ہے۔

عزتِ نفس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی قدر کی جائے۔ اس کی ذات کا اعتراف کیا جائے۔ اس کے کاموں کی قدر کی جائے۔ اس کی تعریف وتوصیف کی جائے اور اس کی عزت ووقار کو ہر حال میں ملحوظ رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ جو انسانی نفسیات کو سب سے بڑھ کر جانتے ہیں، انھوں نے اپنے پاک کلام میں جہاں اہل جنت کی نعمتوں کا تذکرہ فرمایا ہے وہاں جگہ جگہ اس چیز کو بیان کرنے کا بھی اہتمام کیا ہے کہ جنت وہ مقام ہے جہاں نہ صرف انسان کے جسمانی وجود کی ضروریات کا تمام تر خیال رکھا جائے گا بلکہ اس کی منفرد نفسیاتی ضرورت یعنی عزتِ نفس کی تسکین کا بھی مکمل اہتمام کیا جائے گا۔

اللہ سے ملاقات، اس کا دیدار، اس کی رضا کا پروانہ، اس کی طرف سے اعمال کی قبولیت اور قدردانی، اس کے پاس سے شرابِ طہور کا براہ راست عطا کیا جانا، فرشتوں کا سلام اور تعریف کرنا جیسی چیزیں قرآن وحدیث میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہیں۔ یہ اور ان جیسے دیگر انعامات کے بیان کا مقصد اس بات کی وضاحت ہے کہ جنت صرف جسمانی راحت کی جگہ نہیں بلکہ کامیاب لوگوں کی بھرپور قدردانی اور عزتِ نفس کی تسکین کی بھی آخری جگہ ہوگی۔ یہ اس بات کا اظہار بھی ہے کہ جدید نفسیات کی ترقی سے بہت پہلے اللہ تعالیٰ یہ جانتے تھے کہ انسانی ضروریات کیا کیا ہیں۔

مال و دنیا اور دل

’’جناب! جب گھر میں نت نیا سامان آتا ہے تو اس سے بہت خوشی ہوتی ہے۔ کیا یہ دنیا کی محبت کی علامت ہے؟‘‘، اس پہلے سوال کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ حاضرین میں سے ایک صاحب نے دوسرا سوال کر ڈالا۔ ’’کیا مال جمع کرنا کوئی بری بات ہے۔ عام لوگوں کو تو شاید اس سے فرق نہیں پڑتا لیکن ہم لوگ جو آخرت کو مقصد بنا کر جیتے ہیں، ان کا دل اس احساس سے کچھ بوجھل رہتا ہے، مگر کیا کیجیے کہ مستقبل کی ضروریات کے لیے کچھ پس انداز کرنا بھی مجبوری ہے۔‘‘

یہ دو سوال دو افراد نے کیے تھے، مگر یہ مسئلہ ہر شخص کا تھا۔ اس لیے ہر سماعت عارف کا بصیرت افروز جواب سننے کی منتظر تھی۔ دیر تک جواب نہ آیا۔ جب خاموشی کا بوجھ کانوں میں گرانی پیدا کرنے لگا تو عارف نے سر اٹھا کر خود ایک سوال کر دیا۔ ’’کشتی کس لیے بنائی جاتی ہے؟‘‘، پہلے سائل نے جواب دیا۔ ’’پانی میں سفر کرنے کے لیے۔‘‘، ’’اور اگر پانی کشتی میں آجائے تو......؟‘‘۔ عارف نے دوسرا سوال کیا تو فوراً جواب آیا: ’’کشتی ڈوب جائے گی۔‘‘

’’بس یہی تمثیل مؤمن اور مال و دنیا کا صحیح تعلق بیان کرتی ہے۔ مال و دنیا سے متعلق ہزار سوال پیدا ہوسکتے ہیں، مگر یہ تمثیل یاد رہے تو ہر سوال کا جواب خود مل جاتا ہے۔ مؤمن کا وجود کشتی کی طرح ہوتا ہے۔ اسے ترک دنیا کی اجازت نہیں۔ اسے دنیا میں جینا ہے کہ یہی امتحان ہے مگر مال کے بغیر جیا نہیں جاسکتا۔ جیسے کشتی پانی کے بغیر نہیں چل سکتی۔ کشتی کے ہر طرف پانی ہوتا ہے، مگر اس کے اندر نہیں ہوتا۔ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ اسی طرح مؤمن کے ہر طرف دنیا ہوتی ہے۔ مگر اس کے دل میں نہیں ہوتی۔ چیزیں اس کے گھر میں آتی ہیں، دل میں نہیں۔ مال بینک اسٹیٹمنٹ میں نظر آتا ہے، دل کے بینک میں صرف آخرت کا حساب ہو رہا ہوتا ہے۔ اگر یہ ہے تو بہت دولت بھی نقصان نہیں پہنچاتی۔ یہ نہیں تو بہت کم دولت بھی انسان کو سانپ کی طرح ڈس لیتی ہے۔‘‘

زنبور کا دور

حکیم لقمان کے متعلق ایک لطیفہ مشہور ہے۔ انھیں موت کے علاج کی تلاش تھی۔ اس مقصد کے لیے برسہا برس تک وہ ایک ٹوٹکا کرتے رہے جس میں رات کے وقت جنگل میں جا کر خاص قسم کی لکڑیاں جلانی ہوتی تھیں۔ 23 برس بعد جا کر وہ وقت آیا کہ جب ایک خاص لکڑی جلانے سے علاج و معالجے پر مکمل دسترس رکھنے والا وہ جن نمودار ہوا جسے موت کا علاج معلوم تھا۔ مگر اس روز حکیم صاحب کی ڈاڑھ میں درد تھا۔ یہ درد اتنا زیادہ تھا کہ جس لمحے وہ جن نکلا بے اختیار وہ اس سے پوچھ بیٹھے کہ ڈاڑھ کے درد کا کیا علاج ہے۔ اس نے جواب دیا۔ زنبور (کیل کھینچ کر باہر نکالنے والا آلہ)۔ یہ کہہ کر وہ آگ میں جل کر ہمیشہ کے لیے مر گیا۔

یہ لطیفہ ڈاڑھ کے درد کی شدت کو بیان کرنے کے لیے حکما اکثر سنایا کرتے ہیں۔ جدید سائنس یہ بتاتی ہے کہ انسان کے مضبوط دانتوں کے نیچے موجود اعصاب انتہائی حساس ہوتے ہیں۔ کسی بنا پر دانت کمزور ہو جائے یا ٹوٹ جائے اور یہ اعصاب متاثر ہو جائیں تو ان میں ہونے والا درد انسان کو کھانے، پینے اور سونے تک نہیں دیتا۔ درد کی ٹیسیں اتنی شدید ہوتی ہیں کہ کوئی دوسری تکلیف اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اس پس منظر میں یہ لطیفہ دانت کے درد کی شدت کو بہت خوبی سے بیان کرتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ ایک اور حقیقت کا بھی بیان ہے جس کی طرف بالعموم لوگوں کی توجہ نہیں جاتی۔ وہ یہ کہ زمانۂ قدیم میں علاج معالجے کی سہولیات کتنی کم تھیں۔ دانتوں کی تکلیف کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ زنبور کی مدد سے دانت کو کھینچ کر باہر نکال دیا جائے۔ یہ اپنی ذات میں ایک انتہائی تکلیف دہ عمل تھا جس کا تصور بھی لرزا دینے کے لیے کافی ہے۔

تاہم آج میڈیکل سائنس کی بے پناہ ترقی کے بعد دانتوں کی بدترین تکلیف کا بھی نہ صرف مکمل

علاج موجود ہے، بلکہ اس علاج میں دانت کو مکمل طور پر سُن کر دیا جاتا ہے۔ جس کے بعد تکلیف شدہ دانت کی مرمت یا اسے نکال کر مصنوعی دانت لگوانے کا عمل نسبتاً بہت سہل ہو چکا ہے۔ سُن کر دینے والے انجیکشن اور درد ختم کرنے والی دواؤں نے علاج کی تکلیف کو بہت کم کر دیا ہے۔

دورِ جدید میں جس شعبے میں انسانوں نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے وہ میڈیکل سائنس کا شعبہ ہے۔ اسی بنا پر آج نہ صرف انسانوں کی اوسط عمر بڑھ گئی ہے بلکہ انسان جتنا عرصہ بھی زندہ رہتے ہیں، بہت زیادہ آرام اور صحت کے ساتھ بھرپور زندگی گزارتے ہیں۔ جبکہ زمانۂ قدیم کا انسان قدم قدم پر زخم کا شکار ہوتا اور علاج کی سہولیات نہ ہونے کی بنا پر بے پناہ تکلیف جھیل کر اس دنیا سے رخصت ہو جاتا تھا۔ انسانی زندگی میں یہ آسانی بظاہر جدید سائنسی ترقی کی دین ہے، مگر درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی ایک عنایت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہیں جنھوں نے انسانی بدن میں وہ امکانات رکھے ہیں کہ وہ سُن کر دینے اور درد ختم کر دینے والی دواؤں کا اثر قبول کرتا ہے۔ انسانی جسم تعاون کرنا چھوڑ دے تو آج بھی کوئی علاج مؤثر نہیں ہو سکتا۔

اس پہلو سے اگر دیکھیے تو بلاشبہ آج کا انسان زمانۂ قدیم کے انسان سے کہیں زیادہ آسانی اور آسائش کے ساتھ زندہ ہے۔ مگر آج کا انسان ہی سب سے بڑھ کر اپنے اُس مہربان رب سے غافل ہے جو اسے تمام تر نعمتیں اور آسانیاں دے رہا ہے۔ زمانۂ قدیم کا انسان زنبور سے دانت نکلواتا تھا اور آج کا انسان سُن کر دینے والی دوا کے ساتھ دانت نکلواتا ہے۔ مگر پرانا انسان شکر کے بجائے شرک سے اللہ تعالیٰ کو جواب دیتا تھا تو آج کا انسان شکر کے بجائے غفلت اور معصیت سے خدا کو جواب دیتا ہے۔ اب ایسے میں اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ اس انسان کو حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا کر ایک نئی دنیا بنائی جائے۔ جہاں رب کے شکر گزار بندے ہر طرح کی تکلیفوں سے محفوظ رہ کر حیات ابدی کا لطف اٹھائیں گے اور ناشکرے ہمیشہ ڈاڑھ کے درد اور زنبور کی چوٹ کا مزہ چکھیں گے۔

پہلے جہنم کیوں؟

قرآن کریم میں جگہ جگہ یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن اور صالح بندوں کو جنت کی ابدی بادشاہی سے سرفراز کریں گے۔ یہ وہ وعدہ ہے جو ہر بندۂ مؤمن کو سرشار کردینے کے لیے کافی ہے۔ مگر اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں جب اہل ایمان آخرت کے حوالے سے دعا مانگتے نظر آتے ہیں تو ہر جگہ وہ جہنم کے عذابوں سے پناہ مانگتے یا پھر جنت مانگنے سے قبل جہنم سے عافیت کی درخواست کرتے ہیں۔ مثلاً آل عمران 16:3، آل عمران 191:3، فرقان 65:25 وغیرہ۔

ایک سوچنے والے ذہن میں یہ فطری سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا کیا سبب ہے؟ قرآن مجید کا گہرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اس کا سبب اہل ایمان کی وہ معرفت ہے جو انھیں عطا کی گئی ہوتی ہے۔ اس معرفت کا تقاضا ہے کہ انسان ایمان کو حقیقی طور پر اختیار کرے، عمل صالح کی راہ پر چلے اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین رکھے، مگر کبھی اپنے متعلق کسی گھمنڈ اور خوش فہمی کا شکار نہ ہو۔ بندۂ مؤمن سے مطلوب ہے کہ وہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی اپنے عمل کو کچھ نہ سمجھے۔ اس کی نظر اپنے عمل سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی عظمت پر ہو جس کے مقابلے میں ہر عمل بے حد پست اور کم ہے۔ اس کی نظر اللہ تعالیٰ کی اُس توفیق پر ہو جس کے بغیر انسان کوئی نیکی اختیار نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد انسان اپنے اچھے اعمال سے زیادہ اپنی کوتاہیوں کو یاد رکھتا ہے۔ انکساری کی یہ سوچ انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ جنت مانگنے سے پہلے ہمیشہ جہنم سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے۔

معرفت کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ انسان جہنم کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھے۔ بندۂ مؤمن دنیا میں رہتے ہوئے آخرت میں جیتا ہے۔ وہ قرآن کی آنکھ سے آخرت کے احوال کو اپنے سامنے زندہ دیکھ سکتا ہے۔ انسان کے عجز کا حال یہ ہے کہ وہ دنیا کی معمولی سختی؛ سوئی کا چبھنا، دانت کا

درد وغیرہ برداشت نہیں کرسکتا، تو وہ جہنم کی سختی اور شدت کو کس طرح معمولی لے سکتا ہے۔

چنانچہ جس طرح دنیا میں انسان کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نعمت کے حصول سے قبل مصیبت سے بچنے کی فکر کرتا ہے، اسی طرح آخرت کے معاملے میں بھی اس کی اولین ترجیح یہ ہوتی ہے کہ جنت میں داخلے سے قبل اس بات کو یقینی بنالیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اسے جہنم سے بچالیں گے۔ چنانچہ اس کی دعا کا آغاز اپنے گناہوں کی بخشش اور جہنم سے پناہ و عافیت طلب کرنے سے ہوتا ہے۔ جہنم کی معرفت کے بعد یہ عین فطری رویہ ہے۔ جبکہ اس کے برعکس رویے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ابھی آخرت کے احوال کی معرفت حاصل نہیں ہوئی۔

مؤمن کی معرفت کا تیسرا پہلو جو جہنم کو اس کی دعاؤں میں فوقیت دے دیتا ہے وہ اس بات کا ادراک ہے کہ ابھی وہ زندہ ہے اور امتحان کی مشقت ابھی باقی ہے۔ اس کا جو بھی نیک و صالح عمل ہے وہ حال میں ہے۔ مستقبل کا حال صرف اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔ چنانچہ یہ ممکن ہے کہ اس کا خاتمہ حسن عمل پر نہ ہو۔ ایسے میں جہنم سے عافیت کی دعا دراصل یہ درخواست ہوتی ہے کہ اسے دنیا میں برے اعمال اور نتیجتاً آخرت میں برے انجام سے بچایا جائے۔

صرف جنت مانگنے کے بجائے صرف جہنم کی پناہ مانگنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آخرت میں انسان کو اگر جہنم سے بچالیا گیا تو لازماً اسے جنت میں داخل کیا جائے گا۔ جبکہ جنت میں داخل ہونے والے کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اپنے برے اعمال کی بنا پر میدان حشر کی سختیاں اور جہنم کے عذاب بھگت کر جنت میں داخل ہوں گے۔ چنانچہ جہنم اور اللہ کی پکڑ سے پناہ مانگنا گویا اس چیز کو یقینی بنانا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو براہِ راست جنت میں داخل فرمائیں۔

خلاصہ یہ کہ انسان ایک انتہائی کمزور مخلوق ہے جبکہ جہنم بدترین عذاب کی جگہ ہے۔ ایسے میں عقلمندی یہی ہے کہ جنت مانگنے سے پہلے ہمیشہ جہنم سے اللہ کی پناہ مانگی جائے۔

خواہشات اور گناہ

خواہش گناہ کی طرف لے جانے والے عوامل میں سب سے بڑا عامل ہے۔انسان کی تخلیق جس ڈھنگ پر ہوئی ہے اس میں انسان کے اندر بہت سی جبلتیں رکھ دی گئی ہیں۔مثلاً کھانے پینے، تحفظ اور جنسی تعلق قائم کرنے کی جبلتیں وغیرہ۔ یہ اور ان جیسی دیگر جبلتوں سے انسان کی ضروریات پیدا ہوتی ہیں۔جبلتوں کے ساتھ انسان کو ایک ذوقِ جمال بھی عطا کیا گیا ہے۔وہ ضرورت سے آگے بڑھ کر لذت، خوبصورتی اور کشش جیسے تصورات سے نہ صرف واقف ہے بلکہ ان کی طرف لپکتا ہے۔ یہ ضروریات اور جمالیات جب اپنا ظہور کرتے ہیں تو خواہشات جنم لیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں چونکہ انسان کو امتحان کے تحت پیدا کیا ہے۔اس لیے خواہشات کی تسکین کے لیے اسے کھلی چھوٹ نہیں دی ہے۔ بلکہ اس کی ضروریات اور خواہشات کو ایک خاص دائرے کا پابند بنایا ہے۔مگر انسان اپنے امتحان کو سمجھنے کے بجائے خواہشات کے گھوڑے کو بے لگام چھوڑ دیتا ہے۔جس کے بعد حلال حرام، جائز ناجائز اور صحیح و غلط کی بحث اس کے لیے غیر متعلق ہو جاتی ہے۔اور رب کی نافرمانی انسان کی زندگی کا معمول بن جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے تمام پاکیزہ اشیا کا کھانا پینا حلال قرار دیا ہے۔مگر اکثر انسانی معاشروں میں خنزیر کا گوشت اور شراب معمول کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے تعلق کو انسانوں کے لیے جائز قرار دیا ہے۔مگر بہت سے انسان اس دائرے سے باہر نکل کر زنا کی وادیوں میں اپنی خواہشات کی تسکین ڈھونڈتے رہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے زیب و زینت کو جائز قرار دیا ہے۔مگر انسانی معاشروں میں زیب و زینت اکثر فحاشی، عریانی اور خواتین کی نمائش کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

یہ اور ان جیسی متعدد مثالیں یہ بتاتی ہیں کہ ضروریات کی تکمیل اور جمالیات کی تسکین کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے جائز قرار دیا ہے، مگر انسانوں کی اکثریت ان چیزوں کے پیچھے چلتے

چلتے رب کی نافرمانی کی منزل تک جا پہنچتی ہے۔وہ خواہش کے لیے خدا کی اطاعت کا راستہ چھوڑ کر شیطان کی پیروری کا طریقہ اختیار کر لیتی ہے۔وہ شیطان جو اللہ تعالیٰ کا مجرم ہے اور جس نے اللہ تعالیٰ کو یہ چیلنج دیا تھا کہ وہ انسانوں کو اپنا شکر گزار نہیں پائیں گے۔بدقسمتی سے شیطان کے اس چیلنج کو انسان خواہشات کی پیروی میں درست ثابت کر دیتے ہیں۔

ایسے میں بندۂ مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات کے معاملے میں ہمیشہ یہ یاد رکھے کہ شیطان خواہش کے دروازے سے اس کے دل میں داخل ہو سکتا ہے۔چنانچہ وہ خواہش کے اس دروازے پر تقویٰ اور پرہیزگاری کی چوکی قائم کرے۔وہ ضمیر کے پہرے دار کو اس چوکی پر نگران مقرر کرے۔ وہ مسلسل یہ جائزہ لیتا رہے کہ کہیں خواہش کے دروازے سے ضروریات اور جمالیات کے ساتھ گناہ اور نافرمانی تو اس کے حرمِ دل میں داخل نہیں ہو رہے۔کہیں اس کی نگاہ، اس کی زبان، اس کا پیٹ اور دیگر اعضائے جسمانی حرام کی آماجگاہ تو نہیں بن رہے۔کبھی ایسا ہو تو اُسے چاہیے کہ فوراً اپنے رب کی طرف رجوع کرے۔اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگے۔ توبہ اور تقویٰ کا راستہ اختیار کرے۔وہ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ کو غفور و رحیم پائے گا۔ وگرنہ اس معاملے میں غفلت کا رویہ دل کو سیاہ کر دیتا ہے اور انسان خدا کو چھوڑ کر آخر کار خواہشِ نفسانی کو اپنا معبود بنا لیتا ہے، (الفرقان:43)۔اور جو شخص یہ کام کرے گا وہ عنقریب اپنے گناہوں کا انجام جہنم کی آگ کی شکل میں بھگت لے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

جو وقت کو برباد کرتا ہے

وقت اسے برباد کر دیتا ہے (ابو یحییٰ)

خدا کی طاقت

"جانتے ہو خدا کی طاقت کی انتہا کیا ہے؟"، آج گفتگو کا آغاز عارف نے ایک سوال سے کیا تھا۔ یہ سوال کیا تھا علم وحکمت کے موتیوں کی ہونے والی برسات کی تمہید تھی۔ اس لیے لوگ خاموش نظروں اور سوالیہ چہرے کے ساتھ عارف کی سمت دیکھتے رہے تو وہ گویا ہوئے: "ایک ایسی دنیا میں جہاں خدا نظر نہیں آتا، جہاں اس کے منکر اور نافرمان عیش کرتے نظر آتے ہیں، جہاں انسان کو کلی اختیار اور آزادی حاصل ہے وہاں بھی حکم اسی رب کا چلتا ہے۔"

پھر وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولے: "انسان کو کب اور کہاں پیدا ہونا ہے۔ کب مرنا ہے۔ کیا کمانا اور کیا کھانا ہے۔ کہاں رہنا اور کہاں بیاہنا ہے۔ اولاد کتنی ہوگی۔ رزق کتنا ملے گا۔ رنگ وروپ، شکل، اور صلاحیت کیسی ہوگی۔ خاندان اور قوم کون سی ہوگی۔ زندگی میں کیا ملے گا۔ کیا نہیں ملے گا۔ غرض زندگی کا ہر بنیادی اور اہم معاملہ اور زندگی کا ہر دائرہ اللہ کے اذن سے متعین ہوتا ہے۔ اس دائرے کے اندر انسان کو بس کچھ عمل کرنے کا ایک محدود اختیار حاصل ہے۔ اس میں بھی اعمال کے نتائج صرف اللہ کی مرضی پر مرتب ہوتے ہیں۔ اب یہ بتائیے کہ جو خدا غیب میں رہ کر اتنا طاقتور ہے وہ سامنے آئے گا تو انسانی عجز کا عالم کیا ہوگا؟"

"انسان تو مجبور محض ہو جائیں گے۔"، ایک صاحب نے جواب دیا تو عارف کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ بولے: "یہی عجیب بات ہے۔ انسان اگر مؤمن ہوا تو وہ دن اس کے عجز کا نہیں بادشاہی کا دن ہوگا۔ بادشاہ بھی ایسا کہ جو وہ مانگے ملے گا اور جو چاہے وہ دیا جائے گا۔ دنیا میں انسان کو جو عجز اور محرومی درپیش تھی اس کا ازالہ ہو جائے گا...... جانتے ہو کہ یہ ابدی بادشاہی کس چیز کا بدلہ ہے۔" خاموشی کا ایک وقفہ آیا اور پھر عارف کی صدا بلند ہوئی: "یہ بدلہ ہے دنیا میں اپنی محدود آزادی کے مقابلے میں خدا کی طاقت کو دریافت کرنے اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا۔ جنت اسی دریافتِ عجز کا بدلہ ہے۔ بادشاہی اسی غلامی کا بدلہ ہے۔"

تعجب کی بات

دنیا بھر میں امن وامان برقرار رکھنے کے لیے پولیس کا محکمہ قائم کیا جاتا ہے۔ جرائم کی روک تھام اور مجرموں کو گرفتار کرکے عدالت میں پیش کرنا پولیس کی بنیادی ذمے داری ہوتی ہے۔ قانون اور پولیس کی گرفت سے بھاگ نکلنا ہر مجرم کی کوشش ہوتی ہے۔ لیکن ایک دفعہ مجرم کی نشاندہی ہو جائے تو کم ہی مجرم پولیس اور قانون کی گرفت سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ پولیس سرگرمی سے ان کا تعاقب کرکے آخر کار انھیں گرفتار کر لیتی ہے۔

عجیب بات ہے کہ انسانی قانون کی خلاف ورزی کرنے والے جلد یا بدیر پکڑے جاتے ہیں، لیکن پروردگار عالم کے قانون کی نافرمانی کرنے والے بدترین مجرم ساری زندگی بھاگتے رہتے ہیں لیکن انھیں پکڑنے کے لیے خدا کی قوت حرکت میں نہیں آتی۔ قاتل، بدکار، کرپٹ، راشی، ظالم، فریبی، مشرک اور گناہ گار ساری زندگی آزاد رہتے ہیں۔ وہ خالق اور مخلوق کے حقوق تلف کرتے رہتے ہیں مگر فرشتوں کی فوج انھیں پکڑنے کی زحمت گوارا نہیں کرتی۔

یہ صورتحال بظاہر بڑی تعجب انگیز لگتی ہے، مگر درحقیقت یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ اللہ کا ہر مجرم کہیں بھی جائے اور کہیں بھی بھاگے دراصل خدا کی سمت ہی بڑھ رہا ہوتا ہے (انشقاق)۔ اس کا ہر اٹھتا قدم اور زندگی کا ہر گزرتا لمحہ اسے خدا کی گرفت یعنی موت سے قریب کر رہا ہوتا ہے۔ یہ موت انسان کو دور کی چیز لگتی ہے لیکن خدا کے حساب میں یہ چند سیکنڈ کی مہلت بھی نہیں ہوتی۔ جس مجرم کی مہلت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھنے کے بجائے کم ہو رہی ہو اور جو مجرم خود چل کر گرفتار ہونے آ رہا ہو اسے پکڑنے کے لیے تگ ودو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

اس لیے تعجب اس بات پر نہیں ہونا چاہیے کہ خدا مجرموں کو نہیں پکڑ رہا۔ حیرت ان پر ہونی چاہیے جو اس یقینی پکڑ کے باوجود جرائم کیے جا رہے ہیں۔

عجز اور قدرت

معاشرے میں حکومتی نظم ونسخ قائم کرنا انسانوں کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اگر کچھ لوگوں کو حکومت کرنے کا اختیار نہ دیا جائے تو معاشرے میں انارکی پھیل جائے گی۔ چنانچہ امن وامان کے قیام، بیرونی جارحیت سے اپنے دفاع اور دیگر بہت سے اہم معاملات چلانے کے لیے حکومت کا نظم قائم کیا جاتا ہے اور اسے بہت سے اختیارات دیے جاتے ہیں۔ مگر ان اختیارات کا نتیجہ بارہا یہ نکلتا ہے کہ حکومت کرنے والے اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہیں اور طرح طرح کی قانونی پابندیوں اور مطالبات میں عام لوگوں کو جکڑتے چلے جاتے ہیں۔

خاص کر ترقی پذیر ممالک میں جہاں عوام میں بہت زیادہ شعور نہیں ہوتا، صاحب اقتدار طبقات طرح طرح کے غیر ضروری قانون بنا کر عوام کو اپنے شکنجے میں جکڑے رکھتے ہیں۔ عام لوگ جب ان بے جا قوانین کی پابندی نہیں کر پاتے تو قانون کے رکھوالے انھیں سخت سزاؤں اور جرمانے کا خوف دلا کر ان سے ناجائز پیسہ حاصل کرتے ہیں۔ نتیجتاً عوام خوف کے عالم میں زندگی گزارتے اور جبر کی اس چکی میں پستے رہتے ہیں۔

حکمران جتنے بھی طاقتور ہوں، ان کے اختیار واقتدار کی ایک حد ہوتی ہے۔ لیکن اس دنیا میں ایک دوسری ہستی ہے جو انسانوں پر کلی اختیار رکھتی ہے۔ اس کے خلاف نہ بغاوت ہوسکتی ہے اور نہ اس کی بادشاہی سے نکل کر بھاگا جاسکتا ہے۔ اس کا اقتدار انسانوں کا عطیہ نہیں کہ اس کے کسی فیصلے پر آواز اٹھائی جاسکے۔ انسانوں کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سرتاسر اسی کا دیا ہوا ہے۔ اس لیے اس کی طرف سے کیا گیا ہر مطالبہ ایک مکمل اخلاقی جواز رکھتا ہے۔ یہ ہستی اللہ جل جلالہ کی ہے جو انسانوں کا حقیقی بادشاہ اور مالک ہے۔

انسانوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کو جو مکمل اور یکطرفہ اختیار واقتدار حاصل ہے، اس کے

بعد یہ عین ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں پر سخت قسم کے قوانین، ضابطوں اور مطالبات کا بوجھ ڈال دیتے اور انسانوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا کہ وہ اس کے ہر ہر حکم اور قانون کی تعمیل کریں۔ مثلاً وہ کہہ سکتے تھے کہ روزوں کی پابندی ایک ماہ کے بجائے تمام سال کے لیے ہے۔ وہ دن میں پانچ کے بجائے پچاس نمازوں کو فرض کر سکتے تھے۔ وہ ہر سال ہر شخص کے لیے حج فرض کر سکتے تھے۔ وہ زکوٰۃ کی شرح انسان کے مال کا ستر فیصد تک مقرر کر سکتے تھے۔

دین کے فرائض کے علاوہ دین کے کمال کو بھی وہ انتہائی مشکل احکام پر منحصر کر سکتے تھے۔ مثلاً عید الاضحیٰ پر وہ انسانوں سے ان کے پہلوٹھی کے بچے کی قربانی مانگ سکتے تھے۔ اعتکاف کی عبادت میں بولنے پر بھی پابندی عائد کی جاسکتی تھی۔ غرض اس طرح کی ہزار پابندیاں لگانا ان کے لیے بالکل ممکن تھا اور انسان اس کے مقابلے میں چوں بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ان احکام کی خلاف ورزی پر جہنم کی سزا ملتی اور جنت کے اعلیٰ درجے کا حصول خواب وخیال کی بات ہوتی۔

مگر اس قادر مطلق کی رحمت کے قربان جانا چاہیے جو اپنی تمام تر طاقت کے باوجود انسانوں سے اتنے آسان مطالبات کرتا ہے جن کا پورا کرنا قطعاً مشکل نہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان احکام پر عمل کرنے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ ہے اور نہ اسے ان سے کچھ ملتا ہے، بلکہ ان میں تمام تر فائدہ انسانوں ہی کا ہے۔ مگر اس کے باوجود سانحہ یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت خدا میں کوئی دلچسپی رکھتی ہے اور نہ اس کے بہت آسان احکام کی پیروی کو اپنا مسئلہ بناتی ہے۔

آج لوگوں کو صرف اسی ایک بات کا احساس ہو جائے کہ خدائے قدیر کے مقابلے میں وہ کتنے بے بس ہیں، اس کریم کے ان پر کتنے احسانات ہیں اور اس حقیقت کے باوجود اس کے مطالبات کتنے آسان ہیں تو وہ بے اختیار سجدے میں گر کر اس کی حمد وتسبیح کریں گے۔ ان کی زندگی سراپا بندگی بن جائے گی۔ یہی لوگ عنقریب خدا کی رحمت کا ذائقہ سب سے بڑھ کر چکھیں گے۔

کعبہ کی طرف منہ

قرآنِ مجید کی سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے جب تحویل قبلہ کا حکم نازل فرمایا تو بار بار اس بات کو دہرایا کہ تم اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کرلو۔ یہ بات اس سلسلۂ کلام (آیت 150,149,144) میں پانچ دفعہ دہرائی گئی ہے۔ قرآنِ مجید کی اس قدر تاکید کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امت میں دیگر معاملات میں کچھ نہ کچھ جزوی نوعیت کے اختلاف رہے ہیں، مگر اس حکم کے بارے میں کوئی اختلاف موجود نہیں۔ ہر زمانے کے تمام مسلمان خانہ کعبہ کی سمت ہی رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے ہیں۔ آج بھی حرم پاک میں لوگ جب نماز ادا کرتے ہیں تو ہر طرح کے جزوی اختلاف کے باوجود ان سب کا رخ خانہ کعبہ کی سمت ہی ہوتا ہے۔

تاہم اس حکم پر تدبر کے ساتھ جب نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس اصرار کا سبب یہ ہے کہ یہاں حرم پاک دراصل اللہ تعالیٰ کے قائم مقام ہے۔ بندے کا رخ اصل میں اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہونا چاہیے۔ مگر چونکہ وہ مقام اور جسم کی ہر قسم کی قید سے بلند اور پاک ہیں، اس لیے بیت اللہ الحرام کو علامتی طور پر مسلمانوں کا قبلہ بنادیا گیا جس کی طرف رخ کر کے وہ نماز ادا کرتے ہیں۔ تاہم اس اصرار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندۂ مومن کو اپنی ہر بندگی اور اپنی کل زندگی میں اپنا رخ اپنے رب کی طرف ہی رکھنا چاہیے۔ اس کی ہر عبادت اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہونی چاہیے۔ اس کی زندگی کا مرکز و محور اللہ تعالیٰ کی ہستی ہونی چاہیے۔ زندگی کی ہر اونچ نیچ، نشیب و فراز، سرد و گرم اور خوشی و غم کے موقع پر اسے اللہ کی طرف متوجہ رہنا چاہیے۔

اسے نعمت ملے تو وہ اللہ کا شکر کرے۔ مشکل پیش آئے تو وہ اللہ سے مدد مانگے۔ آسانی ملے تو اللہ کا کرم سمجھے۔ سختی آئے تو اللہ کی آزمائش جانے۔ یہ رویہ جس شخص نے اختیار کیا دراصل وہی ہے جس نے رب کے حکم کو درست سمجھا اور اس پر پوری طرح عمل کیا۔

انسان اور مصائب

طب کے ایک ماہر کا قول ہے: ’انسان اس چیز سے کم بیمار ہوتا ہے جو وہ کھاتا ہے، زیادہ تر وہ ان چیزوں سے بیمار ہوتا ہے جو اسے کھا رہی ہوتی ہیں‘۔ یہ انتہائی خوبصورت انداز میں اس حقیقت کا بیان ہے کہ پریشانیاں، تفکرات اور غم و الم کس طرح انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہیں۔ کم و بیش تمام ماہرین طب یہ بات بیان کرتے ہیں کہ ہائی بلڈ پریشر اور عارضۂ قلب سے لے کر پیٹ کی متعدد بیماریوں حتیٰ کہ دانتوں کی کمزوری اور ٹوٹنے کی وجہ بھی اکثر حالات میں فکر و پریشانی ہوتی ہے۔

اسلامی تعلیمات ایسے مسائل سے نمٹنے کا ایک بہت اچھا طریقہ بیان کرتی ہیں۔ وہ ہے صبر و رضا اور تفویض و توکل۔ انسان کے بیشتر مسائل اور پریشانیاں دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک ماضی میں پیش آنے والے واقعات جنھیں یاد کر کے انسان کڑھتا رہتا ہے۔ دوسرے مستقبل کے خوف اور اندیشے۔ تفویض و رضا اس چیز کا نام ہے کہ ماضی میں جو سانحات پیش آئے انسان انھیں اللہ کا فیصلہ اور رضا سمجھ کر قبول کرلے۔ وہ یہ امید رکھے کہ اللہ تعالیٰ ان مصائب کا بہترین بدلہ اسے دنیا و آخرت میں دے گا۔ یہ رویہ انسان کو حقیقت پسند بناتا ہے جس کے بعد وہ ماضی پر کڑھنے کے بجائے مستقبل میں ملنے والے بدلے کی امید میں جینے لگتا ہے۔ توکل اس چیز کا نام ہے کہ انسان اپنی کوشش کرنے کے بعد مستقبل کے ہر اندیشے کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ سے یہ امید رکھے کہ وہ اسے مشکلات سے بچالیں گے۔ اس کے اندیشے کبھی حقیقت کا روپ نہیں اختیار کریں گے۔ یہ رویہ ایک اعلیٰ درجے کی عبادت ہے اور انسان کے تفکرات کو بھی دور کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صبر و توکل کی سوچ آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی انسان کو بہت سے مسائل سے بچالیتی ہے۔ وہ آخرت میں اللہ کے ہاں اجر پاتا ہے اور دنیا میں فکر و پریشانی اور نتیجتاً بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔

ٹائم مشین

وقت میں آگے یا پیچھے کی سمت سفر کرنا دور جدید کے انسان کی اہم ترین خواہش رہی ہے۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ ہی انیسویں صدی سے اس موضوع پر فکشن تخلیق کیا جانے لگا تھا۔ پھر بیسویں اور اکیسویں صدی میں آئن اسٹائن اور اسٹیفن ہاکنگ جیسے عظیم ترین ماہرین طبیعیات اور سائنسدان اس کے امکانات تلاش کرتے رہے ہیں۔ تاہم اب تک اس سلسلے میں ہونے والا تمام تر کام نظریاتی نوعیت کا ہے۔ مثلاً ایک تھیوری یہ پیش کی جاتی ہے جسے دور جدید کے سب سے بڑے سائنس دان اسٹیفن ہاکنگ نے بار بار بیان کیا ہے کہ انسان اگر روشنی کی رفتار سے سفر کرنے کے قابل ہو جائے تو سائنس کے اصولوں کے تحت وقت میں سفر کرنا ممکن ہوگا۔

تاہم عملی طور پر یہ اور اس قسم کے دیگر نظریات ناقابل عمل ہیں۔ مثلاً جو سائنسی تھیوری یہ بتاتی ہے کہ روشنی کی رفتار حاصل کرنے کے بعد وقت میں سفر کرنا ممکن ہے وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ اس رفتار کے ساتھ ہی مادہ کی کمیت صفر ہو جاتی ہے یعنی اس رفتار پر انسان کا مادی وجود باقی نہیں رہ سکتا۔ یہ اور اس نوعیت کے متعدد اعتراضات ہیں جن کی بنا پر یہ نظریات بس نظریات ہی ہیں اور حقیقت کا روپ دھارنے سے محروم ہیں۔

تاہم اس دنیا میں ایک اور قسم کی ٹائم مشین پائی جاتی ہے جو ہمیں اس قابل بنا دیتی ہے کہ ہم وقت میں سفر کر کے ماضی اور مستقبل کا مشاہدہ کر سکیں۔ یہ ٹائم مشین ایک ایسی ہستی کی تخلیق ہے جو ہر طرح کی مادی کمزوریوں اور محدودیتوں سے پاک ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو مکاں کی پابند ہے نہ زماں کی۔ مشرق ہو یا مغرب، آسمان ہو یا زمین ہر شے بیک وقت اس کی نگاہ میں ہے۔ ٹھیک اسی طرح ماضی کی کوئی داستان ہو یا مستقبل کا کوئی واقعہ، اللہ تعالیٰ ہر چیز سے پوری طرح باخبر ہیں۔ انھوں نے یہ کرم کیا کہ اپنے اس علم کو انسانوں تک اپنی وحی اور اپنے کلام پاک

کے ذریعے سے قرآن مجید کی شکل میں منتقل کر دیا۔

قرآنِ مجید بے شک و شبہ وہ کتاب ہے جو انسان کو وقت کی ہر محدودیت سے بلند کر کے بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل ہر چیز کی خبر دیتی ہے۔ قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ تخلیق آدم کے وقت کیا ہوا تھا۔ فرعون و موسیٰ کے قصے کی تفصیلات کیا ہیں۔ ٹھیک اسی طرح قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ قیامت کے دن کیا ہوگا۔ زمین و آسمان کے ساتھ کیا گزرے گی۔ انسان و حیوان کے ساتھ کیا ہوگا۔ نیک و بد کے ساتھ کیا کچھ پیش آئے گا۔

ایک شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ یہ قرآنی ٹائم مشین محض ایک دعویٰ ہے۔ کوئی بھی شخص ماضی اور مستقبل کے نام پر کچھ بھی بیان کر سکتا ہے، ہم کیسے اس کی تردید و تصدیق کریں۔ یہی قرآن کریم کا معجزہ ہے کہ وہ نہ صرف ہمیں ماضی و مستقبل میں لے جاتا ہے بلکہ ٹائم مشین ہی کے بعض ایسے کمالات دکھاتا ہے جو اس کی سچائی کا ثبوت بن چکے ہیں۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں۔ آج ایک شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس نے مستقبل میں سفر کر کے یہ دیکھ لیا ہے کہ ہزار سال بعد کیا ہوگا تو ہمارے پاس اس کی تصدیق و تردید کا کوئی ذریعہ نہیں سوائے اس کے کہ اس سے یہ پوچھا جائے کہ بتاؤ ہماری زندگی کے اگلے دس سالوں میں کیا ہوگا۔ وہ جو کچھ بتائے اگر دس سال بعد ٹھیک یہی ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے دعویٰ میں سچا ہے۔

ٹھیک یہی قرآن مجید نے بھی کیا ہے۔ اس نے قیامت کے بعد ہی کی خبریں نہیں دیں بلکہ اپنی سچائی کے ثبوت کے لیے آغاز وحی کے چند برس بعد پیش آنے والے بعض واقعات کو بھی کھول کر بیان کر دیا۔ مثلاً روم و ایران کی جنگ میں شکست خوردہ رومیوں کی ناقابل یقین فتح کی پیش گوئی۔ یہ پیش گوئی پوری ہوئی اور یہ بات ثابت ہوگئی کہ قرآن اپنے دعویٰ میں ایک سچی کتاب ہے۔ یہی وہ ٹائم مشین ہے جس میں بیٹھ کر نہ صرف ہم مستقبل کی سیر کر سکتے ہیں بلکہ اس کے برے نتائج سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں۔ یعنی جہنم سے بچ کر جنت کی تیاری کر سکتے ہیں۔

گناہ، ماحول اور صحبت

انسانوں کو گناہوں کی طرف لے جانے والا ایک اہم عامل انسان کا ماحول اور اس کی صحبت ہے۔ انسان تنہا نہیں جی سکتا۔ اسے بہر حال اپنے ذوق کے مطابق ہم مشرب ساتھیوں اور احباب و رفقاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ دوست کچھ مشترکہ خصوصیات کے علاوہ اپنی شخصی کمزوریاں اور بری عادات بھی ساتھ لے کر انسان کی زندگی میں آتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اپنی ان بری عادات کا زہر اس کے رگ و پے میں غیر محسوس طریقے سے گھول دیتے ہیں۔

زمانۂ طالب علمی میں اس بات کا ظہور سب سے بڑھ کر دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک بچے، نوجوان لڑکے یا لڑکی کی زندگی میں آنے والا دوست یا سہیلی اسے بہت سے گناہوں کی طرف لے جاسکتے ہیں۔ بہت سے بچے گالیاں دینا ایسے ہی سیکھتے ہیں۔ فحش کلامی، آوارگی، جنسی بے راہ روی اور نشہ بازی جیسی بیشتر عادات بالعموم اسی طرح کی بری صحبت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح انسان کا ماحول اور اس کا مطالعہ وغیرہ بھی اسے نافرمانی کی راہ تک لے جاتا ہے۔ ٹی وی اکثر لوگوں کی زندگی میں شامل ہوجاتا ہے۔ اور اس کے ذریعے انٹرٹینمنٹ کے نام پر فواحشات بھی ان کی زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہی معاملہ انٹرنیٹ اور موبائل وغیرہ کا بھی ہے۔

بندۂ مؤمن کا کام یہ ہے کہ جب وہ توبہ کی راہ پر قدم رکھے تو اس بات کا جائزہ لے لے کہ اس کے دوستوں کا حلقہ کس قسم کا ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ اگر اس کا ماحول برا ہے تو وہ لازماً اسے بدلے۔ وہ اپنے دوستوں کو بھی اپنے ساتھ لانے کی کوشش کرے۔ اگر وہ نہ آئیں تو پھر انھیں چھوڑ دے۔ وہ ایسا نہیں کرے گا تو یہ غلط ماحول اور بری صحبت اسے دوبارہ بدی کی طرف کھینچ لے جائیں گے۔

یہی بات قرآنِ مجید کی سورۂ توبہ میں کچھ اہلِ ایمان کی توبہ قبول کرنے کے بعد بطور نصیحت اس طرح کہی گئی ہے کہ صادقین کے ساتھ رہا کرو، (توبہ:119)۔ یعنی ان لوگوں کے ساتھ جو اپنے عمل سے اپنے ایمان کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ اصلاح کا بہترین نسخہ ہے جو خود پروردگارِ عالم کا تجویز کردہ ہے۔

جوش اور استقامت

قرآن مجید میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی صفات رحمٰن اور رحیم ایک ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ دونوں صفات ایک ہی حقیقت یعنی رحمتِ باری تعالیٰ کا بیان ہیں جنھیں مبالغے کے پیش نظر ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ بات اس پہلو سے ٹھیک ہے کہ دونوں صفات اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کا بیان ہیں، مگر ان میں ایک باریک مگر اہم فرق پایا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ رحمٰن میں رحمت کے جوش اور پھیلاؤ کا عنصر غالب ہے جبکہ رحیم میں رحمت کے دوام واستمرار اور روانی کا عنصر نمایاں ہے۔ یوں یہ دونوں مل کر اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ کا بہترین بیان کرتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا معاملہ یوں نہیں ہے کہ اس نے جوش میں آکر یہ دنیا بنا ڈالی یا کوئی مخلوق پیدا کر دی اور اسے بس ایک دفعہ اس کی بنیادی ضروریات فراہم کر دیں۔ جیسا کہ عام انسانوں کا معاملہ ہے کہ وہ نیکی اور بھلائی کے کسی کام میں توجہ دلانے پر شامل تو ہوجاتے ہیں، لیکن تھوڑے ہی عرصے میں ان کا جوش ٹھنڈا پڑتا جاتا ہے اور دوسری چیزیں ان کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں دوام وتسلسل پایا جاتا ہے۔ وہ مخلوق کو پیدا کرتے ہیں اور آخر تک اس کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کی رحمت صرف ایک دفعہ نہیں برستی بلکہ ہر موسم میں بندے کے وجود پر ابر کرم بن کر اسے سرشار رکھتی ہے۔ وہ یہ نہ کریں تو مخلوقات کا وجود ختم ہوجائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی ان صفات میں ہمارے لیے بڑا سبق ہے۔ نیکی کے لیے صرف ایک دفعہ کا جوش کافی نہیں بلکہ ہمیشہ کا دوام اور تسلسل چاہیے۔ نصرت دین کا معاملہ ہو یا غربا کی مدد کا، بے شک انسانی جوش ہی اسے اٹھنے پر آمادہ کرتا ہے، مگر اس جوش کے ساتھ استقامت کا سرمایہ بھی انسان کے پاس ہونا چاہیے۔ تبھی جاکر وہ نیکی اور بھلائی کو مستقل طور پر اختیار کرسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جوش میں آکر ایک دفعہ نیکی کرنے والے کبھی اس شخص کا مقابلہ نہیں کرسکتے جو مستقل مزاجی سے اپنی نیکی پر، چاہے وہ کتنی چھوٹی ہو، قائم رہتا ہے۔

شر اور شرافت

اس دنیا میں دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ ان میں سے کچھ طریقے ایسے ہیں جن میں بظاہر دوسروں کے ساتھ برائی کی جا رہی ہوتی ہے، مگر درحقیقت یہ ان کے ساتھ بھلائی ہی ہوتی ہے۔ مثلاً اکثر اداروں میں ملازمین کی تنخواہ کا ایک بہت تھوڑا سا حصہ کاٹ لیا جاتا ہے۔ یہ تھوڑی سی رقم ماہ بہ ماہ جمع ہوکر بڑھتی رہتی ہے۔ ملازمت ختم ہونے کے بعد ادارہ اس رقم میں اضافہ کرکے ایک معقول رقم ملازمین کو دے دیتا ہے۔ اس طرح ہر ماہ کٹی ہوئی یہ رقم ملازمین کو زیادہ رقم کی شکل میں اُس وقت ملتی ہے جب انھیں اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ تھوڑی سی رقم ہر ماہ ملتی رہتی تو غیر محسوس طریقے پر غیر ضروری خرچوں میں استعمال ہوجاتی۔

برائی میں بھلائی کی ایک اور صورت وہ ہے جس میں زیادہ بڑی تکلیف سے بچانے کے لیے کسی کو کچھ تکلیف میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جیسے چھوٹے بچوں کی ویکسی نیشن میں انھیں سوئی چبھنے اور بخار اور درد وغیرہ کی تکلیف میں اس لیے ڈالا جاتا ہے کہ وہ کسی بڑی اور جان لیوا بیماری سے محفوظ رہیں۔

برائی کی شکل میں بھلائی کی ایک شکل وہ ہے جس میں کسی کو اس کی ضرورت اور خواہش کی چیز نہیں دی جاتی یا اس پر کچھ مشقت ڈال دی جاتی ہے۔ مثلاً بیماریوں سے بچانے کے لیے کولڈ رنک اور ٹافی وغیرہ بچوں کو نہیں دی جاتیں۔ یا پھر والدین بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے صبح کا آرام چھڑا کر انھیں روتا ہوا اسکول بھیج دیتے ہیں۔ ان تمام شکلوں میں بظاہر ہونے والی برائی اصل میں برائی نہیں ہوتی بلکہ عین مہربانی ہوتی ہے۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انتہائی درجے کی شفیق اور مہربان ہستی ہیں۔ وہ بندوں کے ساتھ ہمیشہ عطا اور کرم کا معاملہ کرتے ہیں۔ انسان کو اس دنیا میں جو ملا ہے وہ اسے رب

کی عطا ہی سے ملا ہے۔ اس کی زندگی، جسم، اعضا و قویٰ، کھانا پینا، رشتے ناتے، زمین، ہوا، سورج، غرض آسمان و زمین اور اندر و باہر کی ہر نعمت اللہ تعالیٰ ہی کی عطا ہے۔ مگر ان کی مہربانی نہ صرف عطا کے روپ میں اپنا ظہور کرتی ہے بلکہ محرومی کے روپ میں بھی جو کچھ سامنے آتا ہے دراصل وہ بھی ان کی عنایت ہی ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مندرجہ بالا مثالوں میں ہم نے دیکھا تھا۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال قرآن کریم کی سورۂ کہف میں بیان ہونے والا حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کا وہ واقعہ ہے جس میں حضرت خضر پہلے دو یتیموں کی کشتی میں چھید کر ڈالتے ہیں اور اس کے بعد ایک معصوم بچے کو قتل کر ڈالتے ہیں۔ بعد ازاں وہ حضرت موسیٰ پر یہ واضح کرتے ہیں کہ انھوں نے یہ کام اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اذن الٰہی سے کیے تھے اور ان بظاہر منفی نوعیت کے واقعات میں بھی اللہ تعالیٰ نے خیر و بھلائی ہی کا معاملہ کیا تھا۔ کشتی میں سوراخ کی بنا پر وہ ایک غاصب بادشاہ کے شر سے بچ گئی اور یتیم بچوں کے پاس رہی جنھوں نے مرمت کے بعد اسے قابل استعمال بنالیا۔ جبکہ مقتول بچہ ایک شریر نوجوان کا روپ دھار رہا تھا جو اس کے اپنے والدین کے لیے اذیت و مصیبت کا باعث ہوتا۔ چنانچہ اس کے بعد والدین کو ایک نیک و صالح بچہ عطا کر دیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے ساتھ ہمیشہ کرم کا معاملہ کرتے ہیں۔ شر ان سے نہیں مخلوقات سے سرزد ہوتا ہے جبکہ وہ اس سے پناہ دیتے ہیں (الفلق)۔ مگر انسانوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایسی کریم ہستی کی قدر کرنے کے بجائے مصیبت آنے پر واویلا شروع کر دیتے ہیں۔ خدا سے شکوہ و شکایت، اس کی نافرمانی حتیٰ کہ اس کا کفر و انکار بھی کر دیا جاتا ہے۔ مگر کتنی اعلیٰ ہے وہ کریم و شریف ہستی جو انسانوں کی تمام تر احسان فراموشیوں کے باوجود ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیے جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پروردگار شرف کی انتہا بھی ہے اور شرافت کی بھی۔ مگر انسان کبھی اس کی قدر نہیں کرتا جو عطا میں بھی مہربانی کرتا ہے اور محرومی میں بھی احسان کرتا ہے۔

بھکاری کا حق

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر اُن لوگوں کی تفصیل بیان کی ہے جن پر مال خرچ کیا جانا چاہیے۔ اِن میں رشتہ دار، یتیم، مسکین، مسافر، ناگہانی مصیبت میں مبتلا لوگوں کے علاوہ خود اپنی ضرورت کے لیے سوال کرنے والے لوگ بھی شامل ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص اپنی ضرورت کے لیے خود سوال کردے تو اس کے بعد اگر انسان کچھ دینے کی حیثیت میں ہو تو اُسے بہت زیادہ تحقیق نہیں کرنی چاہیے۔ ایک عمومی اطمینان کے بعد مدد کردینی چاہیے اور اگر کسی وجہ سے اطمینان نہ ہو تو سلیقے اور نرمی سے معذرت کرلینی چاہیے۔

سائلوں کو دینے کا یہ حکم اُس رب کا ہے جس کے ہاتھ میں کل کائنات کی بادشاہی ہے۔ اُس کے قبضۂ قدرت میں ہر شے ہے۔ اُن کے خزانوں میں کسی قسم کی کمی ہے نہ انھیں کوئی مجبوری اور عذر لاحق ہوتا ہے۔ کوئی نفع وضرر اور کوئی خیر وشر رب العالمین کے اذن کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہوسکتا۔ وہ جو چاہتے ہیں ہوجاتا ہے جو نہیں چاہتے وہ نہیں ہوتا۔ اِس درجہ کی قدرت، اختیار اور قوت رکھنے والی ہستی جب مانگنے کو خود ایک استحقاق قرار دے دے تو گویا وہ انسانوں کو ایک دوسرا پیغام بھی دے رہا ہے۔ وہ یہ کہ جب تم میری بارگاہ میں آؤ تو یاد رکھو کہ تمھارا صرف مانگ لینا تمھیں میرے کرم کا مستحق بنادے گا۔ تم چاہے نیک نہ ہو، متقی نہ ہو، ایمان دار نہ ہو۔ لیکن اگر میرے پاس آکر مجھ سے تڑپ کر رجوع کروگے تو میں تمھاری توبہ بھی قبول کروں گا اور تم پر اپنی رحمتوں کے دروازے بھی کھول دوں گا۔

خدا سے مانگنے کے لیے کسی کو نیکوکار ہونے کی ضرورت نہیں۔ نہ ماضی کی وفاداری کا کوئی ریکارڈ ساتھ لانا ضروری ہے۔ صرف اپنا اضطرار، صرف یہ یقین کہ اللہ ہی دینے والا ہے اور صرف یہ عزم کہ بندہ آئندہ رب کا شکرگزار رہے گا، اسے مستحق بنانے کے لیے کافی ہے۔

گناہ اور عادات

خواہشات اور مفادات گناہ کی طرف لے جانے والے بنیادی عامل ہیں۔ مگر ان کے علاوہ انسان کی وہ شخصی عادات بھی گناہوں کی طرف لے جانے کا ایک اہم سبب ہوتی ہیں جو برسہا برس سے انسان کے معمولات میں غیر محسوس طریقے سے شامل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ بارہا تو یہ بچپن کی تربیت، ماحول اور تعلیم کا ایک ایسا اثر ہوتی ہیں جن سے انسان زندگی بھر پیچھا نہیں چھڑا پاتا۔ بڑے ہونے کے بعد بھی خارجی حالات اور ترغیبات کے تحت لوگ ایسی عادات اختیار کرلیتے ہیں جن کا بظاہر نیکی گناہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، مگر یہ عادات گناہوں کی اساس ضرور بن جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر بعض لوگ طبعاً سست ہوتے ہیں۔ وہ ہر کام میں سستی کرتے ہیں۔ یہ ایک بری عادت ہے لیکن اس کا دین سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ مگر یہی عادت انھیں اس مقام پر لے آتی ہے کہ وہ آمادگی کے باوجود نمازوں میں بھی سستی کرنے لگتے ہیں۔ نماز کا وقت ہوجاتا ہے۔ مگر وہ نہیں اٹھتے۔ اذان ہوتی ہے۔ مگر ان کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ نماز کا وقت نکلنے لگتا ہے، مگر وہ بیٹھے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخرکار نماز قضا ہوجاتی ہے۔

اسی طرح بہت سے لوگ چار وقت نماز باقاعدہ پابندی سے وقت پر ادا کرتے ہیں۔ مگر فجر کی نماز نہیں ادا کرپاتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ لوگ راتوں کو دیر سے سونے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس عادت کا نیکی بدی سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن بہرحال اس عادت کی بنا پر ان کے لیے ممکن نہیں رہتا کہ وہ رات ایک یا دو بجے سونے کے بعد پانچ بجے فجر کی نماز کے لیے اٹھ سکیں۔ یوں ان کی فجر کی نماز اکثر قضا ہوجاتی ہے۔

ایک اور بری عادت وقت اور معاملات کو درست طریقے سے منظّم نہ کرنا ہے جس میں لوگ

عموماً مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ بھی کوئی دینی چیز نہیں۔ مگر اس کے نتیجے میں بہت سی اخلاقی اور دینی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ مثلاً ایسا آدمی ایک متعین وقت پر کہیں پہنچنے کا وعدہ کر لیتا ہے۔ مگر کبھی وقت پر نہیں پہنچتا۔ وہ اپنے ذمے کوئی کام لے لیتا ہے جو گویا کہ ایک عہد ہوتا ہے۔ مگر اپنی غیر منظّم طبیعت کی بنا پر وہ اس ذمے داری کو نہیں نبھا پاتا۔ یوں وہ عہد و پیمان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سخت ترین وعیدوں کا مستحق ہو جاتا ہے جو قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہیں۔

ایسی ہی عادات میں سے ایک عادت بے مقصد اور بے فائدہ طور پر بولنا ہے۔ ایسا انسان گفتگو کرتا رہتا ہے۔ اس گفتگو میں مباحات اور ضروریات کی چیزیں بھی ہوتی ہیں، مگر بارہا ان میں دوسروں کا تمسخر، غیبت، الزام و بہتان اور تجسس جیسی حرام چیزیں غیر محسوس طریقے سے داخل ہوتی چلی جاتی ہیں۔

توبہ کی نفسیات میں جینے والے انسان کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنی عادات کا بھی جائزہ لیتا رہے۔ ہر وہ عادت جو گناہ اور نافرمانی کی سمت لے جانے والی ہے، اس کی اصلاح کی بھرپور کوشش کرے۔ اس کے لیے دوسروں کی مدد لے۔ اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کرے۔ اپنا احتساب کرتا رہے۔ اپنے لیے کچھ مطلوبہ معیارات مقرر کرے۔ ان کی خلاف ورزی کی صورت میں خود پر جرمانہ مقرر کرے، وغیرہ۔

اسی طرح ضروری ہے کہ اپنے بچوں کی تربیت میں اچھی عادات کو شامل کرنے پر بہت توجہ دی جائے۔ عادات کی کھیتی اصل میں والدین بوتے ہیں۔ وہ اگر اس بات کی اہمیت کو محسوس کر لیں تو بچوں کی بہت اچھی تربیت کر کے انھیں اچھی عادات کا حامل ایک اچھا اور قابلِ قدر انسان بنا سکتے ہیں۔ یہی عادات دنیا اور آخرت دونوں میں ان کی کامیابی کی ضامن ہوں گی۔

انسانی گوشت کھانے والے لوگ

کچھ عرصے قبل میڈیا میں ایک واقعہ رپورٹ ہوا۔ یہ دو بھائیوں کا تھا جو رات کے وقت تازہ قبروں سے مردہ لاشوں کو نکال کر اپنے گھر لے آتے اور پھر ان مردہ انسانوں کا گوشت پکا کر کھاتے تھے۔ پولیس نے ان کو گرفتار کر لیا اور میڈیا پر ان کی تصویریں نشر ہوئیں۔ ساتھ ہی ان کا گھر، مردہ انسانوں کا گوشت پکانے کے برتن وغیرہ سب دکھائے گئے۔ یہ سب کچھ اتنا مکروہ تھا کہ دیکھنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی حالت غیر ہوگئی۔ کراہیت کے مارے لوگوں کا برا حال ہوگیا۔ لوگ پوچھنے لگے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص انسانی گوشت کھانے جیسا مکروہ عمل کر سکے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ایک اور پہلو سے ہم سب انسانی گوشت بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ تنہائی میں چھپ کر نہیں بلکہ اپنی مجلسوں میں سب کے سامنے کھاتے ہیں۔ مگر نہ ہمیں کراہیت آتی ہے اور نہ کوئی دوسرا ہی ہمیں منع کرتا ہے۔ یہ اجتماعی گوشت خوری غیبت کرنے کا وہ عمل ہے جسے قرآنِ مجید نے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے جیسا مکروہ عمل قرار دیا ہے۔

قرآنِ مجید نے کمالِ بلاغت کا مظاہرہ کرتے ہوئے غیبت کرنے کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے نہ صرف غیبت کے عمل کی شناعت واضح ہوتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ غیبت کیا ہے۔ غیبت کسی کے پیٹھ پیچھے اس کے عیب نکالنے کا عمل ہے جب وہ اپنے دفاع کے لیے موجود نہ ہو۔ یہ تشبیہ بتاتی ہے کہ جس طرح کسی مردے کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ جب اس کا گوشت جسم سے کاٹا جائے تو وہ اپنا دفاع کر سکے ٹھیک اسی طرح غیبت کرنے والا دوسرے مسلمان کے عیب اس کے پیچھے بیان کر رہا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس موقع پر اپنا دفاع کرنے کے لیے موجود نہیں ہوتا اور اس کا سماجی وجود گویا کہ ایک بے جان لاش

کی طرح پڑا ہوتا ہے جسے غیبت کرنے والا بے رحمی سے بھنبھوڑ رہا ہوتا ہے۔

غیبت کی اس واضح تعریف کے بعد بعض عملی سوالات پیدا ہوسکتے ہیں۔ایک سوال یہ ہے کہ جو برائی بیان کی جارہی ہے وہ واقعتاً اُس شخص میں پائی جاتی ہو تو اُسے بیان کرنے میں کیا خرابی ہے؟ دوسرے یہ کہ اگر وہ شخص اس برائی کو برا نہ سمجھتا ہو پھر بھی کیا یہ غیبت ہے؟ ان دونوں سوالوں کے جواب ہمیں ایک صحیح روایت میں اس طرح ملتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صحابہ سے پوچھا کہ جانتے ہو غیبت کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ اللہ اور اُس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔فرمایا: تو اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرے کہ اُسے ناگوار گزرے۔عرض کیا اگر میرے بھائی میں واقعتاً وہ عیب پایا جاتا ہو؟ فرمایا: عیب بیان کرنا ہی غیبت ہے، اگر وہ عیب اُس میں نہ ہو تو تم نے اُس پر بہتان لگادیا۔''، (مسلم رقم: 2589)

معلوم ہوا کہ عیب بیان کرنا ہی غیبت ہے، اگر عیب واقعی میں موجود نہ ہو لیکن بیان کیا جائے تو بہتان بن جائے گا جو زیادہ بڑا گناہ ہے۔اسی طرح اس روایت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ایک شخص کسی عیب یا برائی کو برا ہی نہیں سمجھتا بلکہ یہ اس کے نام اور شخصیت کا لازمی حصہ بن گئی ہے تب بھی یہ غیبت نہیں۔جیسے کسی کو عام حالات میں موٹا یا کالیا کہہ دیا جائے تو وہ برا مانے گا۔لیکن بعض لوگوں کی پہچان کے لیے اس طرح کے لفظ ان کے نام کا حصہ بن جاتے ہیں جسے وہ خود بھی برا نہیں سمجھتے۔چنانچہ ان الفاظ سے کسی کا ذکر کرنا غیبت نہیں ہے۔

اس ضمن کا ایک آخری اور اہم سوال یہ ہے کہ کیا برائی بیان کرنا ہر حال میں ممنوع ہے یا اس سے کوئی استثنا بھی ہے۔اس سوال کا جواب قرآن مجید یوں دیتا ہے:

''اللہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ کسی کا ذکر برائی کے ساتھ کیا جائے، سوائے اس شخص

کے جس کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔''، (نساء4:)

اس آیت میں غیبت کا ایک استثنا یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص پر ظلم ہوا ہے تو بہرحال اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی روداد بیان کرے اور ظاہر ہے جس نے ظلم کیا ہے اس کا ذکر برائی کے ساتھ بیان ہوگا۔یہاں ظلم کا ایک معاملہ بیان ہوا ہے مگر اس سے یہ اصول نکلتا ہے کہ جب عیب جوئی کا مقصد کردار کشی یا مزے لینا نہ ہو بلکہ واقعتاً اپنے آپ کو یا دوسروں کو کسی شخص کے ظلم وزیادتی اور برائی سے بچانا یا کوئی اور مثبت بات مقصود ہو تو بھی یہ غیبت نہیں رہتی۔مثلاً ایک دکاندار کم تولتا ہے تو دوسرے لوگوں کو اس کی اس برائی سے مطلع کرکے انھیں اس کے ظلم سے بچانا چاہیے۔یا کسی نزاع میں گواہی کے موقع پر صحیح بات بیان کرنی چاہیے چاہے وہ کسی کی برائی ہی کیوں نہ ہو۔اسی طرح رشتہ وغیرہ کے موقع پر اگر کسی کے بارے میں دریافت کیا جائے تو سچی بات بتادینی چاہیے، چاہے وہ کسی کا عیب ہی کیوں نہ ہو۔

یہ اور ان جیسے دیگر کئی امور ایسے ہیں جہاں کسی کی برائی بیان کرنے کا اصل مقصد اپنی بزم آرائی کی لذت کے لیے دسترخوان پر کسی کے سماجی کردار کا گوشت چننا نہیں ہوتا۔نہ کسی کی کردار کشی کی نیت ذہن میں ہوتی ہے، نہ مزے لینا مقصود ہوتا ہے اور نہ گفتگو برائے گفتگو کی عادت ہوتی ہے۔بلکہ کسی کو برائی سے بچانا، ظلم وزیادتی کو بیان کرکے انصاف یا مشورہ کا طلبگار رہنا، کسی تحقیق طلب امر میں سچائی بیان کرنا وغیرہ مقصود ہوتا ہے۔اس میں بھی ہمیشہ محتاط رہنا چاہیے کہ نہ اندازے سے بات کی جائے اور نہ سنی سنائی بات کو بلاتحقیق آگے بڑھایا جائے۔بلکہ اگر کسی کی متعین برائی یقینی علم یا واضح قرائن کی بنیاد پر علم میں آئے تبھی اسے سامنے لانا چاہیے۔

آج کا موقع اور خدا کا پڑوس

انسان اس دنیا کی خوش نصیب ترین مخلوق ہے......اسے خداوند ذوالجلال جیسی اعلیٰ ترین ہستی نے اپنی مخاطبت کا شرف بخشا۔ انسان کائنات کی بدنصیب ترین مخلوق ہے......اس نے رب کائنات کے پیغام کو نظر انداز کر کے جینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

خدا کا پیغام کیا ہے؟ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا کی تعلیمات کا خلاصہ کیا ہے؟ الہامی صحائف اور کتابوں کا خلاصہ کیا ہے؟ بس یہی کہ جس ہستی کی رحمت لامحدود اور قدرت بے انتہا ہے، اس کے حکم کے آگے سر جھکا دو، قبل اس کے کہ تمھارا اس کا سامنا ہوجائے......اور اس کا بدلہ......نہ ختم ہونے والی بادشاہی، نہ منقطع ہونے والی نعمتیں، نہ فنا ہونے والی زندگی، نہ ڈھلنے والی جوانی، نہ مٹنے والا کیف، نہ کم ہونے والی لذت، نہ مدھم پڑنے والی مستی و سرور......اور سب سے بڑھ کر رب کا پڑوس اور اس کی رضا کی وہ پوشاک جو قلبی آسودگی کی آخری انتہا ہے۔

اس کا مطالبہ کتنا فطری ہے......اپنے خالق، اپنے مالک، اپنے محسن سے اپنے دل و جان سے محبت کرو۔ اس کی یاد کو زندگی بنالو۔ اس کی شکر گزاری کو عادت بنالو۔ اس کے بندوں کے ساتھ خدمت اور محبت کا تعلق قائم کرو۔ ان پر احسان کرو۔ ان سے عدل کرو۔ ان پر خرچ کرو۔ یہ سب نہیں کرسکتے تو کم از کم اپنے شر ہی سے انہیں بچالو۔

انسان کو بہرحال خدا کے سامنے جھکنا ہے۔ مگر اسے دیکھ کر اس کے سامنے جھکنا بڑی بدنصیبی کا جھکنا ہوگا۔ مگر آج بن دیکھے اس کے سامنے جھکنا، بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔ آج جب زندگی کے بیشتر ایام گزر چکے ہیں، موقع ہے کہ خدا کی بندگی اور اس کے بندوں کی خدمت سے اسے راضی کرلیا جائے اور اس کے پڑوس میں جگہ پالی جائے۔ اس آج کو استعمال کرلو۔ قبل اس کے کہ یہ آج کبھی نہ واپس آنے والی کل میں بدل جائے۔

ڈینگی اور جنت کے باسی

پچھلے کچھ عرصے سے ڈینگی کا مرض پیدا کردینے والا مچھر ہمارے ملک کے لیے خوف و دہشت کی علامت بنا ہوا ہے۔ ہزاروں افراد اس سے متاثر ہوئے ہیں اور تادم تحریر دو سو سے زائد لوگ اس مرض سے ہلاک ہوچکے ہیں۔ گرچہ یہ مرض ناقابل علاج نہیں ہے، مگر پاکستان میں اس مرض سے مرنے والوں کی تعداد بڑھتی چلی جارہی ہے۔

ڈینگی مچھر نے پنجاب کے شہریوں کو بالخصوص زبردست خوف میں مبتلا کردیا ہے۔ صبح و شام کے اوقات میں جب یہ مچھر باہر نکلتا ہے، لوگ گھروں سے نکلنے سے ڈرنے لگے ہیں۔ پارک ویران اور سوئمنگ پول غیر فعال ہوگئے ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد اور معاشرتی رویے بدلے ہیں جن میں سے ایک تبدیلی خواتین کے لباس کے حوالے سے سامنے آئی ہے۔ جس کے پس منظر میں آج کل ایک دلچسپ ایس ایم ایس گردش میں ہے۔ اس کے مطابق جو کام بڑے بڑے علما کا وعظ نہیں کرسکا وہ مولانا ڈینگی نے کردکھایا یعنی سلیولیس خواتین اب ڈینگی کے خوف سے فل آستینوں کی قمیصیں پہن رہی ہیں۔

یہ بظاہر ایک لطیفہ ہے لیکن اس کے اندر ایک بہت بڑی حقیقت پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ایک معمولی سی مخلوق بھی انسان کو راہ راست پر لانے کے لیے بہت ہے۔ مگر انسانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی اسکیم یہ نہیں کہ وہ لوگوں سے طاقت کے بل پر اپنی بات منوائیں۔ ان کی قوت کے تو کیا کہنے، ان کی ایک بے وقعت مخلوق یعنی مچھر بھی انسان کو ان کی مرضی کی زندگی گزارنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ مگر انہیں مطلوب یہ ہے کہ لوگ بغیر کسی زور کے اور بن دیکھے ان کے سامنے بے اختیار ہوجائیں۔ یہی وہ اعلیٰ انسان ہیں جنہیں وہ ہمیشہ کے لیے جنت کی بادشاہی میں جگہ عطا کریں گے۔ باقی انسان تو کچرے کا ڈھیر ہیں جنہیں بہت جلد جہنم کے کوڑا خانے کی نذر کردیا جائے گا۔

Think and Thank

کسی دانشور نے کیا خوب کہا ہے کہ انسانی معاشروں کو تمام جنگوں اور بیماریوں نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا نقصان ان کے اس رویے نے انہیں پہنچایا ہے کہ وہ اپنے پاس موجود نعمتوں کو نعمت نہیں سمجھتے بلکہ دوسروں کے پاس موجود نعمتوں کو نعمت سمجھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی ان گنت نعمتوں میں جی رہا ہوتا ہے۔ مگر اس کا حال یہ ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ صرف انہی چیزوں کی طرف اٹکی رہتی ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان ہمیشہ احساس محرومی میں جیتا ہے۔ وہ چیزوں کے حصول کے لیے اپنی طاقت سے زیادہ جدوجہد کر کے ذہنی سکون گنواتا ہے اور کبھی صحت اور طاقت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ یہی وہ نقصان ہے جسے اوپر اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ساری جنگیں اور بیماریاں بھی انسانوں کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتیں جتنا یہ رویہ پہنچاتا ہے۔

اس رویے کا مزید نقصان یہ ہے کہ انسان اس اطمینان اور خوشی سے بھی محروم ہو جاتا ہے جو حاصل شدہ نعمتوں سے اسے مل سکتا تھا۔ کیونکہ اس نے تو کبھی انہیں نعمت سمجھا ہی نہیں۔ لوگ دولت کے پیچھے بھاگتے رہے اور صحت جیسی قیمتی نعمت کو نعمت نہیں سمجھا۔ گھر اور گاڑی کے پیچھے بھاگتے رہے اور ہاتھ، پاؤں اور آنکھ کان جیسی انمول نعمت کو نہیں سمجھا۔ یہ نعمتیں انسان کو اسی وقت نعمت لگتی ہیں کہ جب انسان ان سے محروم ہو جاتا ہے۔ تب انسان کو ان کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے، مگر اکثر تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

اس رویے کا علاج انگریزی میں بڑی خوبی سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ یعنی Think and Thank۔ سوچو، تفکر کرو اور احساس کرو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ تم ہر حال میں بہت کچھ پائے ہوئے ہو۔ یہی پانے کا احساس انسان میں شکرگزاری جگاتا ہے اور اسے ذہنی اور قلبی سکون عطا کرتا ہے۔ اس کے سوا ہر دوسرا راستہ بے چینی اور پریشانی کا راستہ ہے۔

زندگی کی ملازمت

ایک صاحب کسی دفتر میں ملازم تھے۔ ان کے معاملات وہاں اچھی طرح چل رہے تھے۔ مگر انہیں آہستہ آہستہ کچھ شکایات پیدا ہونا شروع ہوئیں۔ ایک روز انہوں نے اپنے باس سے اپنی شکایات بیان کرتے ہوئے کہا کہ اب وہ اپنی ہی شرائط پر کام کریں گے۔ اگلے دن باس نے انہیں بلایا اور بتایا کہ جتنی شکایات انہیں دفتر سے ہیں، اس سے کہیں زیادہ اور سنگین نوعیت کی شکایات دفتر کو ان سے ہیں۔ یہ سنگین شکایات بیان کرنے کے بعد باس نے انہیں ملازمت سے فارغ کر دیا۔ یہ بات سن کر ان کے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ انہوں نے بہت منت سماجت کی، مگر انہیں جاب واپس نہیں ملی۔

یہ سانحہ جوان صاحب کو پیش آیا اس سے کہیں زیادہ بڑے پیمانہ پر پوری انسانیت کے ساتھ پیش آنے والا ہے۔ اس دنیا میں موجود ہر انسان اللہ تعالیٰ کی ان گنت نعمتوں میں جی رہا ہے۔ ان نعمتوں کے جواب میں اسے اپنے رب کی بندگی اور شکرگزاری اختیار کرنی ضروری ہے۔ مگر انسان شکرگزاری کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے نافرمانی، ناشکری، غفلت، سرکشی اور شکوے شکایت کی نفسیات میں جیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر وہ اپنے اس رویے کی کوئی نہ کوئی تاویل بھی کر لیتا ہے۔

مگر ایک روز زندگی کی ملازمت سے ہر انسان کو اچانک فارغ کر دیا جاتا ہے۔ موت اس سے ہر نعمت چھین لیتی ہے۔ پھر قیامت کے دن یہ انسان رب کے سامنے پیش ہوگا۔ اس دن پروردگار اس پر واضح کر دیں گے کہ اس کا ہر رویہ غلط تھا۔ اللہ تو احسان کی جگہ پر کھڑے تھے۔ حق تلفی اگر کی تھی تو بندے نے اللہ کے معاملے میں کی تھی۔ اس روز انسان روئے گا۔ گڑگڑائے گا۔ معافی مانگے گا۔ ایک موقع اور مانگے گا۔ مگر اسے کوئی موقع نہیں دیا جائے گا۔

ہر زندہ انسان ابھی زندگی کی ملازمت پر باقی ہے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ شکرگزاری سیکھ لے۔ یہ موقع نکل گیا تو ابد تک اسے دوسرا موقع نہیں ملے گا۔ چاہے وہ کتنا روئے۔ چاہے وہ کتنا ہی تڑپے۔

گناہ اور اختلافات

گناہوں کی طرف لے جانے والا ایک بہت اہم عامل یہ ہے کہ انسان اپنے اندر انانیت کا ایک پہلو رکھتا ہے۔ وہ چیزوں کو اپنے زاویے اور ذہن کے لحاظ سے دیکھتا ہے۔ جب کسی معاملے میں ایک دفعہ اس کی رائے قائم ہوجائے تو پھر وہ دوسروں کو یہ حق دینے کے لیے بار ہا تیار نہیں ہوتا کہ وہ اس سے اختلاف کریں۔ اور اگر کوئی شخص اختلاف کرنے کی جرأت کرلے تو پھر انسان غصہ ونفرت کا شکار ہوجاتا ہے۔

اس حالت تک پہنچنے کے بعد انسان کی انا اسے اس بات پر ابھارتی ہے کہ وہ اختلاف کو عناد تک پہنچادے۔ وہ اختلاف کرنے والے کو دشمن سمجھے۔ اس کو بدنام کرے۔ اس پر الزام لگائے۔ اس کی طرف ایسی باتیں منسوب کرے جو اس نے نہیں کہیں۔ اس کو دوسروں کی نظر میں گرانے کی کوشش کرے۔ یہ رویہ سرتا سر اللہ تعالی کی نافرمانی کا رویہ ہے۔ اور غور کیا جائے تو یہ سب سے بڑھ کر شیطان کا رویہ تھا۔ اسے جب حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدے کا حکم ملا تو اس کی انانیت جاگ اٹھی۔ وہ تکبر کا شکار ہوگیا۔ اور آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کے خلاف سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہوگیا۔

شیطان یہی کام اب انسانوں کے درمیان کرتا رہتا ہے۔ وہ انسانوں کی اس کمزوری سے واقف ہے کہ انسان جب ساتھ رہتے ہیں تو بہرحال ان میں اختلاف ہوجاتا ہے۔ وہ اس اختلاف کو ہوا دے کر غصے اور انتقام میں بدل دیتا ہے۔ جس کے بعد انسان اللہ کی ہر حد پامال کرکے سرکشی اور فساد کا باعث بن جاتا ہے۔

اس اختلاف کی ایک نمایاں مثال ساس بہو کا وہ جھگڑا ہے جو ہمارے ہاں اکثر گھروں میں معمول بن گیا ہے۔ خاندانی نظام میں ایک لڑکی جب کسی مرد سے بیاہی جاتی ہے تو وہ بالعموم علیحدہ رہائش اختیار نہیں کرتی بلکہ سسرال میں آکر رہتی ہے۔ ایک مختلف ماحول سے آنے والی

اس لڑکی کا سامنا ایک نئے ماحول سے ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کی عادات اور رویوں کے بارے میں پوری معلومات نہیں ہوتی۔ پھر ہر شخص کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔ اپنی خواہشات ہوتی ہیں۔ یوں اختلاف کی بنا پڑ جاتی ہے۔

یہ اختلاف فطری ہے۔ اس کو حل کرنے کا ایک طریقہ صبر اور برداشت ہے۔ ایڈجسٹمنٹ اور عفو ودرگزر کا راستہ ہے۔ مگر لوگ اس حل کی طرف آنے کے بجائے فوراً اپنی مرضی کے مطابق معاملات کا رخ پھیرنا چاہتے ہیں۔ بدگمانی شروع ہوجاتی ہے۔ تجسس سے کام لیا جاتا ہے۔ غیبت اور بہتان کو راہ مل جاتی ہے۔ عدل واحسان کو ایک کونے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ جس کے بعد نہ صرف گھر کا سکون تباہ وبرباد ہوتا ہے بلکہ اللہ کی حدود کی نافرمانی کا کھلا مظاہرہ شروع ہوجاتا ہے۔

ہم جب توبہ اور خود احتسابی کا عمل شروع کریں تو اس بات کا بھی جائزہ لے لیں کہ ہم اختلاف کی حالت میں کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ہر اجتماعی موقع پر بہرحال اختلاف ہوگا۔ مگر ایسے میں کبھی انانیت کو سر اٹھانے نہ دیں۔ اختلاف ہوجائے تو کبھی عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ بلکہ احسان کی مٹھاس سے پیدا ہونے والی ہر تلخی کو ختم کردیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

> بس آپ امید کی شاہراہ کو اختیار کرلیجیے
> کامیابی کا ہر راستہ اسی راہ سے نکلتا ہے
> (ابویحییٰ)

زیادہ نمک

انسانی شخصیت میں جذبات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔رحم، ہمدردی، محبت وہ جذبات ہیں جو انسانی وجود کو وہ مٹھاس عطا کرتے ہیں جس کے بغیر زندگی کا ہر رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ان میٹھے جذبوں کے علاوہ انسانی شخصیت میں کچھ جذبات ایسے ہوتے ہیں جو نمک کی طرح ہوتے ہیں۔یعنی زندگی ان کے بغیر بھی پھیکی اور نامکمل ہی ہوتی ہے، لیکن ان کی خفیف مقدار بھی وجود انسانی میں زیادہ ہو جائے تو شخصیت تلخ ہو جاتی ہے۔ پھر ایسا انسان اسی طرح دوسروں کے لیے ناقابل قبول اور ناپسندیدہ ہو جاتا ہے جس طرح وہ سالن جس میں نمک تیز ہو جائے۔

ایسا ہی ایک جذبہ غصے کا ہے۔غصہ انسانی شخصیت کا ایک لازمی جز ہے۔غیرت، حمیت، بہادری اور استقامت کے خاندان کا ایک فرد ہونے کے ناطے اس کی بڑی قدر و قیمت ہے۔مگر جب یہ جذبہ چھوٹے بڑے کی تمیز اور موقع محل کی نزاکت کو فراموش کر کے ظاہر ہونے لگے، محض اپنی جھنجھلاہٹ کے اظہار کا ایک ذریعہ بن جائے، انسان کی عادت اور اس کے روزمرہ کا معمول بن جائے، جب یہ اعصاب پر قابو اور عقل کو معطل کر کے وجود کا احاطہ کر کے، جب یہ دوسروں کی تذلیل و توہین اور ان پر ظلم و زیادتی کا ایک ہتھیار بن جائے تو پھر اس کا سارا حسن بدصورتی، شوریدگی اور تلخی میں بدل جاتا ہے۔ یہ وہ نمک بن جاتا ہے جو لذیذ سالن کو زہر ہلاہل بنا دیتا ہے۔اور جس طرح شدید بھوک میں بھی ایسا سالن نہیں کھایا جاتا اسی طرح تمام تر مطلوبیت اور ضرورت کے باوجود ایسے لوگ نامطلوب ہو جاتے ہیں۔

انسان تنہا نہیں جی سکتے۔مگر کسی ایسے انسان کے ساتھ بھی نہیں جی سکتے جسے اپنے جذبات پر قابو نہ ہو۔اس لیے ہر انسان کو اپنے غصے پر قابو پانا سیکھنا چاہیے۔اس میں مشکل ہو تو کسی سمجھدار شخص یا کسی ماہر نفسیات سے رجوع کرنا چاہیے۔اس کے بغیر غصیلا انسان اپنی ہر خوبی کے باوجود لوگوں کو نامطلوب رہے گا۔وہ اپنا بھی نقصان کرے گا اور دوسروں کے لیے بھی باعث اذیت ہوگا۔

خوف اور امن

اس دنیا کا المیہ یہ ہے کہ یہاں انسان ہر وقت کسی نہ کسی اندیشے اور خوف کا شکار رہتا ہے۔امن و امان کی صورتحال کی بنا پر لوگ اپنی جان، مال اور آبرو کے متعلق تشویش میں مبتلا رہتے ہیں۔مثلاً اپنا مال و دولت ڈاکوؤں اور لٹیروں سے بچانے کے لیے وہ اسے بینکوں، تجوریوں اور لاکرز میں محفوظ رکھتے ہیں۔جس ملک میں جنگ یا فساد کی مصیبت آپڑے وہاں مال کے ساتھ جان اور آبرو بھی ہمہ وقت خطرے میں رہتے ہیں۔

جان، مال اور آبرو سے متعلق خارج سے اگر اطمینان ہو بھی جائے تو ان گنت حادثے، بیماریاں، معاشی اور معاشرتی مسائل انسان کا سکون درہم برہم کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ڈاکٹر اور ہسپتالوں کے چکر، بے روزگاری، خاندان میں کسی کی حادثاتی موت، گھریلو ناچاقی، کاروباری پریشانیاں، ذاتی زندگی میں پیش آنے والے جذباتی سانحات وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن سے انسان چاہے جتنی کوشش کر لے مفر ممکن نہیں۔

قرآن مجید کے مطابق یہ صرف جنت ہے جہاں فرشتے آزمائش کی نوید لے کر نہیں بلکہ سلامتی کا پیغام لے کر آرہے ہوں گے۔یہ وہ جگہ ہے جہاں اہل ایمان جنت کے بلند و بالا محلات میں امن و سکون کے ساتھ ہمیشہ رہیں گے،(سبا37:34)۔ ہر انسان کی خواہش اسی جنت کا حصول ہونا چاہیے جہاں اور تمام نعمتوں کے ساتھ امن و سکون کی نعمت بھی ہمہ وقت میسر ہوگی۔

یہ حقیقت ہے کہ اس دنیا میں زندگی کے بعد سب سے بڑی نعمت امن و سکون ہے۔ ہر نعمت اس وقت بے کار ہو جاتی ہے جب زندگی نہ رہے یا پھر انسان کو ان نعمتوں کو برتنے کے لیے سکون و اطمینان میسر نہ رہے۔ یہ صرف جنت ہے جہاں نعمتیں بھی ہوں گی اور ان سے لطف اٹھانے کے لیے کامل امن و چین بھی ہوگا۔

پکنک پوائنٹ

ستمبر کے آخری ہفتے میں صوبہ پنجاب میں ایک اندوہناک بس حادثے میں پکنک سے واپس آتے ہوئے 35 بچے جاں بحق ہوگئے۔ حادثے کے دو ہفتے بعد ایک وڈیو منظر عام پر آئی۔ اس وڈیو میں جو اسی بس میں سوار ایک بچے نے حادثے سے قبل بنائی تھی، یہ دکھایا گیا کہ تمام بچے خوشی سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ جو کچھ پکنک کے سفر میں عموماً ہوتا ہے یعنی میوزک، باہمی گفتگو، ہنسی مذاق وہی سب بچے کر رہے تھے۔

یہ منظر یقیناً ہر دردمند دل کے لیے بڑا دلگداز منظر تھا کہ کس طرح نوجوانی کی حدود کو چھونے والے یہ بچے موت کے المیے سے کچھ دیر قبل تک عالم خوشی وطرب میں اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کے ساتھ کیا حادثہ پیش آنے والا ہے۔ تاہم اس وڈیو کو ایک دوسرے زاویہ سے دیکھنے سے انسانوں کا ایک عجیب المیہ بھی سامنے آتا ہے۔ یہ المیہ ایک طربیہ سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں انسان اس تاریک اور ناقابل رہائش کائنات میں ہونے کے باوجود ایک ایسی دنیا میں آنکھ کھولتا ہے جہاں زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں اور حسن وجمال کے ساتھ رونق افروز ہے۔ اس دنیا میں انسان کے پاس ہر وہ چیز ہے جس سے وہ اپنی ضروریات پوری کرسکے۔ وہ دیکھ سکتا ہے، سن سکتا ہے، بول سکتا ہے، سونگھ سکتا ہے۔ وہ چل سکتا ہے، پکڑ سکتا ہے، وہ چھو سکتا ہے۔

معاملہ صرف ضروریات تک محدود نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر وہ زندگی کے ہر رنگ، ہر ذائقے، ہر خوشبو، ہر منظر اور ہر خوشی کو پوری طرح انجوائے کرسکتا ہے۔ یہ سب دیکھ کر انسان اس دنیا کو پکنک پوائنٹ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ مسرتوں اور خوشیوں کی تلاش کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیتا ہے۔ وہ سہولیات اور آسائشوں کے حصول کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیتا ہے۔ وہ کبھی بھولے سے بھی یہ نہیں سوچتا کہ ان ویران، بے انتہا سرد اور ناقابل برداشت گرم کائنات کے مجموعے

میں اتنی حسین دنیا کس نے تخلیق کی اور اس کے لیے مسخر کردی۔ وہ دنیا جس میں دریا کی روانی، سبزے کی ہریالی، سمندروں کی وسعت، نیلگوں آسمان کی بلندی، تاروں کی جگمگاہٹ، سورج کی روشنی اور ان گنت مفید اور دلکش چیزیں موجود ہیں۔ وہ اس دنیا کے خالق کو داد دینے، اس کا شکر ادا کرنے، اس کی بندگی اور اطاعت کرنے میں بہت بخیل اور سست واقع ہوتا ہے۔ اس کی نظر میں دنیا صرف ایک پکنک پوائنٹ بنی رہتی ہے۔

اسے بتانے والے بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ دنیا ایک پکنک پوائنٹ نہیں، بلکہ ایک امتحان گاہ ہے۔ یہ بے مقصد و بے کار نہیں کہ ازل کی راہ سے آنے والے کچھ دیر خیمہ دنیا میں جامہ وجود زیب تن کرکے محفل عیش وطرب برپا کریں اور پھر عدم کی منزل کو گامزن ہوجائیں۔ یہ دنیا ایک ابدی کیریئر کے آغاز سے قبل لیا جانے والا پہلا اور آخری امتحان ہے۔ جو اس امتحان میں سرخرو ہوا وہ جنت کے ابدی پکنک پوائنٹ میں بسا دیا جائے گا جو ناکام ہوا، اس کے حصے میں کائنات کی ساری تاریکیاں آئیں گی اور اگر کچھ روشنی ہوئی تو صرف اس بھڑکتی ہوئی آگ کی جو ناکام ہونے والوں کی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دے گی۔

آہ! مگر یہ انسان نہیں سنتا۔ بالکل نہیں سنتا۔ عارضی دنیا میں مگن رہتا ہے۔ اسی کی خوشی وغم کو حقیقت سمجھ کر ایک ایسے سراب کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے جو کبھی حقیقت نہیں بنے گا۔ پھر ایک روز حادثہ ہوجاتا ہے۔ زندگی کی بس کریش ہوجاتی ہے۔ موت کا فرشتہ آموجود ہوتا ہے۔ پھر اسے سمجھ آجاتی ہے کہ وہ ایک امتحان گاہ میں موجود تھا جسے بدقسمتی سے اس نے پکنک پوائنٹ سمجھ لیا۔ مگر دیر ہوچکی ہوتی ہے۔ اس کے بعد تو بس رونا باقی رہتا ہے یا چیخنا۔

کلر کہار حادثے کی اس وڈیو میں انسان کے اسی المیے کا بیان بھی ہے۔ مگر ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو اس کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ سوال ہم میں سے ہر شخص کو خود سے کرنا چاہیے۔

شکوہ کے بجائے شکر

انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ہر گھڑی اور ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی ان گنت نعمتوں میں جیتا ہے۔ ہاتھ پاؤں جیسے اعضا، دیکھنے سننے جیسی قوتیں، ذہن وزبان جیسی صلاحیتیں، مال واولاد جیسی نعمتیں، میاں بیوی جیسے رشتے، یہ سب وہ کرم نوازیاں ہیں جو ساری زندگی انسان کو بلا استحقاق ملتی رہتی ہیں، مگر انسانوں میں سے شاذ ہی ہوں گے جو ان نعمتوں پر دل وجان کی گہرائی سے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوں۔

ہاں ان میں سے کوئی نعمت اگر انسان سے چھن جائے؛ کسی قریبی رشتے دار کی موت ہو جائے، ہاتھ پاؤں یا سماعت وبصارت وغیرہ چھن جائے، جان ومال کا کوئی نقصان ہوجائے تو انسان کی دنیا اندھیر ہوجاتی ہے۔ صدمے کی شدت سے انسان بے حال ہوجاتے ہیں۔ اکثر لوگ ایسے میں شکوہ اور شکایت شروع کردیتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ان میں سے کوئی نعمت ان کا حق نہیں تھی، بلکہ یہ رب کریم کی مہربانی تھی جو اس نے اپنی عنایت سے عطا کی تو انسان نے شکر نہیں کیا اور اپنی حکمت سے واپس لی تو انسان نے صبر نہیں کیا۔

انسان کو اگر حقیقت کا ادراک ہوجائے تو وہ مصیبت آنے سے پہلے سراپا شکر بن کر زندگی گزارے۔ جتنی تڑپ سے لوگ مصیبت پر روتے ہیں وہ اتنی ہی شدت سے نعمت چھننے سے پہلے اس کا شکر ادا کریں گے۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں، سماعت وبصارت، دل ودماغ، مال واولاد اور میاں بیوی جیسے رشتے کے دیے جانے پر صبح وشام رب کی کبریائی اور حمد بیان کریں گے۔ وہ لمحہ لمحہ اس کی شکر گزاری کریں گے۔

شکوے کے بجائے شکر کرنے والے یہی وہ لوگ ہیں جن کی نعمتوں میں اللہ تعالیٰ برکت دیتے ہیں اور دنیا میں محرومی سے زیادہ انہیں عطا وبخشش الٰہی سے واسطہ پڑتا ہے۔

ایک سجدے کے عوض

آخر کار 20 اکتوبر 2011 بروز جمعرات لیبیا کے حکمران معمر قذافی کو ہلاک کردیا گیا۔ جون 1942 میں پیدا ہونے والے قذافی کی عمر موت کے وقت 69 برس تھی۔ ان میں سے 42 برس وہ لیبیا کے بلا شرکت غیر حکمران رہے۔ جمہوریت کو تو چھوڑیے کہ جس میں بیشتر ملکوں میں حکمران 5 برسوں میں بدل جاتے ہیں، قدیم بادشاہت میں بھی چند ہی مثالیں ملتی ہیں جب کوئی شخص 40 برس سے زائد عرصے تک مسند اقتدار پر فائز رہا ہو۔

انسانی خواہشات کی اگر کوئی فہرست ترتیب دی جائے تو اس میں سب سے بنیادی خواہش زندگی کی ہوگی اور سب سے بڑی خواہش اقتدار کی۔ زندگی اور اقتدار کوئی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ مگر المیہ یہ ہے کہ انسان کو ایک روز یہ دونوں چیزیں مجبوراً چھوڑنی پڑتی ہیں۔ چاہے انسان کی زندگی 69 سال کی ہو یا اس کا اقتدار 42 برسوں پر محیط ہوجائے۔

اس کائنات میں صرف ایک ہستی ہے جس کی زندگی کو موت کا اندیشہ نہیں اور جس کے اقتدار کو کسی بغاوت اور تبدیلی کا خوف نہیں۔ وہ اللہ پروردگار عالم ہے...... معبود برحق...... بادشاہِ حقیقی۔ وہ زندہ ہے اور اس کا اقتدار ہمیشہ رہے گا۔ جس انسان کو اس بات کا یقین ہوجائے وہ قذافی جیسے لوگوں سے لے کر ایک عام انسان کی موت کی خبر سن کر بے اختیار سجدے میں گر جائے۔ وہ رو رو کر کہے گا کہ پروردگار یہ صرف تیری ذات ہے جسے موت نہیں۔ یہ صرف تیرا اقتدار ہے جسے زوال نہیں۔ پروردگار کو یہ سجدہ اتنا محبوب ہوتا ہے کہ اس کے جواب میں وہ ایک فانی اور عاجز انسان کو ہمیشہ کی زندگی اور جنت کا نہ ختم ہونے والا اقتدار دے دیتا ہے۔

کتنا کمزور ہے یہ عاجز انسان جو زندگی اور اقتدار کی خواہش کے باوجود ان سے محروم ہوجاتا ہے۔ کتنا کریم ہے وہ رب جو ایک سجدے کے عوض یہ سب کچھ اسے عطا کردیتا ہے۔

بن دیکھے کا سودا

پچھلے دنوں ای میل پر ایک دلچسپ حکایت موصول ہوئی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہارون الرشید بادشاہ اپنی بیگم زبیدہ خاتون کے ہمراہ دریا کنارے ٹہل رہے تھے کہ ان کی ملاقات ایک معروف بزرگ بہلول سے ہوگئی۔ بہلول ریت پر گھر بنا رہے تھے۔ انہوں نے بادشاہ سے کہا یہ گھر ایک دینار میں خرید لو۔ میں دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ تمھیں جنت میں ایک گھر عطا کردے۔ بادشاہ نے اسے دیوانے کی بڑ سمجھا اور آگے بڑھ گئے۔ البتہ ملکہ نے انھیں ایک دینار دے کر کہا کہ میرے لیے دعا کیجیے گا۔

رات کو بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ جنت میں ان کی بیگم کا محل بنا دیا گیا ہے۔ اگلے دن بادشاہ نے بہلول کو وہی کچھ کرتے ہوئے دیکھا تو ان سے کہا کہ میں بھی جنت میں محل خریدنا چاہتا ہوں۔ بہلول نے جواب دیا کہ آج اس محل کی قیمت پوری دنیا کی بادشاہی ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ یہ قیمت میں تو کیا کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ مگر کل سے آج تک تم نے اس گھر کی قیمت اتنی کیوں بڑھا دی۔ بہلول نے جواب دیا جنت کا سودا بن دیکھے بہت سستا ہے، مگر دیکھنے کے بعد ساری دنیا کی بادشاہت بھی اس کی کم قیمت ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ایک حکایت ہے جس کے صحیح یا غلط ہونے کی بحث غیر متعلقہ ہے لیکن جو بات اس میں بیان ہوئی ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ آخرت کی آنے والی دنیا کی ہر حقیقت اتنی غیر معمولی ہے کہ اس کے سامنے ساری دنیا کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ آنے والی اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات والا صفات ہے۔ وہ رب اتنا طاقتور اور اس کے مقابلے میں تمام مخلوقات اس قدر کمزور ہیں کہ سب مل کر بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

وہ رب آج اپنی بندگی کی دعوت دے رہا ہے۔ مگر لوگ اس کی عبادت بلکہ اس کے وجود کے

بھی منکر ہیں۔ صرف اس لیے کہ اپنی تمام تر طاقت و عظمت کے باوجود وہ رب پردہ غیب میں ہے۔ وہ فوراً کسی مجرم کو نہیں پکڑتا۔ وہ کسی انسان کو نظر بھی نہیں آتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنی کمزور اور بے وقعت ہستی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ یا پھر ان کی جبین نیاز جھکتی بھی ہے تو کسی ایسی مخلوق کے سامنے جو انہیں نظر آ رہی ہو۔ چاہے وہ کوئی بت ہو یا کوئی قبر۔ کل قیامت کے دن ان میں سے ہر مخلوق کی بے وقعتی اور خدا کی عظمت کا مشاہدہ انسان اپنی آنکھوں سے کر لے گا۔ مگر اس وقت نہ خدا کے سامنے جھکنا کام آئے گا نہ اس کی بندگی کوئی فائدہ دے گی۔

یہی معاملہ جنت کا ہے۔ دنیا کی معمولی نعمتوں کو سب کچھ سمجھنے والے انسانوں کو اگر جنت نظر آ جائے تو ان کی آنکھیں پھٹ جائیں گی۔ اس جنت کا حسن، اس کی نعمتوں کی کثرت، اس کی ابدی زندگی اور اس کا لافانی عیش ایسا ہے کہ اس کے لیے انسان اپنی پوری زندگی اور پوری دنیا کو بھی بطور قیمت پیش کر دے تو یہ کم ہے۔ مگر چونکہ یہ جنت پردہ غیب میں مستور ہے۔ اس لیے اس کی قیمت بہت ہی کم رکھی گئی ہے۔ دن میں صرف پنج وقتہ نماز کے لیے بمشکل ایک گھنٹہ، سال میں ایک ماہ کے روزے، اگر بچت اور گنجائش ہو تو سالانہ معمولی زکوٰۃ اور زندگی میں ایک دفعہ حج۔ بس یہی جنت کی کم از کم قیمت ہے۔ مگر آج لوگوں کو یہ قیمت بھی گراں گزرتی ہے۔

یہی معاملہ جہنم کے ان عذابوں کا ہے جن کی ایک جھلک بھی انسان دیکھ لے تو ساری زندگی گناہوں اور نافرمانی کے ہر کام سے دور رہے گا۔ مگر چونکہ یہ جہنم اور اس کے بدترین عذاب آج آنکھوں سے دور ہیں، اس لیے انسان انہیں بھول کر عارضی اور فانی زندگی کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے اور اللہ کی ہر حد کو پامال کر دیتا ہے۔

سچ یہ ہے کہ آخرت کا ہر سودا ایسا ہے کہ انسان اس کے لیے سب کچھ دے ڈالے، مگر غیب کے پردے کی بنا پر یہ سودا بہت سستا ہے۔ کل قیامت کے دن انسان ہر قیمت دے کر یہ سودا کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا، مگر اس روز کسی قیمت پر یہ سودا نہیں کیا جائے گا۔

شاپنگ کلچر

تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانوں کی زندگی کا مرکز مختلف چیزیں رہی ہیں۔ایک دور وہ تھا جب انسان خارج میں موجود مخلوقات کو معبود کے مقام پر رکھتا اور انہی کی رضا وخوشنودی کو اپنی زندگی کا نصب العین بناتا تھا۔ یہ زیادہ تر زراعتی دوریا ایگریکلچرل ایج کا زمانہ تھا۔اس دور میں رائج کلچر کو ہم معبود کلچر کہہ سکتے ہیں۔ پھر صنعتی دور یا انڈسٹریل ایج کا زمانہ آیا جب انسان ان سارے خداؤں سے فارغ ہوگیا۔اس دور میں مخلوقات عبادت کا نہیں بلکہ تحقیق کا موضوع بن گئیں۔ یہ وہ دور تھا جس میں کائنات انسانی فکر وفہم کا مرکز نگاہ بن گئی۔ایجادات اور تحقیقات نے دنیا بدل کر رکھ دی اور کل کائنات انسان کے لیے مسخر ہوگئی۔ چنانچہ اس کلچر کو ہم تسخیر کائنات کلچر کہہ سکتے ہیں۔

اکیسویں صدی میں ایک نیا دور شروع ہو چکا ہے۔ یہ انفارمیشن ایج ہے۔اس دور میں ایجاد واختراع کا دروازہ بند تو نہیں ہوا، لیکن اس کا رخ انسانی خواہشات کی تسکین کی طرف ہو چکا ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ آج ہر انسان کی زندگی کا مقصد لذت کا حصول اور اپنے اردگرد مادی دنیا کی رونقوں کو جمع کر لینا ہے۔ چنانچہ سائنسدان، انجینیئر ،صنعتکار اور تاجر ایسی اشیا بنانے اور ان کی تیاری میں لگے رہتے ہیں جو انسانی زندگی کو آسائش اور سہولت سے بھر دیں۔ بازار، دکانیں، شاپنگ سنٹر ان مادی اشیا سے بھرے ہوئے ہیں جو انسانوں کے لیے باعث کشش ہوتی ہیں۔اخبارات، ریڈیو، ٹیلیوژن اور سینیما میں اشتہارات کا انبار لگا ہوا ہے تاکہ لوگ خریداری کی طرف مائل ہو جائیں۔

اس پس منظر میں ہم آج کے زمانے کو خریداری یا شاپنگ کلچر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔جس میں آج ہر انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمائے اور زیادہ سے زیادہ

چیزیں خریدے اور انہیں استعمال کرے۔ یہ گویا انسانی فکر کا آخری ارتقا ہے جب اس نے یہ حقیقت جان لی ہے کہ نہ صرف اس کے اندر لذت اندوزی کی بے پناہ صلاحیت ہے بلکہ اس کائنات میں بھی اس کی لذت کو تسکین بخشنے کی غیر معمولی استطاعت ہے۔گرچہ انسان کی اس لذت اندوزی کو بے مزہ کرنے کے لیے غربت، بیماری، مصائب، محرومی، معذوری، بوریت، محدودیت اور سب سے بڑھ کر موت اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ یہ سب چیزیں انسان کی بنائی ہوئی ہر مادی جنت کو کسی بھی وقت اجاڑ سکتی ہیں۔

یہ صرف پروردگار عالم کی جنت ہے جہاں انسان ان تمام مسائل سے محفوظ رہ کر ختم نہ ہونے والی زندگی میں ہمیشہ خوشی وکامرانی کی زندگی جیے گا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ جنت بھی دراصل ایک خریداری کلچر کے نتیجے میں انسان کو ملتی ہے۔ یہ خریداری کلچر وہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں (التوبہ 111:9) میں ہے۔اس کلچر میں انسان اپنے وقت، اپنی صلاحیت، اپنے مال اور سب سے بڑھ کر اپنی جان کا بہترین مصرف یہ سمجھتا ہے کہ ان سے جنت خریدی جائے۔اس مقصد کے لیے وہ نیکیوں کے سکے جمع کرتا ہے، بھلائیوں کی کرنسی سمیٹتا ہے، عبادت واطاعت کی انویسٹمنٹ میں اپنے جان اور مال کو کھپاتا ہے، انسانی خدمت کے میدان میں تگ ودو کرتا ہے، نصرت دین کی مدا اور رشتہ داروں کی مدد کے لیے خرچ کرتا ہے، کمزوروں اور ضعیفوں کی رعایت کرتا ہے۔

یہ کلچر بظاہر آج ایک غیر مقبول کلچر ہے۔مگر وہ کلچر ہے جو انسانیت کا ابدی کلچر ہے۔ یہ کلچر قیامت کے فوراً بعد شروع ہوگا اور کبھی ختم نہیں ہوگا۔اس ابدی کلچر میں جنت کے خریداروں کے لیے ختم نہ ہونے والی خوشیاں ہوں گی۔ بے حساب نعمت ہوگی۔ بے خوف زندگی ہوگی۔ بے انتہا لذت ہوگی۔ بے حد تسکین ہوگی۔ بے پناہ سرور ہوگا۔ بے اندازہ مسرت ہوگی۔

کاش شاپنگ کلچر کا انسان اس آنے والے کلچر کو جان لے۔

مردوں کے کان

اردو زبان میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ مردوں کے کان ہوتے ہیں آنکھیں نہیں ہوتیں۔ یہ کہاوت ظاہر ہے خاندانی جھگڑوں میں مردوں کے کردار کا بیان ہے، مگر درحقیقت یہ ایک ایسی انسانی کمزوری کا بیان ہے جس پر اگر قابو نہ پایا جائے تو معاشرہ ہر پہلو سے انتشار کا شکار ہوسکتا ہے۔

ساس بہو کا جھگڑا ہماری معاشرت کا ایک حصہ ہے۔ اس جنگ میں فریقین کی خواہش ہوتی ہے کہ مرد جو کہ ماں کا بیٹا اور بیوی کا شوہر ہوتا ہے، اسے اپنی طرف کرلیا جائے۔ کسی بھی اختلاف کی شکل میں دونوں طرف کی خواتین بات کو اپنے انداز سے بیان کرتی ہیں۔ ایسے میں مرد اگر صرف اپنے کانوں کا استعمال کرے اور جو فریق زیادہ چرب زبان اور ہوشیار ہو اس کی باتوں کو درست مان کر اس کی طرفداری کرنے لگے تو وہ زیادتی کا مرتکب ہوگا۔ مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی آنکھیں بھی استعمال کرے۔ یعنی حقائق کا جائزہ لے، ہر معاملے کی پوری تحقیق کرے اور اس کے بعد ہی کوئی رائے قائم کرے۔

سنی سنائی باتوں پر یقین کرنے کے بجائے پوری معلومات، مکمل چھان بین اور غیر جانبدارانہ تحقیق کے بعد رائے قائم کرنا نہ صرف ہمارے دین کی ایک بنیادی تعلیم ہے بلکہ علم، اخلاق اور عقل کا بھی ایک لازمی تقاضہ ہے۔ بدقسمتی سے اس دور انحطاط میں مسلمان جن اعلیٰ اخلاقی اور دینی صفات سے محروم ہوچکے ہیں، ان میں سے ایک وصف یہ بھی ہے۔ اس کے نتائج ہم خاندانی جھگڑوں کی شکل میں بھی دیکھتے ہیں اور معاشرے میں روز افزوں انتشار، عناد، باہمی نفرت اور تعلقات کی خرابی کی شکل میں ہر روز ہمارے سامنے آتے ہیں۔

لیکن ایک حقیقی مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے کانوں کے ساتھ آنکھوں کا بھی استعمال کرے اور تعصب سے دور رہ کر مکمل تحقیق کے بعد ہی کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرے۔

یہ ایک سجدہ

انسان کا چہرہ اور سر اس کی عزت و شرف کا اظہار ہے۔ ہماری زبان کے متعدد محاورے یہ بتاتے ہیں کہ جسم کے اس حصے کا انسانی شرف سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ سر جھکانا، ناک نیچی کرنا، منہ نہ لگانا، ناک رگڑوا دینا، منہ پر تھوکنا وغیرہ جیسے اسالیب اور محاورے اسی شرف کے ہونے یا نہ ہونے کا بڑا عمدہ بیان ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ وہ اپنے اس چہرے اور سر کو پروردگار کے سامنے زمین پر ڈال دے۔ یہ وہ عبادت ہے جسے ہم سجدہ کہتے ہیں۔ سجدے میں انسان کا سر اور ناک زمین پر رگڑتا ہے اور اس کا وجود اس ہستی کے سامنے ڈھے پڑتا ہے جس نے اسے سب کچھ عطا کر رکھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انسان سجدہ میں رب کا قرب حاصل کرلیتا ہے۔

مگر اکثر عبادت کرنے والے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو سجدے کو نماز کا بس ایک جز سمجھ کر رسمی طور پر سجدہ کرنے پر چھوٹ جاتے ہیں۔ اس سجدہ میں وہ تین دفعہ گنتی کرکے ایک تسبیح پڑھتے ہیں اور اس کے علاوہ انہیں احساس نہیں ہوتا کہ انہوں نے کیا کیا ہے۔ حالانکہ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سجدہ کرکے انسان اپنے شرف اور عزت کے سب سے بڑے مقام کو اپنے رب کے سامنے پست اور ذلیل کردیتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جس کا ہم کسی دوسرے انسان کے سامنے کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔

انسان اگر اس احساس کے ساتھ سجدہ کرے تو اس کی کیفیت بدل جائے گی۔ خاص کر یہ سجدہ اگر نماز سے باہر کیا جائے تو پھر یہ عادتاً اور رسماً کیا جانے والا سجدہ نہیں رہے گا بلکہ یہ اپنی ذات میں ایک ایسی اور مکمل عبادت کی لذت اور حلاوت انسان کو عطا کرے گا جو کسی اور ذریعے سے انسان کو نہیں مل سکتی۔ سجدہ بلاشبہ ایک عظیم عبادت ہے، بشرطیکہ سوچ سمجھ کر کیا جائے۔

لکھنے والے

"فرشتوں پر ایمان کا مطلب کیا ہے؟"، یہ آج کی نشست کا آغاز تھا جس کے شروع ہی میں عارف نے حاضرین مجلس کے سامنے ایک سوال رکھ دیا تھا۔ مجلس میں موجود ایک صاحب علم نے جواب دیا "مشرکین عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ فرشتوں کا خدائی میں کوئی حصہ ہے۔ چنانچہ قرآن نے یہ واضح کیا ہے کہ وہ معبود نہیں بلکہ بندے ہیں۔ وہ رب کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے نہ ان کا پروردگار کی خدائی میں کوئی حصہ ہے۔"

"مشرکین کے بعد سے لے کر آج تک کے مسلمانوں کے لیے فرشتوں پر ایمان کا کیا مطلب ہے؟"، ان کے جواب کو قبول کرتے ہوئے، مگر اس کے ساتھ اپنے اصل مدعا کو واضح کرنے کے لیے عارف نے اپنا سوال کچھ مختلف انداز سے دہرایا۔ اس دفعہ نشست میں کوئی آواز نہیں ابھری۔ مطلب صاف تھا کہ اب لوگ عارف کی بات ہی سننا چاہتے ہیں۔ وہ گویا ہوئے:

"بے شک فرشتے معبود نہیں نہ خدائی میں ان کا کوئی حصہ ہے۔ مگر ہمارے لیے ان پر ایمان کے حوالے سے یہ بات زیادہ اہم ہے کہ وہ ہماری خلوت وجلوت کے ساتھی ہیں۔ ہماری زبان کا ہر لفظ وہ لکھ لیتے اور ہمارے ہر فعل کے گواہ بن جاتے ہیں۔ وہ امین ہیں، بہت طاقتور ہیں، بہت عزت والے ہیں۔ ہم نہ ان کو رشوت دے سکتے ہیں۔ نہ انہیں کچھ لکھنے سے روک سکتے ہیں نہ ان کا لکھا بدل سکتے ہیں۔ قیامت کے دن ان کا لکھا ہوا ہی ہماری ابدی زندگی کا فیصلہ کرے گا۔

سو ان پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا عمل بدل جائے۔ جس کا عمل بدل گیا وہی حقیقتاً ایمان والا ہے۔ اور جس کا عمل نہیں بدلا وہ بس نام کا مسلمان ہے۔"

عارف کی بات ختم ہوگئی، مگر بات دلوں میں اتر گئی۔ فرشتوں نے عارف کی ان باتوں کو بھی لکھ لیا اور حاضرین کی سماعتوں کو بھی نامہ اعمال میں درج کرلیا۔

میں وہی ہوں مومن مبتلا

ایک صاحب کا معمول تھا کہ عام حالات میں صبح وشام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا کرتے کہ پروردگار مجھے اس وقت کوئی غم کوئی پریشانی نہیں۔ میں نہ بیمار ہوں اور نہ تنگدست۔ یہ وہ حال ہے جس میں اکثر لوگ تجھے بھول جاتے ہیں۔ مگر میرے مولیٰ میں اس حال میں بھی تجھے یاد رکھے ہوئے ہوں اور کسی بیمار اور پریشان حال شخص سے بڑھ کر تجھے پکارتا ہوں اور تیری تعریف، تسبیح اور شکر کرتا ہوں۔

کچھ عرصے بعد ان صاحب کو ایک بہت شدید مسئلے کا سامنا ہو گیا جس کا حل کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ اب انہوں نے پروردگار سے صبح وشام اس طرح دعا کرنا شروع کردی کہ پروردگار میں وہی خوشحال شخص ہوں جو آسانی وراحت میں تجھے نہیں بھولا تھا۔ تیری یاد اور عبادت میری زندگی رہی۔ تیرے بندوں پر خرچ کرنا اور ان کی خدمت میری عادت رہی۔ اب میں مشکل میں گھر گیا ہوں۔ میری مدد فرما۔ کچھ ہی عرصے میں معجزانہ طور پر ان کا مسئلہ حل ہو گیا۔

میں نے یہ واقعہ سنا تو مجھے اردو کے کلاسیکل شاعر مومن کا ایک بے مثال شعر یاد آ گیا۔ یہ شعر ان کی ایک انتہائی خوبصورت غزل کا مقطع ہے جس میں وہ اپنے محبوب سے کہتے ہیں۔

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

حکیم مومن خان مومن کی غزل کا محبوب شاید انہیں بھول گیا تھا۔ مگر پروردگار عالم کچھ نہیں بھولتا۔ خاص طور پر جن لوگوں کو وہ ایک دفعہ باوفا کہہ دے اور جن کو وہ اپنے وفاداروں میں گن لے، ان کی ہر مصیبت اور دکھ میں وہ ان کے ساتھ کھڑا رہتا ہے۔ زندگی کی ہر مشکل وہ ان پر آسان کر دیتا ہے۔ ہر حال میں ان کی مدد کرتا ہے۔ کبھی حکمت کا تقاضہ یہ ہو کہ سختی آ بھی جائے

تب بھی وہ ان کے قلب پر سکینت نازل کر کے انہیں ذہنی سکون سے محروم نہیں ہونے دیتا۔

پروردگار مصیبت میں پکارنے والے ہر شخص کے ساتھ یہی معاملہ کرتے ہیں، مگر ان لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ خصوصی طور پر کیا جاتا ہے جو خوشی اور آسانی کے لمحات میں رب کریم کو نہیں بھولتے۔ ایسا مومن جب کسی سختی میں ''مبتلا'' ہوجاتا ہے تو اسے پروردگار سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی:

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

بلکہ اس کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی ہر مشکل کو پروردگار پیدا ہونے سے پہلے ہی حل کرنے کا بندوبست کردیتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ان کی حکمت کہ تحت اس مومن کی بھلائی ہی میں وہ مسئلہ حل ہونے میں کچھ وقت لے، لیکن ایسے کسی شخص کو بے آسرا اور بے سہارا نہیں چھوڑا جاتا۔ اور یہ ممکن بھی کیسے ہے۔ جو مہربان بے وفاؤں اور احسان فراموش لوگوں پر عنایت سے نہیں رکتا وہ اپنے وفاداروں کو کیسے بھول سکتا ہے۔

خدا کی یہی صفت ہے جو اسے اپنے بندوں کی نظر میں کائنات کی محبوب ترین ہستی بنادیتی ہے۔ بے شک خدا ہی اس قابل ہے کہ اس سے سب سے بڑھ کر محبت کی جائے۔

☆☆☆☆☆☆☆

خوشی سب کچھ پالینے کا نام نہیں
یہ پائے ہوئے میں خوش رہنے کا نام ہے
(ابو یحییٰ)

جہنم کی قید

میں پچھلے چار گھنٹے سے اپنے ہی گھر کی اسٹڈی میں قید ہوں۔ میں عشا کی نماز پڑھ کر یہاں آیا تھا اور اپنے بچے کی دراندازی سے بچنے کے لیے دروازہ لاک کردیا تھا۔ دوبارہ دروازہ کھولنے کی کوشش میں لاک ٹوٹ گیا۔ دروازہ توڑنے سے بچنے کے لیے گھر والے اور میرے دوست پچھلے چار گھنٹے سے کسی چابی والے کی تلاش میں ہیں مگر بے سود۔

بھوک پیاس اور اس قید میں جو سب سے بڑی دریافت میں نے کی ہے اور جسے اس وقت میں تحریر کررہا ہوں وہ قرآن مجید کی اس آیت کا مفہوم ہے جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

''پس چکھو (عذاب کا مزہ) جیسے تم نے اس دن کی ملاقات کو بھلادیا۔ (آج) ہم بھی تمہیں بھول چکے ہیں اور چکھو ہمیشہ رہنے والے عذاب کا مزہ اپنے اعمال کی پاداش میں۔''

یہ سورہ سجدہ کی آیت 14 ہے۔ اسی سورت کی آیت 20 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''جب کبھی وہ اس سے نکلنا چاہیں گے اس میں دھکیل دیے جائیں گے۔''

اپنے ہی گھر میں اور اس احساس کے ساتھ کہ میرے گھر والے، رشتہ دار اور میرا عزیز دوست ضیا مسلسل مجھے یاد رکھے ہوئے اور مجھے باہر نکالنے کی کوشش کررہے ہیں، میرے لیے یہ قید کاٹنا آسان ہے۔ مگر مجھے یہ احساس بھی ہورہا ہے کہ جہنم میں قید ان لوگوں کی بے کسی کا کیا عالم ہوگا جن کو جہنم کے قید خانے میں بدترین عذاب دیے جارہے ہوں گے۔ یہاں سے نکلنے کی واحد امید اللہ کی ذات ہوگی۔ مگر اللہ انہیں بھول چکا ہوگا۔ اب رہے جہنم کے دروازے تو ان پر جہنم کے وہ سخت گیر داروغہ تعینات ہوں گے جو ان کے باہر نکلنے کی ہر کوشش ناکام بنادیں گے۔

کاش انسان اس دن کے آنے سے قبل جہنم کی اس مایوسی اور اس کے عذاب کی شدت کو سمجھ لیں۔ کاش قید خانے میں جانے سے قبل لوگ خود کو اس قید سے چھڑالیں۔

صحت کا راز

پچھلی تین دہائیوں میں ہمارے ملک میں جس جائز کاروبار نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے، ان میں فارمیسی یا دوافروشی سرفہرست ہے۔ اس کی وجہ ہمارے ہاں لوگوں کی صحت کا مسلسل گرتے رہنا ہے۔ صحت کی یہ خرابی کئی پہلوؤں سے بڑی المناک بات ہے۔ پہلی یہ کہ اس کے نتیجے میں لوگ نسبتاً کم عمری میں دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔ ہارٹ، شگر، بلڈ پریشر وغیرہ جیسے امراض لوگوں کو طبعی عمر سے پہلے ہی موت کے شکنجے میں جکڑ دیتے ہیں۔

دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ جب تک جیتے ہیں مسلسل امراض کی زد میں رہتے ہیں۔ ہر موسمی تبدیلی کے ساتھ وائرل انفیکشن اور بخار وغیرہ سے لے کر جان لیوا امراض بہت سے لوگوں کے لیے زندگی کا لازمی حصہ بن جاتے ہیں۔ کمزور صحت کا تیسرا اور سب سے عام پہلو یہ ہے کہ انسان طاقت اور توانائی کے اس سرچشمے کے بغیر زندگی گزارتا ہے جس میں زندگی کا سارا لطف پوشیدہ ہوتا ہے۔ تھکان، نڈھال پن، کمزوری، کام کرنے کی کم تر استعداد تو وہ چیزیں ہیں جن سے مستثنیٰ لوگ ڈھونڈنے آسان نہیں ہوں گے۔

ان سب کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ آج کے دور میں بیمار ہونا ایک بہت مہنگا سودا ہے۔ دکھ، تکلیف جھیلنے اور کام کاج سے دوری کے علاوہ چھوٹی سے چھوٹی بیماری پر اتنے پیسے خرچ ہوتے ہیں کہ ان پیسوں سے انسان اپنی بہت سی ضروریات پوری کرسکتا ہے۔

یہ سارا المیہ اس حقیقت کے باوجود رونما ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم کو بیماریوں سے لڑنے، اپنی طاقت برقرار رکھنے کی غیر معمولی صلاحیت عطا کی ہے۔ شرط صرف یہ ہوتی ہے کہ ہم ان چند بری عادتوں سے خود کو بچالیں جو انسان کو پہلے کمزور پھر بیمار اور پھر بے کار کردیتی ہیں۔ یہ عادتیں تو کئی ہیں، لیکن ان میں سب سے اہم اور بنیادی عادت نامناسب خوراک ہے۔ ہمارے

ملک میں یہ المیہ ہے کہ تیل، مٹھاس اور مرچ مصالحوں کی لت لوگوں کو اس قدر پڑ چکی ہے کہ ان چیزوں کی کمی کے ساتھ وہ کوئی غذا کھانا پسند ہی نہیں کرتے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اشیا اور ان سے بننے والی اکثر بازاری چیزیں بہت مہنگی بھی ہوتی ہیں اور غیر معیاری بھی ہوتی ہیں جو برسہا برس کے استعمال کے بعد جسم کو کھوکھلا کردیتی ہیں۔ جبکہ ان چیزوں کو کم کرکے گھر کے بجٹ کو بھی کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

دوسری طرف انتہائی طاقتور غذا اللہ کی عنایت سے آج بھی تمام غذاؤں میں سب سے سستی ہے۔ یہ غذا سبزی ہے جس کا کثرت سے استعمال اور خاص طور پر سلاد کی شکل میں کچی سبزی کا استعمال جسم کی مدافعت اور طاقت دونوں کو بہت بڑھا دیتا ہے۔ اسی طرح سیزن کے پھل عام طور پر سستے ہوتے ہیں۔ کم از کم گوشت کے مقابلے میں یہ پھل تو بہت سستے ہوتے ہیں......وہ گوشت جو زیادہ تیل اور مصالحہ جات کے بغیر منہ سے اتارنا مشکل ہوتا ہے۔

اس کے بعد جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ فراخی دیں وہ سفید گوشت، زیادہ مقدار میں پھل، دودھ وغیرہ کے ذریعے اور تیل اور چینی اور ان سے بنی مصنوعات کو بہت کم کرکے دو تین برس میں ایسے نتائج حاصل کرسکتے ہیں کہ پھر برسوں نہ وہ بیمار ہوں گے اور نہ ساٹھ کی دہائی سے قبل بڑھاپا ان کی دہلیز پر دستک دے گا۔ ایسے لوگ اگر حساب کتاب رکھیں تو انہیں کچھ ہی عرصے میں معلوم ہوجائے گا کہ جتنی رقم وہ ڈاکٹروں اور دوائیوں کے پیچھے ضائع کررہے تھے، اب وہ رقم باآسانی وہ بہتر غذا پر لگاسکتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر وہ نہ صرف بیماری کی تکلیف اور بے کاری سے بچ جاتے ہیں بلکہ بہت سے ایسے امراض سے بھی محفوظ رہتے ہیں جو انسان کی جان کے لیے خطرہ ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صحت اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ یہ نعمت اس وقت تک ہم سے نہیں روٹھتی جب تک ہم نامناسب غذا کے ہتھوڑے مار کر اسے باہر نہ نکال پھینکیں۔

انسان اور خدا

اس دنیا میں لاکھوں کروڑوں اقسام کی انواع حیات پائی جاتی ہیں۔مگر ان میں سے صرف انسان ہے جو چیزیں تخلیق کرسکتا ہے۔انسان کی اس صلاحیت کا اظہار یوں تو ابتدا ہی سے ہوگیا تھا، مگر اس دور میں تو یہ تخلیقی صلاحیت ایک نئی دنیا کا ظہور کرچکی ہے۔ ہر سمت اور ہر جگہ انسانی تخلیقات کے ایسے کرشمے جلوہ گر ہیں کہ ان کا شمار ناممکن نظر آتا ہے۔شاید یہی وہ پس منظر ہے جس میں اقبال نے اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے یہ کہنے کی جرات کی تھی۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار وراغ آفریدی
خیابان وگلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اللہ تعالیٰ سے یہ خوبصورت اور جرات آمیز مکالمہ اقبال ہی کر سکتے تھے جو خود انسان کی صفت خلاقیت کا ایک بہترین نمونہ ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ تو نے رات پیدا کی تو میں نے چراغ بنالیا۔تو نے مٹی بنائی تو میں نے اس سے پیالہ بنالیا۔تو نے صحرا، پہاڑ، میدان بنائے تو میں نے راستے، چمن اور باغ بنالیے۔ میں وہ ہوں جس نے پتھر سے آئینہ بنایا اور اور زہر سے تریاق پیدا کرلیا ہے۔

انسان کی یہی وہ تخلیقی صلاحیت ہے جس کی بنا پر تمام مخلوق جانداروں کی تخلیقی صلاحیت مل کر بھی تنہا ایک انسان کی تخلیقی صلاحیت کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ بلاشبہ یہ انسان کے لیے ایک انتہائی

قابل فخر مقام ہے۔مگر یہ فخر اس وقت سراپا عجز بن جاتا جس وقت انسان کی نظر عالم کے پروردگار کی تخلیقی صلاحیت کی طرف اٹھتی ہے۔ انسان پروردگار عالم کی تخلیقی قوت کے مقابلے میں اتنا پیچھے ہے کہ تمام انسان مل کر آج تک خدا کے طریقہ تخلیق کی ادنی اور بھونڈی سی نقل بھی نہیں تیار کر سکے۔

خدا کا طریقہ تخلیق کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے انسانوں کا طریقہ تخلیق سمجھ لیجیے۔انسان جب چیزیں بناتے ہیں تو ان کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک یا کئی انسان مل کر ایک ہی ایک چیز بنا سکتے ہیں۔مثلاً ایک دستکار ایک وقت میں ایک پیالہ بنا سکتا ہے۔صنعتی دور کے بعد انسان نے (Mass Production) کا طریقہ ایجاد کرلیا جس میں صنعتی پلانٹ اور کارخانوں میں ہزاروں لاکھوں اشیا ایک ساتھ تیار ہوسکتی ہیں۔مگر پھر بھی یہ انسان کی مجبوری ہے کہ ہر چیز بنانے کے لیے ایک انسان یا مشین کی ضرورت ہر حال میں باقی رہتی ہے۔

دوسری طرف رب العالمین کا طریقہ تخلیق یہ ہے کہ وہ ایک دفعہ ایک چیز بہترین ساخت پر بنا دیتے ہیں۔اس کے بعد یہ چیز یا تخلیق اپنے جیسی چیزیں پیدا کرنا شروع کر دیتی ہے۔آم کا درخت اگتا ہے۔جس سے آم پیدا ہوتے ہیں۔انہی آموں کی گٹھلیوں سے نئے درخت لگ جاتے ہیں۔نباتات، حیوانات اور انسان ہر جگہ یہی طریقہ تخلیق ہی کام کر رہا ہے کہ پیداوار ہی کچھ عرصے بعد پیداواری یونٹ بن جاتی ہے اور ختم ہونے سے پہلے اپنے جیسی متعدد چیزیں پیدا کرجاتی ہے۔

انسان کا عجز یہ ہے کہ وہ جو چیز بناتا ہے اس میں تمام تر توجہ اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ چیز اپنا مقصد تخلیق بہترین طریقے پر حاصل کر سکے۔مثلاً ایک لائٹ اس طرح بنائی جاتی ہے کہ وہ کم سے کم جگہ گھیر کر زیادہ سے زیادہ روشنی پیدا کر سکے۔اگر لائٹ بنانے کا کارخانہ بھی لائٹ کے

ساتھ بنانے کی کوشش کی جائے گی تو یہ ہر اعتبار سے ایک ناقابل عمل آئیڈیا ہوگا۔

جبکہ پروردگار کا معاملہ یہ ہے کہ وہ تخلیقی یونٹ اپنا پیداواری یونٹ ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور جب وہ تخلیقی یونٹ اپنے کمال پر پہنچتا ہے تو وہ اگلی نسل کو تیار کرنے کے لیے ایک پیداواری یونٹ بھی بن جاتا ہے۔ جیسے آم کے درخت کا کمال آم کی پیداوار ہے جس کے بعد انہی آموں سے نئے درخت پیدا ہو جاتے ہیں۔

جب غور وفکر کرنے والی انسانی آنکھ اس حقیقت پر متنبہ ہوتی ہے تو انسان کی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کا رخ خدا کی حمد تخلیق کرنے کی طرف مڑ جاتا ہے۔ وہ رب کی عظمت کا اعتراف کر کے بے اختیار سجدے میں گر جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے پروردگار میں بندہ عاجز تیری حمد کیا کروں۔ تیری حمد تو پہاڑ اپنی بلندی میں، آسمان اپنی رفعت میں، درخت اپنی شادابی میں، دریا اپنی روانی میں، سمندر اپنی وسعت میں، زمین اپنے پھیلاؤ میں، چاند تارے اپنی چمک میں اور پھول اپنی خوشبو میں کر رہے ہیں۔ زمین وآسمان تیرے، نباتات وحیوانات تیرے، حیات وکائنات وجمادات تیرے۔ یہ سب مل کر تیری حمد، تسبیح اور کبریائی کر رہے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ تیری عظمت اور خلاقی کا گواہ ہوں۔ تو میری گواہی کو قبول فرما۔

یہی وہ گواہی ہے جسے خالق کائنات اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا کرتے ہیں۔ اور اسی کے نتیجے میں وہ انسان کو اپنی بہترین تخلیق یعنی فردوس کی بادشاہی میں ہمیشہ ہمیشہ کے عیش وآرام کے درمیان بسا دیں گے۔

☆☆☆☆☆☆

زینت دنیا خوب یا بد

قرآن کریم میں دنیا کی زیب وزینت، خوبصورتی اور جمالیات سے متعلق دو قسم کے بیانات ملتے ہیں۔ ایک وہ جن میں با اصرار یہ کہا گیا ہے کہ دنیا کی زیب وزینت نہ صرف جائز ہے بلکہ دنیا میں اہل ایمان ہی کے لیے تخلیق کی گئی ہے، (اعراف 32:7)۔ جبکہ دوسری طرف ان کی مذمت کی گئی ہے، (حدید 20:57)۔ ان دو قسم کے بیانات میں بظاہر تضاد محسوس ہوتا ہے۔ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ہمارے ہاں بالعموم یہ بات مان لی گئی ہے کہ زینت دنیا تقویٰ اور ایمان کے اعلیٰ درجات کے منافی ہے۔

تاہم حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا گہرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ معاملہ یوں نہیں ہے۔ زینت دنیا سے متعلق قرآن مجید کا اصل بیان وہی ہے جو سورہ اعراف میں بیان ہوا ہے۔ اس کی مذمت یا متاع دنیا کی بے وقعتی قرآن کریم میں جب کبھی زیر بحث آتی ہے تو وہ کفار کے اس رویے کا بیان ہوتا ہے جس میں وہ حق وانصاف اور انفاق واحسان کو فراموش کر کے اپنی ساری تگ ودو کا مرکز دنیا اور اس کی خوبصورتیوں کو بنا لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ اپنی ذات میں ایک بڑا منفی رویہ ہے۔ لیکن ایک شخص ایمان واخلاق کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اگر اپنے ذوق جمال کی تسکین کے لیے اور شکر گزاری کرتے ہوئے زینت دنیا اختیار کرتا ہے تو اس کی ممانعت کسی پہلو سے نہیں کی جا سکتی۔

اصل ممانعت اس بات کی ہے کہ انسان آخرت کو بھول جائے اور دنیا اور اس کی رنگینی کو مرکز نگاہ بنا لے۔ انسان اللہ اور بندوں کے حقوق کو بھول جائے اور عیش وعشرت کی زندگی کو اپنا لے۔ انسان حق وصداقت کو اختیار کرنے کے بجائے دنیا اور اس کے مفاد کو سب سے زیادہ اہم سمجھنے لگے۔ یہ وہ رویہ ہے جو کفر ونفاق کا ہے اور بلاشبہ ایک قابل مذمت رویہ ہے۔

تکبر کی ماں

تکبر ایک بہت بڑی اخلاقی برائی ہے۔ معلوم تاریخ کا پہلا متکبر شیطان تھا جس نے آدم کو حقیر سمجھ کر سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا، قرآن مجید نے اس کے انکار کو تکبر اور ناشکرے پن سے تعبیر کیا۔ (بقرہ 34:2)۔

تکبر اور ناشکرا پن دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ انسان تکبر اس وقت کرتا ہے جب وہ اپنے کسی فضل و کمال کی بنا پر دوسرے انسانوں کو حقیر سمجھے۔ مگر یہ تکبر اپنی حقیقت کے اعتبار سے ناشکرے پن سے پیدا ہوتا ہے جو براہ راست اللہ تعالیٰ کے خلاف کیا گیا ایک اخلاقی جرم ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر انسان محروم مطلق ہے۔ یہاں نہ کسی کے پاس کچھ ہوتا ہے اور نہ رہ سکتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی عطا اس کا دامن نہ بھر دے۔ زندگی، صحت، حسن، جوانی، ذہانت، مال، اولاد، مقام، مرتبہ، اقتدار، علم غرض ہر وہ چیز جس کی بنا پر انسان اپنے آپ کو بڑا سمجھ سکتا ہے یا سمجھتا ہے وہ دراصل رب العالمین کی عطا کردہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جب چاہیں جس سے چاہیں اور جو چاہیں واپس لے لیں۔ کسی میں اتنا دم خم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کچھ کرنے سے روک سکے۔

اس حقیقت کے باوجود لوگ جب دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں تو وہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمت و انعام کو بھول لیتے ہیں۔ وہ عطا کو عطا سمجھنے کے بجائے اپنی محنت کا نتیجہ یا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس دنیا میں اگر کوئی ہے جو اپنی ذات میں آپ قائم اور اپنے آپ سے زندہ ہے، تو وہ اللہ ہے۔ ہر چیز اسی کی ملک ہے۔ باقی ہر مخلوق کے پاس تو جو کچھ ہے وہ صرف رب کی عطا ہے۔ ایسے میں تکبر کرنا دراصل اللہ تعالیٰ کی نعمت کو اپنا حق سمجھ کر ناشکرا پن کرنا ہے۔ یہی ناشکرا پن ہے جس کے بطن سے تکبر جیسی لعنت جنم لیتی ہے۔ اس لیے ناشکری سے بچنا تکبر سے بچنے کی پہلی سیڑھی ہے۔

بجلی کا بل اور زندگی کا بل

گرمیوں کی آمد کے ساتھ ہی ہمارے ہاں بجلی کی فراہمی میں کمی اور بلوں میں ہوشربا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر لوگ بجلی استعمال کرنے میں بہت احتیاط برتنے لگ جاتے ہیں۔ غیر ضروری لائٹ ہو یا اسٹینڈ بائی پر چلنے والے برقی آلات سب بند کر دیے جاتے ہیں۔ زیادہ بجلی کھانے والے اے سی، استری وغیرہ کے استعمال میں بھی احتیاط کی جاتی ہے۔

اس رویے کی وجہ ظاہر ہے کہ جتنی احتیاط اتنی ہی بل میں کمی ہوتی ہے۔ احتیاط کا یہ رویہ ایک فطری رویہ ہے۔ یہی فطری رویہ انسان کا پوری زندگی کے بارے میں ہو جاتا ہے جب اسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ بجلی کے بل کی طرح زندگی کا بل بھی اسے ایک روز دینا ہوگا۔

زندگی سرتاسر اللہ کی عطا ہے۔ اس کا ہر لمحہ اور ہر ہر نعمت اگر کسی نے دی ہے تو وہ رب کریم کی ذات ہے۔ وہ اس بات کا پورا حق رکھتا ہے کہ یہ زندگی، یہ لمحات اور زندگی کی ہر نعمت کا حساب لے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک روز وہ اس زندگی کا حساب بھی لے گا۔ بالکل ایسے ہی جس طرح بجلی کا محکمہ ہر ماہ بجلی کا بل وصول کر لیا کرتا ہے۔ البتہ بجلی والوں کے برعکس اللہ تعالیٰ کے حساب کا طریقہ بڑی فیاضی اور کرم کا ہے۔ وہ بجلی کی قیمت کی طرح زندگی اور اس کی نعمتوں کی قیمت نہیں لیتے۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ نافرمانی کے کاموں میں ان نعمتوں کو استعمال نہ کیا جائے۔

ہونا تو یہ چاہیے کہ اس بات کے واضح ہو جانے کے بعد لوگ ایک محتاط زندگی گزاریں۔ وہ ہر لمحہ اور ہر پیسہ یہ سوچ کر استعمال کریں کہ اس میں رب کی نافرمانی نہ ہو۔ مگر اکثر لوگ ایسا نہیں کرتے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بجلی کا بل ہر ماہ آتا ہے اور زندگی کا بل صرف ایک دفعہ موت کے بعد ہی ملے گا۔ خدائی حساب کا یہی وہ پہلو ہے جو انسانوں کو غافل کر دیتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس غفلت سے نکل آئیں اور زندگی کے بل کی تیاری زندگی میں ہی کر لیں۔

سیاچن کا جہنم

سیاچن کا گلیشیر جو دنیا کا سب سے بلند میدان جنگ ہے سن 1984 سے انڈیا اور پاکستان کے درمیان تنازع کا سبب بنا ہوا ہے۔ حال ہی میں یہاں ایک برفانی تودہ (avalanche) گرنے سے 138 پاکستانی فوجی برف تلے دفن ہو گئے ہیں۔ کئی دن گزر جانے کے بعد اب اس بات کا امکان کم ہی ہے کہ ان میں سے کسی شخص کو زندہ بچایا جا سکے گا۔

اس واقعے کے پس منظر میں میڈیا میں سیاچن کا ذکر کئی پہلوؤں سے آ رہا ہے۔ ان میں سے ایک پہلو وہ ہے جس میں سیاچن کے شدید موسم کا بیان ہو رہا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس گلیشیئر پر گرمیوں میں بھی درجہ حرارت منفی دس کے قریب رہتا ہے۔ جبکہ سردیوں میں منفی پچاس ڈگری تک جا پہنچتا ہے۔ جس کے نتیجے میں یہاں سال بھر کسی قسم کی زندگی کے پنپنے کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ جو فوجی وہاں تعینات ہوتے ہیں ان کے لیے اس درجہ حرارت پر چلنا پھرنا اور کھانا پینا ہی نہیں سانس لینا تک ایک انتہائی دشوار کام ہے۔ وہاں سردی کی شدت کی بنا پر فوجیوں کی اموات اور ان کے اعضا کے ناکارہ ہو جانا ایک معمول کی بات ہے۔ دونوں طرف کے فوجیوں کی ہلاکتیں ایک دوسرے کے بجائے موسم کے ہاتھوں زیادہ ہوتی ہیں۔ بلکہ 2003 کی جنگ بندی کے بعد تو ہلاکتوں اور معذوریوں کا واحد سبب شدید موسم ہے۔

سیاچن گلیشیر کے موسم کی یہ شدت ہم سب کے لیے اپنے اندر بڑا غیر معمولی پیغام رکھتی ہے۔ سیاچن کا یہ موسم ہم سب کو پکار کر یہ بتا رہا ہے کہ ان کا رب کس قدر مہربان ہے جس نے ان کے لیے اس زمین کا غالب ترین حصہ زندگی کے لیے انتہائی موزوں بنایا۔ یہاں سانس لینے کے لیے آکسیجن ہے۔ متوازن اور قابل برداشت درجہ حرارت ہے۔ موسموں کا تنوع ہے۔ خوراک اور پانی کا وافر انتظام ہے۔ جبکہ زمین جس کائنات میں واقع ہے، وہاں ہوا، پانی، سبزے اور

موسموں کا تو ذکر ہی جانے دیجیے، ہر جگہ سیاچن سے کہیں زیادہ خوفناک اور زندگی کے لیے زہر قاتل درجہ حرارت پائے جاتے ہیں۔

مگر اکثر انسان اس حقیقت سے بے خبر جیے جاتے ہیں۔ وہ رب کی نعمتوں پر شکر کرنے کے بجائے ناشکری کرتے ہیں۔ وہ زمین اور اس کے وسائل اور سہولیات کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ انہیں کبھی بھولے سے بھی خیال نہیں آتا ہے کہ انہیں جو کچھ ملا ہے اسے دینے والا ان کا خالق و مالک ہے۔ یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی شکر گزاری اور فرمانبرداری کریں۔

ایسے ہی بے خبر انسانوں کو متنبہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے روئے ارض پر سیاچن جیسے برفانی جہنم بنائے ہیں۔ مگر جب انسان ہوش کے ناخن نہیں لیتے اور اپنی غفلت سے باز نہیں آتے تو برفانی تودے (avalanche) خوف الٰہی سے لرز اٹھتے ہیں اور عظمت رب کے احساس سے نیچے آ گرتے ہیں۔ شائد کہ ان کا گرنا دیکھ کر غافل بندے بھی سجدے میں گر جائیں۔ رب کے احسان کو مان لیں اور اس کی شکر گزاری شروع کر دیں۔

رہے وہ لوگ جنہیں سیاچن کے برفانی تودے (avalanche) بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا سکیں وہ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں؟ کیا وہ ہمالیہ کے پھٹنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو اب زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ قیامت کے زلزلے کے ساتھ ہمالیہ بھی پھٹ جائے گا۔ کہیں کوئی جائے پناہ باقی نہیں بچے گی۔ انسانوں کا گہوارہ یہ زمین ہی ان کا قبرستان بنا دی جائے گی۔ مگر اس روز کی توبہ کسی کے کام نہیں آئے گی۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو سیاچن کے اس برفانی جہنم کے احوال سن کر اپنے رب کی شکر گزاری کا احساس پیدا کر لیں۔ کیونکہ کل ایسے ہی شکر گزار لوگ ہمیشہ کے لیے جنت کی ابدی نعمتوں میں بسا دیے جائیں گے۔

مصائب سے بچنے کا راستہ

ہم میں سے ہر شخص مصائب سے بچ کر زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ دکھ اور الم کی زندگی کوئی نہیں پسند کرتا۔ ہماری تمام تر کدوکاوش کے پیچھے یہی جذبہ ہوتا ہے کہ مصائب وآلام سے بچ کر زندگی گزاری جائے۔ مگر یہ دنیا آزمائش کے جس اصول پر بنی ہے اس میں ہماری لاکھ کوشش کے باوجود مصائب ہمارا رخ کرہی لیتے ہیں۔ آزمائش کا یہ قانون چونکہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے اس لیے دنیا سے مصائب کو ختم تو نہیں کیا جاسکتا البتہ اگر یہ بات سمجھ لی جائے کہ آزمائش کے علاوہ وہ کون سی چیزیں ہیں جو مصائب وآلام کا سبب بن جاتی ہیں تو انسان بڑی حد تک مصائب سے بچ کر زندگی گزارسکتا ہے۔

یہ درحقیقت دو بنیادی چیزیں ہیں جو انسانوں پر مصائب کا باعث بنتی ہیں۔ پہلی چیز ناشکری ہے۔ اس دنیا میں ہر مخلوق کے پاس جو کچھ ہے وہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی عطا ہے۔ مگر مخلوقات میں سے صرف انسان ہے جو باشعور بھی ہے اور بااختیار بھی۔ وہ حساس بھی ہے اور احسان شناس بھی۔ ان صفات کی حامل مخلوق یعنی انسان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ احساس شکرگزاری میں جیے۔ وہ اپنے شعور اور عقل وفہم کو استعمال کرتے ہوئے زندگی کے ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی نعمت وعطا کے پہلو کو تلاش کرکے دل وجان کی گہرائیوں سے اپنے محسن حقیقی کی شکرگزاری اختیار کرے۔

مگر انسان کا المیہ یہ ہے کہ اسے کوئی نعمت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ ہر چیز کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ شکر کرنا تو دور کی بات ہے وہ الٹا ناشکری کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ زندگی میں لاکھ چیزیں اسے ملی ہوتی ہیں اور ایک چیز اگر نہ ملے یا مل کر چھن جائے تو وہ طوفان اٹھادیتا ہے۔ شکوہ شکایت، غصہ، جھنجھلاہٹ اور مایوسی اس کا احاطہ کرلیتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ انسان کو یہ احساس دلانے کے لیے کہ اس کے پاس ان گنت نعمتیں موجود ہیں کبھی کبھار کوئی نعمت لے لیتے ہیں یا دیتے نہیں ہیں۔

تاہم جو احساس میں جیتے ہیں کہ ہر چیز اللہ کی عطا ہے اور وہ قول وفعل اور رویے سے شکرگزاری کا مظاہرہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا عام طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ان سے نعمتیں واپس نہیں لیتے بلکہ ان میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔ یہی بات سورہ ابراہیم میں بنی اسرائیل سے مخاطب کرکے اس طرح کہی گئی ہے کہ تم شکرگزاری کروگے تو ہم تمھاری نعمتیں بڑھادیں گے، (ابراہیم 7:14)۔

اسی طرح جب لوگ نافرمانی اور گناہ کا رویہ اختیار کرتے ہیں تب بھی اللہ تعالیٰ لوگوں پر مصائب وآلام کثرت کے ساتھ بھیجنا شروع کردیتے ہیں۔ لیکن انسان اگر گناہ سے بچ کر جیے اور جب جب نافرمانی ہوجائے تو معافی مانگتا رہے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ توبہ کو قبول کرتے ہوئے گناہ کی پاداش میں کوئی تکلیف اور سختی نہیں بھیجتے۔ قرآن مجید میں کفار مکہ کو یہ بات اس طرح کہی گئی ہے جب تک وہ معافی مانگتے رہیں گے ہم عذاب نہیں بھیجیں گے، (انفال 33:8) یا پھر سورہ شوریٰ میں کہا گیا کہ جو مصائب تم پر آتے ہیں وہ تمھارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں، (شوریٰ 30:42)۔

شکر واستغفار کے حوالے سے دو تین باتیں مزید سمجھ لینی چاہییں۔ ایک یہ کہ قرآن کریم کے بیانات میں جو قانون بیان ہوا ہے وہ ان اولین مخاطبین کے لیے تھا جن کے درمیان رسول موجود تھے اور جب رسول موجود ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ عالم اسباب سے بلند ہوکر معاملات شروع کردیتے ہیں۔ اس لیے وہاں تو یہ قانون سوفیصد قابل عمل ہوتا ہے۔ لیکن باقی انسانیت کے لیے بھی وہ یہی شروع کردیں تو آزمائش ختم ہوجائے گی۔ اس لیے باقی لوگوں کے معاملے میں عموماً یہی ہوتا ہے کہ شکر واستغفار کے نتیجے میں مصائب بہت کم ہوجاتے ہیں، مگر آزمائش کے اصول پر بعض لوگوں پر اس رویے کے باوجود بھی مصائب آجاتے ہیں، گرچہ ایسا کم ہوتا ہے۔

دوسرا یہ کہ ہم مصائب کے حوالے سے ناگہانی معاملات کا بیان کررہے ہیں۔ انسان اگر شکر

واستغفار کے ساتھ خود ہی قانون قدرت کی خلاف ورزی کرنا شروع کردے تو اس کے نتائج پھر ہر حال میں نکلیں گے۔ مثلاً خراب اور نامناسب خوراک اگر مستقل کھائی جائے گی تو تھوڑے عرصے ہی میں انسان بیمار پڑ جائے گا چاہے وہ کتنا ہی شکر کیوں نہ کر رہا ہو۔

تیسرا یہ کہ شکر اور استغفار دونوں صرف زبانی کلامی چیزیں نہیں بلکہ عملاً کرنے والے کام بھی ہیں۔ اپنی نعمتوں میں سے دوسروں کو دینا، مال لوگوں پر خرچ کرنا، اپنی طاقت سے دوسروں کی خدمت کرنا یہ عملی شکرگزاری ہے۔ اسی طرح گناہوں پر اصرار سے بچنا، خود کو بہت نیک نہ سمجھنا وغیرہ استغفار کی سچائی کا ثبوت ہے۔

اس ضمن کی آخری بات یہ ہے کہ آدھا عمل صالح اور آدھا گناہ، اسی طرح آدھی شکرگزاری اور آدھی ناشکری انسان کو بڑی مہنگی پڑ سکتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ اپنے نیک بندوں کا معاملہ دنیا ہی میں صاف رکھیں۔ مگر نیک بندے کچھ اچھے اعمال کے ساتھ کچھ گناہ مستقل طور پر کرتے رہیں یا زبان سے شکر کرتے ہوئے عملاً شکر نہ کریں تو پھر ایسے لوگوں کا حساب کتاب صاف کرنے کے لیے بعض اوقات بڑی مصیبتیں ان کا رخ کر لیتی ہیں۔

اس لیے ضروری ہے کہ انسان نے اگر یہ راستہ اختیار کیا ہے تو پھر اسے پورا ہی اختیار کرے۔ بیچ میں رکھنے کا مطلب اپنی شامت کو آواز دینا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

اللہ سے ڈریئے
پھر اس شخص سے ڈریئے
جو اللہ سے نہیں ڈرتا (ابویحییٰ)

مال اور کمزور

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں قارون نام کا ایک بہت بڑا مالدار شخص تھا۔ سورہ قصص میں بیان ہوا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے اتنے خزانے عطا کر رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں اٹھانا ہی آدمیوں کی ایک جماعت کے لیے بہت بھاری بوجھ تھا۔ مگر ان نعمتوں پر شکرگزاری کے بجائے فخر و غرور اور نمائش و دکھاوا اس کا معمول تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ یہ مال اسے اس کی علم و صلاحیت کی بنا پر ملا ہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہوں کی پاداش میں اسے اس کے مال سمیت زمین میں دھنسا دیا۔

مال بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔ لیکن اس نعمت کی حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کو بطور آزمائش دیا جاتا ہے۔ وہ آزمائش کیا ہے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی خوبی سے اس طرح بیان کیا ہے کہ تمھارے کمزوروں کی وجہ سے تمھاری مدد کی جاتی ہے اور تمھیں رزق دیا جاتا ہے، (بخاری رقم،2896)۔

اس دنیا میں جس کو جو ملا ہے صرف اللہ تعالیٰ کی عطا سے ملا ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے ذہین اور باصلاحیت لوگ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور بے ہنر لوگ دیکھتے ہی دیکھتے مالدار ہو جاتے ہیں۔ لوگ اسے قسمت کہتے ہیں، درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی اپنی تقسیم ہے۔ یہ تقسیم ہمیشہ غیر متوازی کی جاتی ہے۔ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ پیسے والے لوگ مال پا کر قارون بنتے ہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہ جان لیتے ہیں کہ یہ مال اصل میں انہیں ضعیفوں کی وجہ سے ملا ہے۔

جو لوگ قارون بنتے ہیں ان کا انجام بھی قارون جیسا ہوگا۔ لیکن جو لوگ اسے عطیہ الٰہی سمجھ کر غریبوں پر خرچ کرتے ہیں، انہیں اللہ کے نبی کے ساتھ بسا دیا جائے گا۔

جنت کی وراثت

انسانی فطرت میں حسن و جمال، رنگ وخوشبو، لذت وسرور اور ابدیت و عافیت کی ختم نہ ہونے والی پیاس پائی جاتی ہے۔ مگر انسان کا مقدر یہ ہے کہ ساری زندگی اپنی پیاس بجھانے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے، مگر اس جہان فانی کی کوئی چیز بھی اس کی پیاس بجھانے میں کامیاب نہیں ہو پاتی۔ وہ ہوس کا اسیر ہوکر بحرنعمت کا پورا سمندر بھی اپنے اندر انڈیل لے، تب بھی سدا کا یہ پیاسا، آخرکار بنجر صحرا کی تپتی زمین جیسا پیاسا ہی رہتا ہے۔

انسان کے اضطراب مسلسل کی کہانی دو مزید المیے جنم دیتی ہے۔ ایک وہ جس میں انسان اس دنیا کو اپنا مقصود محض بنا کر اور ہر جائز و ناجائز راستے کو اختیار کر کے اپنی تسکین کے سامان ڈھونڈتا ہے۔ وہ اس راہ میں ہر ظلم اور ہر زیادتی کو روا سمجھتا ہے۔ ہر بند دروازے کو کھولنے اور اندھی گلی کو ٹٹولنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر آخرکار وہ اس حال میں مرتا ہے کہ ازلی پیاس کے ساتھ ابدی بربادی کو اپنا مقدر بنا کر رخصت ہوتا ہے۔

دوسرا المیہ ترک دنیا کی وہ داستان جنم دیتا ہے جس کے آثار مسیحی رہبانیت اور بدھ مت کی تاریخ میں جا بجا بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ترک لذت کی یہ غیر فطری اور غیر عقلی راہ بھی انسان کو اتنا ہی مایوس کرتی ہے جتنا پہلی راہ کے مسافر نامراد رہتے ہیں۔

ان دونوں راستوں کے برعکس قرآن مجید انسان کے سامنے جنت کی وہ ابدی بادشاہی رکھتا ہے جہاں انسان کی ہر پیاس آخرکار اپنی تسکین پا ہی لے گی۔ وہ انسان کو فطری حد تک دنیا سے متمتع ہونے کی تلقین بھی کرتا ہے اور اس کی راہ میں قدم قدم پر وہ رکاوٹیں بھی رکھتا ہے جو اسے حرام کی وادیوں ہی سے نہیں روکتیں بلکہ اس کی پیاس کو تونس بننے کی اذیت سے روکتی ہیں۔ یہی راستہ فلاح کا ہے۔ دنیا کی بھی اور آخرت کی بھی۔

دعا اور عزم

پچھلے دنوں ایک قاری نے فون پر گفتگو کرتے ہوئے یہ کہا کہ وہ میرے مضامین بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ وہ ان مضامین کو پڑھ کر ہمیشہ بہت متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اثر وقتی ہوتا ہے اور کچھ عرصہ بعد وہ دوبارہ اپنے معمولات کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

یہ کم وبیش ہر انسان کا مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماحول اور حالات کا بہت گہرا اثر قبول کرتا ہے۔ جس وقت انسان ایک تذکیری اور اصلاحی مضمون پڑھتا ہے، کسی اچھی اور نیک صحبت میں بیٹھتا ہے، کوئی دلپذیر بات یا اچھی نصیحت سنتا ہے تو اس کا متاثر ہونا ایک فطری امر ہے۔ لیکن جیسے ہی ماحول بدلتا ہے، صحبت تبدیل ہوتی ہے، مصروفیات کی نوعیت بدلتی ہے انسان نیکی کی بات بھول کر انہی چیزوں میں مگن ہو جاتا ہے۔ اسے یاد بھی نہیں رہتا کہ کچھ دیر پہلے اس نے کس قسم کی بات سنی یا پڑھی تھی۔

اس مسئلے کا سب سے اچھا علاج یہ ہے کہ جیسے ہی انسان کوئی اچھی بات سنے یا پڑھے جس پر اس کی فطرت لبیک کہے اور قلب متوجہ ہو تو وہ اس کیفیت کو ارادے کی قبا اور دعا کی غذا سے تحفظ اور توانائی فراہم کرے۔ وہ عزم کرے کہ جس نیکی کی تلقین کی گئی ہے وہ اسے زندگی بنائے گا، جس برائی کا ذکر ہے وہ اس سے دور رہے گا۔ وہ سابقہ زندگی پر توبہ کرے اور آئندہ کے لیے اپنے پروردگار سے استقامت کی درخواست کرے۔

عزم و دعا کی یہ دوطرفہ ڈھال انسان میں آنے والی لمحاتی تبدیلی کو زندگی بھر کا معمول بنا دے گی۔ توجہ کے ساتھ کی جانے والی دعا ختم نہ ہونے والی رحمت الٰہی کے نزول کا سبب بن جائے گی۔ ایک لمحہ میں کیا جانے والا عزم نفس و شیطان کی یلغار کو دیر تک پیچھے دھکیل دے گا۔ دعا اور عزم جس شخص کا معمول بن جائے، آہستہ آہستہ اس میں مکمل تبدیلی آنا شروع ہو جاتی ہے۔ پھر وہ وقت آتا ہے جب انسان کسی بھی ماحول میں بیٹھا ہو وہ خالق کی بندگی اور نیکی کے احساس میں جیتا ہے۔

تقدیر اور عمل

سورہ بقرہ میں جس مقام پر روزہ کے احکام زیر بحث آتے ہیں وہیں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ نزول قرآن کے وقت کچھ لوگ روزے کی راتوں میں اپنی بیویوں سے تعلق زن وشو قائم کرتے تھے، مگر دل میں اسے ممنوع خیال کرتے تھے۔ قرآن مجید نے گرچہ اس رویے کو خیانت سے تعبیر کیا لیکن اس عمل کو جائز قرار دے دیا۔

قرآن مجید کی یہ آیت (البقرہ187) بظاہر تو کچھ شرعی احکام بیان کر رہی ہے، مگر انتہائی اختصار اور انتہائی جامعیت کے ساتھ جو مضامین اس ایک آیت میں کھولے گئے ہیں، سیکڑوں صفحات ان کی شرح و وضاحت میں لکھے جاسکتے ہیں۔ مثلاً اس آیت میں روزے کی رات میں تعلق زن وشوہر کے لیے خیانت کا لفظ استعمال کر کے انسانی نفسیات کی بنیادی کمزوریوں ہی کو نہیں کھولا گیا بلکہ لفظ خیانت کو حد درجہ وسعت اور معنویت عطا کر دی۔

پھر اس آیت میں انسانی اجتماعیت کی بنیاد یعنی میاں بیوی کے رشتے کو 'رفث' اور 'لباس' کے بلیغ ترین اسالیب سے بیان کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کس درجہ کے قرب، تحفظ اور خوبصورتی کا تعلق ہے۔ اسی طرح اس آیت میں روزہ کی رات کے وقت تعلق زن وشو کی اجازت دیتے ہوئے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ گرچہ اپنے اندر معنویت کے اور بھی بہت پہلو لیے ہوئے ہیں، مثلاً یہ کہ یہ تعلق برائے لذت نہیں بلکہ مقصد ہے، تاہم اس کے ساتھ یہ الفاظ مسئلہ تقدیر و عمل کو جس خوبی سے کھولتے ہیں وہ بے مثل ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''پس تم اب ان سے ملو اور اللہ نے تمھارے لیے جو مقدر کر رکھا ہے اس کے طالب بنو۔''

یہ آیت کمال خوبی سے اس بات کو واضح کرتی ہے کہ انسانی عمل کا اللہ کی مقرر کردہ تقدیر کے ساتھ کیا تعلق ہے۔

اس دنیا میں ہر انسان اللہ کے اذن اور اس کی مقرر کردہ تقدیر کے مطابق ہی آتا ہے۔ وہ قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر واضح کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس معاملے میں جس کو چاہتے ہیں اسے بیٹے، جسے چاہتے ہیں اسے بیٹیاں، جسے چاہتے ہیں اسے دونوں ہی عطا کرتے ہیں۔ اور جس کو چاہیں اولاد ہی نہ دیں، (شوریٰ 42:50-49)۔ تاہم سورہ بقرہ کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ ایک ایسے معاملے میں جو سرتاسر ان کے ہاتھ میں ہے، جو ان کی مقرر کردہ تقدیر ہے، اس میں بھی ان کی مشیت یہی ہے کہ ان کی تقدیر انسانی عمل پر موقوف ہو۔ یعنی انسان تلاش کرے گا تب ہی وہ پائے گا جو اس کے لیے مقدر کیا گیا ہے۔

یہی اصل فلسفہ تقدیر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں لوگوں کو اپنی حکمت و مشیت کی بنیاد پر دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ لیکن اس معاملے میں عام طور پر ان کی سنت یہی ہے کہ ان کا فیصلہ انسانی عمل ہی پر موقوف ہوتا ہے۔ وہ چاہیں تو اپنے ہر ضابطے اور قانون کو الگ رکھ کر عطا و بخشش کا فیصلہ کرلیں اور چاہیں تو سارے اسباب کے باوجود کچھ نہ دیں، لیکن ان کا عام طریقہ یہی ہے کہ انسان کو وہی ملے گا جس کی اس نے سعی و جہد کی ہوگی۔

یہی وہ ضابطہ ہے جو انسانوں کو ہمیشہ اپنے سامنے ملحوظ رکھنا چاہیے۔ عمل اور نتائج میں نسبت تناسب کا کچھ فرق تو ہوسکتا ہے، لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوجائے، ایسا کرنا اللہ کا طریقہ نہیں ہے۔ جو بچے محنت سے پڑھتے ہیں امتحان میں اچھے نمبروں سے وہی کامیاب ہوتے ہیں۔ جو لوگ زندگی میں جدوجہد کرتے ہیں وہی ترقی و کامیابی کی سیڑھیاں طے کرتے ہیں۔ جو لوگ اسباب کی کھیتی بوتے ہیں وہی نتیجے کی فصل کاٹتے ہیں۔

انسان کو ہمیشہ اس کی تقدیر ملتی ہے۔ مگر اس تقدیر تک انسان کو چل کر جانا پڑتا ہے۔ تقدیر انسان تک چل کر نہیں آتی۔ یہی تقدیر کو سمجھنے کا درست ترین انداز ہے۔

فطرت کی سزا جزا

مسلمانوں کے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہن میں ایک سوال اکثر پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں اکثریت ہمیشہ ان لوگوں کی رہی ہے جن لوگوں تک اللہ کے رسولوں کی دعوت نہیں پہنچی۔ ایسے لوگوں کی سزا جزا کس بنیاد پر ہوگی؟

قرآن مجید اس سوال کا ایک متعین جواب دیتا ہے۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو اس ڈھنگ پر تخلیق کیا ہے کہ لوح دل پر فطرت کے قلم سے خیر و شر کی پوری لغت ثبت کر کے ہی انسان کو اس دنیا میں بھیجا جاتا ہے، (الشمس:8)۔ انسان دل کے آئینے پر حرص و ہوس کا زنگ چڑھا لے تو دوسری بات ہے وگرنہ اپنے اچھے برے روپ کی واضح تصویر وہ جب چاہے اس آئینے میں دیکھ سکتا ہے۔

بات صرف اسی فطری ہدایت تک محدود نہیں جو خیر و شر کا واضح تصور انسان کو دیتی ہے بلکہ وجود انسانی میں نفس ملامت گیر یا ضمیر کی شکل میں وہ جج اور قاضی بٹھا دیا گیا ہے جو ہر خیر پر اسے شاباش دیتا ہے اور ہر برائی کے ارتکاب پر اسے کچوکے لگاتا ہے، (القیامہ: 2)۔ خیر و شر کا تصور اور ضمیر کی عدالت اتنی طاقتور چیز ہے کہ اسی نے انسانی سماج کو عدالت، پولیس اور کچہری کا تصور عطا کیا ہے۔ انسان اسی کی بنیاد پر چاہتے ہیں کہ معاشرے میں اگر کوئی کسی پر ظلم کرے تو اس ظلم کا بدلہ لیا جائے۔ ظالم کو سزا ملے اور مظلوم کو انصاف دلایا جائے۔

ٹھیک اسی اصول کی روشنی میں انسان اپنے معاشروں میں جزا کا ایک نظام قائم کرتے ہیں اور اس کی خلاف ورزی کو بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ مزدور کو مزدوری دی جاتی ہے اور اسے احسان نہیں سمجھا جاتا۔ ملازم کی تنخواہ اس کا ناقابل انکار حق سمجھا جاتا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دینے والوں کو اعزازات سے نوازا جاتا ہے۔ سزا کی طرح جزا کے اس اصول کو بھی دنیا کے تمام معاشرے ہمیشہ مانتے رہے ہیں۔

سزا و جزا کا یہ نظام جو فطرت میں موجود خیر و شر کے تصور اور ضمیر کی عدالت سے اٹھتا ہے، معاشرے میں ہر جگہ اپنی حیثیت منواتا ہے۔ تاہم ایک اور ناقابل تردید حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں مکمل انصاف ملنا اکثر حالات میں ممکن نہیں ہوتا۔ ایک شخص اگر دس انسانوں کو مار ڈالے تو زیادہ سے زیادہ اس کی جان ایک دفعہ لی جاسکتی ہے۔ مگر دس جانوں کا بدلہ ایک جان کبھی نہیں ہوسکتی۔ بات دس جانوں ہی کی نہیں بلکہ دس خاندانوں کی بربادی کی ہوتی ہے۔ اس کا حساب کیسے ممکن ہے۔

اسی طرح ایک شخص جو کسی اعلیٰ مقصد کے لیے اپنی جان قربان کر دے۔ اپنی جان دے کر کئی اور قیمتی جانیں بچالے۔ کوئی اعزاز، کوئی ایوارڈ اور کوئی انعام اس کا بدلہ نہیں ہوسکتا۔ انسانی دنیا کی یہی محدودیت پکار پکار کر اعلان کرتی ہے کہ حتمی اور کامل سزا و جزا کا ایک دن ضرور آئے گا۔ جس طرح ضمیر اور اس کی طرف سے دی گئی فطری سزا و جزا کا انکار کوئی صاحب ہوش نہیں کرسکتا، ٹھیک اسی طرح قیامت کے دن کے حتمی انصاف کا انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔ جس طرح انسانی عدالتوں کا اخلاقی جواز اور ضرورت ناقابل تردید ہے اسی طرح اس آنے والے فیصلے کے دن کا ہونا یقینی ہے۔

یوم آخرت کا یہ دن رسولوں کے مخاطبین کی سزا جزا کا بھی حتمی دن ہوگا اور اسی طرح ان لوگوں کی پکڑ اور ثواب کا بھی دن ہوگا جن تک رسولوں کی دعوت نہیں پہنچی۔ ان کا فیصلہ فطرت انسانی میں موجود ان حقائق کی بنیاد پر ہوگا جن کی بنیاد پر ان کا ضمیر ساری زندگی سزا و جزا پر متنبہ کرتا رہا۔ مگر وہ اپنے ضمیر کو دھوکہ دیتے رہے۔ وہ حرص و ہوس کے اسیر رہے۔ خواہش و تعصب کی پیروی کرتے رہے۔ نفرت اور مفاد کی زندگی جیتے رہے۔

ایسے تمام لوگوں پر ان کی فطرت ہی گواہی بن جائے گی۔ کیونکہ ہدایت کی جو روشنی تفصیل اور جزئیات میں رسولوں کے پاس تھی، وہ کلیات اور اجمال کی حد تک ان کی فطرت میں بھی تھی۔ انہیں اس کی روشنی میں اپنے اعمال کا جواب دینا ہوگا۔

خدااور ہماری کہانی

سورہ فاتحہ قرآن مجید کی پہلی سورہ ہے۔اس سورت کا مرکزی مضمون اس کی چوتھی آیت میں اس طرح بیان ہوا ہے۔''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔''

یہ دو جملے انسان اور خدا کی اس کہانی کا انتہائی مختصر مگر انتہائی جامع بیان ہے جو وقت کی کسی گھڑی میں شروع تو ضرور ہوئی تھی، مگر اس کہانی کا کوئی اختتام نہیں۔ یہ کہانی کیا ہے، ایک کامل ترین ہستی کے احسانات کی داستان ہے۔ یہ ہستی قادر مطلق اور کریم مطلق ہے۔اس کا کرم یوں تو آسمان سے لے کر زمین تک ہر مخلوق کو اپنی عطا سے سرشار کیے ہوئے ہے مگر انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اس کا تخیل لامحدود اور نعمتوں سے حظ اٹھانے کی خواہش لامتناہی ہے۔

یہ انسان اگر دل کا اندھا نہ ہو، تو ہر طرف اسی کریم کی عنایات کی برسات دیکھتا ہے۔اسے دیکھ کر اس کی زبان پر بے اختیار نغمہ حمد و تمجید جاری ہو جاتا ہے۔مگر جب اس انسان کی نگاہ اپنی طرف لوٹتی ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس کا وجود جنم جنم کا ایسا پیاسا ہے کہ ہر برسات کے بعد وہ ایک اور برسات کا طلبگار رہتا ہے۔ پہلا مشاہدہ اسے عزم عبادت پر ابھارتا ہے اور دوسرا اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنا دستِ سوال مالک دو جہاں کے دست عطا کے سامنے دراز کرے۔

مگر اس کی معرفت اسے بتاتی ہے کہ خدا کی ختم نہ ہونے والی عطا صرف ان لوگوں کا مقدر ہے جو خدا کی مطلوب سیدھی راہ پر چلیں گے اور اس کا پہلا سوال یہی بن جاتا ہے کہ اسے سیدھا راستہ دکھایا اور اس پر چلایا جائے۔ان لوگوں کا راستہ جن پر چلنے والوں پر خدا کا انعام ہوا۔نہ کہ ان لوگوں کا راستہ جن پر خدا کا غضب ہوا اور جو گمراہ ہیں۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو بہت جلد نعمتوں کی جدائی کا صدمہ دیکھیں گے اور ہمیشہ کے لیے محرومی کی آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔یہی سورہ فاتحہ کا مفہوم ہے۔یہی انسان اور خدا کی کہانی کا خلاصہ ہے۔

آگ اور تیل

محرومی اور ذلت کا سامنا کرنا انسانوں کے لیے ہمیشہ ایک اذیت ناک تجربہ ہوتا ہے۔یہ تجربہ اگر حال ہی میں پیش آئے تو اذیت کے ساتھ پچھتاووں کی آگ بھی وجود انسانی کو جھلس دیتی ہے۔اس آگ کی تپش اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب اپنے جاننے پہچاننے لوگ ارد گرد ہوں اور اپنی انگلیاں دانتوں میں دبائے نامرادی اور رسوائی کی اس جلتی پر شرمندگی و ندامت کا تیل ڈال رہے ہوں۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے مجرموں کو جب ذلت و محرومی کا سامنا ہوگا تو اس کے ساتھ پچھتاوے اور ندامت کو بڑھانے والے سارے عناصر بھی اس موقع پر جمع کر دیے جائیں گے۔ارشار باری تعالیٰ ہے:''اور جس دن اللہ ان کو اکٹھا کرے گا وہ محسوس کریں گے کہ گویا بس وہ دن کی ایک گھڑی (ہی دنیا میں) رہے۔ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے۔''،(یونس 45:10)۔

اس آیت کا پہلا جملہ یہ بتا رہا ہے کہ نافرمان لوگ بروز قیامت ماضی میں گزری ہوئی زندگی کو ایسا محسوس کریں گے گویا شام قیامت سے قبل دن کی ایک گھڑی میں وہ دنیا میں رہے۔صبح و شام کا یہ معاملہ انہیں پچھتاووں کے ختم نہ ہونے والے عذاب میں مبتلا کر دے گا کہ کاش وقت کا پہیہ ذرا پیچھے گھومے اور وہ صبح زندگی میں لوٹ کر اپنے اعمال کو بہتر بنالیں۔مگر یہ ممکن نہ ہوگا اور ماضی بعید ماضی قریب بن کر ان کے عذابوں میں اضافہ کرتا رہے گا۔

ان کا دوسرا عذاب یہ ہوگا کہ نامرادی اور ذلت کے ان لمحات کے گواہ ان کے جاننے پہچاننے سارے لوگ ہوں گے۔لوگ انہیں پہچانتے ہوں گے اور وہ لوگوں کو۔یوں ذلت کی قبا اوڑھے ان لوگوں کو دیکھنے والی ہزاروں محرم نگاہیں میدان حشر میں ہوں گی جو قبائے ذلت میں جا بجا ندامت کے پیوند لگا رہی ہوں گی۔

کیسی عجیب ہے قیامت کی نامرادی اور کیسی شدید ہے اس روز کی رسوائی۔

کرسیوں کا پیغام

آج کل مساجد میں صفوں کے ساتھ ساتھ رکھی ہوئی کرسیاں عام دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ کرسیاں ان بزرگوں کے لیے رکھی جاتی ہیں جو بڑھاپے اور جوڑوں کی کمزوری کی بنا پر قیام، رکوع اور سجود آسانی سے نہیں کرسکتے۔ چنانچہ یہ بزرگ صف کے آخری حصے میں رکھی ان کرسیوں پر بیٹھ کر نماز ادا کرتے ہیں اور رکوع و سجود اشارے سے ادا کرتے ہیں۔

یہ بے جان کرسیاں زبان حال سے تمام انسانوں کو خواہ وہ نمازی ہوں یا بے نمازی ایک خاموش پیغام دے رہی ہیں۔ یہ کرسیاں انہیں بتاتی ہیں کہ ان کا پروردگار کتنا کریم ہے جس نے انہیں بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔ اس نے انہیں وہ جسم عطا فرمایا ہے جس میں کھڑے ہونے اور چلنے، اچھلنے اور کودنے، اٹھنے اور بیٹھنے، جھکنے اور مڑنے کی غیر معمولی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ انسان زندگی بھر ان صلاحیتوں کو بے دریغ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتا ہے۔ مگر انسان نعمت دینے والے کو ہمیشہ بھولے رہتا ہے۔

انسان کے لیے حصول معاش، تعلیم، تفریح اور آرام جیسی نعمتیں جسم کی اس صلاحیت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ مگر انسان یہ عظیم موقع کھودیتا ہے کہ وہ جسم کی اس صلاحیت کو استعمال کرکے اپنے رب کے سامنے قیام کرے۔ وہ رکوع میں اس کے سامنے جھک جائے، سجدہ میں اس کے حضور زمیں بوس ہوجائے اور تشہد میں اس کی بارگاہ میں ادب سے بیٹھ جائے۔

ایک بے نمازی یہ عظیم موقع کھودیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا جسم اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کردیتا ہے۔ مگر وہ پھر بھی مسجد نہیں آتا اور ان کرسیوں کا سہارا لے کر نماز نہیں پڑھتا۔ یہاں تک کہ قیامت کا وہ دن آجائے گا جب ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا جائے گا۔ مگر اس وقت اس بے نمازی سے سجدہ کا یہ موقع چھین لیا جائے گا۔ یہی ان خاموش کرسیوں کا پیغام ہے اور یہی ان کی آخری تنبیہ ہے۔

دلہن کی نمائش

بننا سنورنا اور زیب و زینت خواتین کی فطرت کا حصہ ہے۔ یہ اپنی ذات میں کوئی قابل اعتراض بات بھی نہیں ہے۔ اس لیے دین اسلام میں اس عمل پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی ہے۔ البتہ سورہ نور میں خواتین کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ مردوں کے قریبی حلقے کے علاوہ جن میں زیادہ تر محارم شامل ہیں، اپنی زینتوں کو نمایاں نہ کریں۔ اس سے قبل خواتین کو اس بات پر بھی پابند کیا گیا ہے کہ وہ اپنے سینوں کو اپنی اوڑھنیوں سے چھپائے رکھیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں شادی بیاہ کے مواقع پر اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی خلاف ورزی کا ایک اجتماعی موقع بن جاتا ہے۔ عام طور پر ہماری شادی کی مجالس یا تو مخلوط ہوتی ہیں یا پھر مرد خود ہی دندناتے ہوخواتین کے حصے میں آجاتے ہیں۔ یوں اللہ تعالیٰ کا حکم سرعام پامال ہوتا ہے۔ اس میں پہلی غلطی تو مردوں ہی کی ہے جو شادی کا انتظام کرتے ہیں۔ انہیں ایک ایسے موقع پر مخلوط مجالس کا انتظام نہیں کرنا چاہیے جہاں خواتین پوری طرح آراستہ ہوکر آتی ہوں۔ یہ انتظام نہ ہو تو انہیں غض بصر (نظر جھکانے) کے دینی حکم کی پابندی کرنی چاہیے۔

ایسے مواقع پر خواتین بھی احتیاط نہیں کرتیں۔ مگر سب سے بڑھ کر اس موقع پر دلہن کے طور پر موجود لڑکی کا وجود مجسم اس حکم کی خلاف ورزی بنا ہوا ہوتا ہے۔ سولہ سنگھار کی ہوئی دلہن کو بنا سنوار کر اسٹیج پر بٹھادیا جاتا ہے۔ زیورات اور لباس کی نمائش کے لیے دلہن کے دوپٹے کو سینے سے ہٹا کر باہتمام پیچھے کمر پر ڈال دیا جاتا ہے۔ یوں کھلے گلے اور چھوٹی آستین کے ساتھ ممکنہ حد تک جسم کی نمائش کا اہتمام بھی ہوجاتا ہے۔ فوٹوگرافر اور مووی بنانے والے سرعام کیمرے کی آنکھ سے دلہن کو ٹٹولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دلہن جسے اُس وقت سب سے بڑھ کر اللہ کی رحمت کی ضرورت ہوتی ہے، اپنی نمائش کرکے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہوجاتی ہے۔

ممّا پپا اور اللہ

پارک کی اونچی نیچی روشوں، سرسبز ڈھلانوں، رنگ برنگے پھولوں، اونچے اونچے درختوں، ان کے سائے میں لگے پرلطف جھولے میں اپنے ہم جولیوں کے ہمراہ کھیلتا، دوڑتا، ہنستا بچہ بہت مگن تھا۔ اتنا مگن کہ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ پارک میں اپنے ماں باپ کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے ماں باپ ہی اس کی ہر ضرورت پوری کرنے والے اور اس کے محافظ ہیں۔ مگر اس کے ماں باپ کو اس کی فکر تھی۔ وہ دور جھولوں میں گیا تو وہ بھی اسے اپنی نظر میں رکھنے کے لیے جھولوں کے پاس آبیٹھے۔

یکا یک کھیل کی مستی میں بچے کو اپنے ماں باپ یاد آئے۔ اجنبیوں کے درمیان اپنوں کی یاد آئی تو بچہ دوڑ کر اسی جگہ گیا جہاں اس نے انہیں چھوڑا تھا۔ وہ وہاں موجود نہ تھے۔ بچہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ انہیں کہیں نہ پایا تو تڑپ کر انہیں پکارنا شروع کر دیا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ بچہ پکارے اور ماں باپ جواب نہ دیں۔ جواب آیا اور بچہ ماں باپ کے پاس تھا۔

ماں باپ اور بچے کی یہ کہانی انسان اور اس کے رب کی کہانی سے زیادہ مختلف نہیں۔ انسانوں کا مالک ماں باپ سے کہیں زیادہ ان سے محبت کرتا ہے۔ وہ ان کا دامن جنت کی خوشیوں سے بھرنا چاہتا ہے اور دنیا کی راحت سے بھی محروم نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ ان کے فائدے کے لیے ان پر کچھ پابندیاں لگاتا ہے، مگر لذات دنیا سے استفادہ کا موقع بھی دیتا ہے۔ اس کے بندے اس سے کتنے ہی غافل ہو جائیں وہ انہیں یاد رکھتا ہے۔ تمام تر گناہوں کے باوجود جب کبھی بندے تڑپ کر اسے پکارتے ہیں تو وہ ان کی ہر خطا معاف کر کے انہیں اپنی آغوش رحمت میں لے لیتا ہے۔

مگر افسوس کہ اکثر انسانوں کا دل بچوں کی طرح نہیں ہوتا۔ وہ خدا کو بھولے رہتے ہیں۔ وہ اسے نہیں پکارتے۔ وہ ابلیس کی پکار پر لبیک کہتے ہیں اور غفلت کے جھولے جھولتے ہوئے ایک روز قبر کے اندھیرے میں جا گرتے ہیں۔

کتنا عجیب ہے وہ جو ہر پکار کا جواب دیتا ہے اور کتنے بدنصیب ہیں وہ جو اسے نہیں پکارتے۔

اللہ کو دیکھنا اللہ کا دیکھنا

حدیث کی کتابوں میں ایک بہت اہم روایت بیان ہوتی ہے جسے حدیث جبریل کہا جاتا ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل علیہ السلام کا ایک مکالمہ نقل ہوا ہے جو دین کے بنیادی حقائق کا نہایت جامع بیان ہے۔ اس مکالمے میں ایک جگہ حضرت جبریل سوال کرتے ہیں کہ احسان کیا ہے؟ جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ کی عبادت ایسے کرو جیسے تم اسے دیکھتے ہو۔ تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تمھیں دیکھتا ہی ہے۔

قَالَ فَاَخبِرنِی عَنِ الِا حسَانِ، قَالَ:اَنْ تَعبُدَاللّٰہ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَم تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہُ یَرَاکَ۔

احسان کی یہ تعریف حقیقی معنوں میں اس بات کا ایک مکمل اور جامع بیان ہے کہ بندہ مومن کے حسن عمل کی اساس کیا ہوتی ہے۔ وہ اساس دراصل خداوند دو عالم کی حضوری میں جینا ہوتا ہے۔ وہ اساس اس احساس میں اپنے شام و سحر کو گزارنا ہوتا ہے کہ بندہ رب کے اور رب بندے کے ساتھ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الوہی قربت کے اس ذاتی تجربے کو بلاغت کی انتہا پر پہنچاتے ہوئے اس طرح بیان کر دیا کہ بندہ مومن تو اس طرح بندگی کی زندگی جیتا ہے کہ گویا رب کریم ہمہ وقت اس کی نگاہوں میں ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ پروردگار عالم وہ ہستی ہے کہ لا یدرکہ الابصار۔ ایسی صورت میں کہ جب نگاہیں اسے نہیں پا سکتی تو قربت الٰہی کی کیفیت کو تازہ رکھنے کا دوسرا راستہ اس بات کا یقین ہے کہ بندہ خالق کو نہ دیکھ سکے تو کیا ہوا خالق تو ضرور ہی اسے دیکھ رہا ہے۔ دونوں صورتوں میں نفسیاتی سطح پر نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے۔

اس بات کو دور جدید میں روزمرہ استعمال ہونے والی ٹیکنالوجی نے بالکل واضح

کر دیا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ بڑی دکانوں اور شاپنگ سنٹرز میں بہت بڑی تعداد میں اشیائے صرف فروخت کے لیے رکھی ہوتی ہیں۔ خریداری کے لیے آنے والے کسی بھی شخص کے لیے بظاہر بہت آسان ہوتا ہے کہ وہ کسی چھوٹی مگر قیمتی چیز کو اپنے کپڑوں وغیرہ میں چھپالے اور بغیر قیمت دیے چوری کر کے لے جائے۔

اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے دکاندار نگرانی کے کیمرے استعمال کرتے ہیں۔ کیمروں کے ساتھ جگہ جگہ ایک جملہ نمایاں کر کے لکھ دیا جاتا ہے۔

خبردار کیمرے کی آنکھ آپ کو دیکھ رہی ہے

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بری نیت سے شاپنگ سنٹر میں آنے والا شخص ڈر جاتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر اسے چیزوں کے درمیان شاپنگ سنٹر کا مالک یا اس کا کوئی ملازم نظر نہیں آرہا، مگر اس کی اپنی ایک ایک نقل و حرکت کیمرے کے ذریعے سے یہاں کے ذمہ داروں تک منتقل ہو رہی ہے۔ وہ گرچہ نہیں دیکھ رہا مگر اسے دیکھا جا رہا ہے۔ وہ چوری کرے گا تو فوراً نظر میں آجائے گا۔ یہی احساس ایسے لوگوں کو چوری چکاری سے روک دیتا ہے۔

کیمرے کی نگرانی کا یہ معاملہ واضح کر دیتا ہے کہ انسان کسی کو دیکھے یا اسے یہ احساس ہو کہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں ایک ہی نکلتا ہے۔ یہی بات حدیث جبریل میں احسان کے حوالے سے سمجھائی گئی ہے کہ اللہ کا بندے کو دیکھتے رہنا حسن عمل کے پہلو سے بندے کا اللہ کو دیکھنے کے برابر ہے۔ یہ چیز نہ صرف انسان کو برے عمل سے روکتی ہے بلکہ اس کی عبادت اور عمل صالح میں خوبصورتی، جمال، کمال اور سب سے بڑھ کر اخلاص پیدا کرتی ہے۔ بندہ جس کے لیے کام کرتا ہے ہمہ وقت خود کو اس کے سامنے سمجھتا ہے۔ وہ اپنے مالک کو نہیں دیکھ پارہا تو کیا ہوا اس کا مالک تو اسے دیکھ ہی رہا ہے۔

فرینڈز لسٹ

فیس بک انٹرنیٹ پر سماجی روابط کی ایک معروف ویب سائٹ اور سروس ہے۔ دنیا میں نوے کروڑ سے زائد لوگ اس سروس کو باقاعدہ استعمال کر کے اپنے دوست احباب سے مستقل رابطے میں رہتے ہیں۔ فیس بک میں لوگوں سے رابطہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے خود اس سائٹ کا ممبر بنا جائے اور پھر اپنے جاننے والے لوگوں کو فرینڈ ریکویسٹ بھیجی جائے۔ یوں ایک حلقہ یاراں وجود میں آتا ہے جس میں لوگ ایک دوسرے سے رابطہ کرتے اور باہمی دلچسپی کی چیزیں شیئر کرتے ہیں۔

میں ایک تنہائی پسند شخص ہوں، اس لیے فیس بک جیسی چیزوں سے دور ہی رہا ہوں۔ تاہم پچھلے دنوں بعض دوستوں کے پیہم اصرار پر میں بھی فیس بک کا ایک ممبر بن گیا۔ ممبر بنتے ہی دوست بننے اور بنانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس عمل میں جو پہلا خیال مجھے آیا وہ یہ تھا کہ دنیا میں سب سے قیمتی دوستی اور سب سے اچھا ساتھ عالم کے پروردگار کا ہوتا ہے۔ مگر ان نوے کروڑ لوگوں میں سے کتنے ہوں گے جنھیں عالم کے پروردگار کو اپنا دوست اور ولی بنانے کا خیال آیا ہوگا۔ پروردگار انہیں کا ولی بنتا ہے جو اس کی دوستی کو زندگی کا مسئلہ بنالیں۔ مگر جن لوگوں کو کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا دو عالم کا مالک ان کا دوست کیسے بن سکتا ہے؟

اس کی محبوبیت کا حال یہ ہے کہ اس کے چاہنے والے اپنی زندگی لگا دیتے ہیں، اس غرض سے کہ اس کی ایک نظر ان کے حال پر ہو جائے۔ وہ اس کو راضی کرنے کے لیے اپنی زندگی کا نذرانہ بھی اس کے حضور پیش کر دیتے ہیں۔ وہ اپنی خواہش اور مرضی کو اس کے حکم کے تابع کر دیتے ہیں۔ اس کی نافرمانی ہو جائے تو وہ تڑپ کر اس کے حضور توبہ کرتے ہیں۔ وہ دن رات اس کے احسانوں اور مہربانیوں کو یاد کر کے اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد و محور

بس یہی ہوتا ہے کہ وہ، فیس بک کی اصطلاح میں ،ان کی فرینڈ ریکیوسٹ کو ایک دفعہ کنفرم کردے۔ پھر یہی ایک نظران کی زندگی بھر کے لیے کافی ہوجاتی ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جسے کسی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے۔

اک نظر کے لیے ساری عمر

عمر بھر کے لیے اک نظر

مگر کیا کیجیے عالمی دوستی کے اس دور میں جب لوگ ہر کسی کو دوست بنا رہے ہیں، دوست اگر نہیں بنایا جا رہا تو اسے نہیں بنایا جا رہا جو دوست بنانے کا سب سے بڑھ کر مستحق ہے اور جس کی دوستی سب سے زیادہ مفید ہے۔ کیسا عجیب ہے یہ المیہ اور کیسی عجیب ہے دوستی کی یہ کہانی۔

کتنے خوش نصیب ہیں وہ جن کی فرینڈ لسٹ میں اللہ جل جلالہ کا نام موجود ہے اور کتنے بدنصیب ہیں وہ جن کی فرینڈ لسٹ پر یہ نام موجود نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

ہر مشکل سے نکلنے کا ایک راستہ ضرور ہوتا ہے

اسے ڈھونڈیئے اور اگر نہ ملے تو

خود ایک راستہ بنا لیجیے (ابو یحییٰ)

کل تک میں دنیا کو بدلنا چاہتا تھا

اور میں بہت ناکام تھا

آج میں خود کو بدل رہا ہوں

اور میں بہت کامیاب ہوں (ابو یحییٰ)

طوفان اور جھونکا

اس دنیا میں انسان جن لطیف ترین تجربات سے گزر سکتا ہے ان میں سے ایک ہوا کا وہ نرم جھونکا ہے جس کا لمس روح انسانی میں سرشاری کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ انسان میں یہ کیفیت پیدا کرنے والی یہ نرم ولطیف ہوا پندرہ سے بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے۔

وقت، موسم اور جگہ کے تغیر کے لحاظ سے اس ہوا کی رفتار میں کچھ کمی بیشی ہوتی رہتی ہے تاہم عام حالات میں ہوا اسی رفتار سے چلتی ہے۔ انسان اس ہوا میں سانس لیتے ،موسم کی تپش میں ٹھنڈک کا مزہ اٹھاتے اور سبک سر ہوا کے جھونکے میں زندگی کا مزہ لیتے ہیں۔ مگر انہیں کبھی یاد نہیں آتا کہ کائنات کے اس جہنم کدے میں جہاں یا تو بغیر ہوا کا خلا ہے یا پھر دہکتے ہوئے ستارے، وہاں یہ نرم ولطیف ہوا کس نے پیدا کی ہے۔

چنانچہ انسانوں کی یادداشت کو تازہ کرنے کے لیے خالق کائنات کبھی کبھار اس ہوا کی لگام چھوڑ دیتا ہے۔ یہ ہوا طوفان کی شکل میں اٹھتی ہے اور راہ میں آنے والی ہر چیز کو پٹخ دیتی ہے۔ امریکہ کے حالیہ سپر اسٹورم سینڈی میں بھی یہی ہوا نوے میل (ڈیڑھ سو کلومیٹر) فی گھنٹہ کی طوفانی رفتار سے چلی اور سامنے آنے والی ہر چیز کو ہلا کر رکھ دیا۔

اس ہوا نے کئی میٹر بلند طوفانی لہروں کو اٹھایا۔ راہ میں آنے والے درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ بحری جہازوں، گاڑیوں اور گھروں کو شدید نقصان پہنچایا اور انسانوں میں سے بھی جو اس کی زد میں آیا اسے زندگی سے محروم کر دیا۔

اس کائنات میں نرم ہوا اپنے خالق کا غالباً خوبصورت ترین تعارف ہے۔ انسان اس تعارف کو دن رات محسوس کرتا اور اسی میں جیتا ہے، مگر اس خالق کی تعریف نہیں کرتا۔ اس لیے کبھی کبھی سینڈی آجاتا ہے......انسانوں کو یاد دلانے کہ اس ہوا کی لگام اگر رب نہ تھامے ہوئے ہوتو انسان دنیا میں جی سکتے ہیں نہ اپنی دنیا بسا سکتے ہیں۔

آسانی کی نعمت

ایک دفعہ ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ بیسنی روٹی ان کا پسندیدہ ترین کھانا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ بیسنی روٹی وہ کس چیز کے ساتھ کھاتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ پیاز، لہسن کی چٹنی، اچار وغیرہ کے ساتھ بیسنی روٹی کھانے سے اس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

ان صاحب کی اس بات نے مجھ میں عجیب قسم کا اہتزاز (Thrill) پیدا کر دیا۔ مجھے یاد آیا کہ بنی اسرائیل کی صحرانوردی کے زمانے میں انہوں نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے ایسے ہی ذائقوں کی فرمائش کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے من وسلویٰ کی نعمتوں کا بہ کثرت اہتمام کیا، مگر پیاز لہسن اور مصالحوں کا جو مزہ ہوتا ہے اس سے انہیں اس صحرائی زندگی میں محروم رکھا گیا کیونکہ صحرا میں ان کا قیام اور نتیجتاً چٹپٹے کھانوں سے دوری ان کی تربیت کا ایک لازمی تقاضا تھا۔

ہم پر اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی احسان ہے کہ ہمیں کسی فرعون سے آزمایا گیا ہے اور نہ کھانے کے کسی ذائقے پر کوئی پابندی ہی لگائی گئی ہے۔ قران مجید میں سورہ بقرہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کو جو دعا سکھائی تھی اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ اصولی فیصلہ بیان ہوا ہے کہ اس امت پر وہ بوجھ نہیں ڈالے جائیں گے جو پچھلی امتوں پر ڈالے گئے اور نہ وہ بوجھ جسے اٹھانے کی ان میں طاقت نہیں۔

یہی وہ پس منظر ہے جس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آج کے مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی کتنی نعمتیں ہیں اور انہیں کتنی آسانی اور راحت کے دور میں اللہ کے دین پر عمل کرنا اور اسے دوسروں تک پہنچانا ہے۔ اس کے باوجود یہ ایک المیہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں غفلت برتتی ہے۔ وہ شکر گزاری کے بجائے ناشکری کا رویہ اختیار کرتی ہے۔ دوسروں تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے بجائے ان سے نفرت میں جیتی ہے۔

کیسا عجیب ہے ہم پر رب کا احسان اور کتنی عجیب ہے ہماری غفلت۔

ترقی کا راستہ

ایک نوجوان معمولی ملازمت کیا کرتا تھا۔ وہ اپنا کام بہت محنت اور دیانت داری سے کیا کرتا تھا، مگر ملازمت معمولی نوعیت کی تھی جس کی تنخواہ بہت کم تھی۔ وہ کافی عرصے تک یہاں ملازمت کرتا رہا مگر اس ملازمت میں ترقی کا کوئی امکان تھا نہ اس کا دروازہ کھل سکا۔

اس کی عمر بڑھتی جا رہی تھی چنانچہ گھر والوں نے اس کی شادی کر دی۔ اس کی بیوی بہت سمجھدار لڑکی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو سمجھایا کہ زندگی میں ترقی صرف محنت ہی سے نہیں ملتی بلکہ اس کے لیے نئے خیالات اور نئے راستے اختیار کرنا بھی ضروری ہیں۔

بیوی کے گھر آنے سے نوجوان میں ترقی کا داعیہ پہلے ہی بڑھ چکا تھا، اس بات نے اس کے جذبہ کو اور مہمیز دی۔ چنانچہ نوجوان نے اپنے حالات کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ اس کی بنیادی خوبی ایمانداری کے علاوہ گفتگو کرنے کی اچھی صلاحیت تھی۔ چنانچہ اس پس منظر میں نوجوان نے لگی بھلی آمدنی کی ملازمت چھوڑ کر ایک کمپنی میں کمیشن پر اشیا فروخت کرنے کا کام شروع کیا۔ ایمانداری اور گفتگو کی اچھی صلاحیت کی بنا پر جلد ہی اسے اس نئے شعبے میں ترقی حاصل ہونے لگی۔ کمپنی نے کچھ ہی عرصے میں اس کی اچھی تنخواہ مقرر کر دی اور کمیشن اس کے علاوہ تھا۔ تاہم یہ نوجوان مزید ترقی چاہتا تھا۔ اس نے پھر اپنا جائزہ لیا اور دیکھا کہ تعلیم میں اس کی کمی اور انگریزی سے ناواقفیت ترقی کی راہ میں رکاوٹ تھیں۔ دو برس میں اس نے محنت کر کے ان دونوں خامیوں کو بھی دور کر دیا۔ پھر ایک نئی کمپنی میں بہت اچھی ملازمت کر کے خوشحال زندگی گزارنے لگا۔

یہ مثال بتاتی ہے کہ زندگی میں ترقی کا راستہ دو بنیادی چیزوں سے عبارت ہوتا ہے۔ ایک جذبہ جو محنت پر آمادہ کرتا ہے اور دوسرا لگے بندھے راستے کو چھوڑ کر نئی راہیں تلاش کرنا۔ بلند جذبہ اور نئے آئیڈیاز ہی زندگی میں ترقی کا اصل راستہ کھولتے ہیں۔

وہ اجنبی

انسان کی ایک جملے میں مکمل تعریف بیان کی جائے تو یہ وہ ہستی ہے جو سراپا احساس اور سراپا احتیاج ہے۔ پہلی بات کا مطلب یہ ہے کہ انسان صرف ایک جیتی جاگتی حیوانی شخصیت ہی نہیں رکھتا بلکہ رنگ و بو، حسن و ادا، لذت و جمال، لطافت و سرور، صوت و آہنگ سے حظ اٹھانے کے وہ احساسات اپنے اندر رکھتا ہے جو اسے دیگر تمام موجودات سے مختلف بناتے ہیں۔ مثلاً ایک چوپائے کے لیے گلاب کا حسین پھول بس چرنے اور پیٹ بھرنے کی ایک چیز ہے۔ پانی و غذا کا مطلب گلے کی خشکی اور پیٹ کی اینٹھن کو دور کرنا ہے۔ اسے شام کی شفق، گلوں کی مہک، سبزے کے رنگ سے کوئی سرور نہیں آتا۔ مگر انسان کے لیے یہ رنگ و خوشبو اور حسن و لطافت کے وہ مظاہر ہیں جو اس کی روح کو سرشار کر دیتے ہیں۔

مگر اس کے ساتھ یہ حقیقت ہے کہ انسان سراپا عجز ہے۔ وہ محتاج مطلق ہے۔ وہ اپنی غذا، ہوا اور پانی جیسی ضروریات کو بھی خود پورا کرنے پر قادر نہیں۔ اگر آسمان نہ برسے، فضا ہوا سے خالی اور زمین بنجر ہو جائے تو انسان بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جائے۔ انسان نہ صرف محتاج مطلق ہے بلکہ اسے اپنی اس احتیاج کا بخوبی احساس بھی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے اس کے خالق و مالک کی عطا ہے۔ مگر افسوس کہ حسن کی ہر قسم کا ادراک اور اپنے عجز کی ہر شکل کا احساس رکھنے والا یہ انسان اپنے مالک سے بے پروا ہو کر جیتا ہے۔

کتنے ہیں جن کے لیے خدا بس ایک نام ہے جو بس مشکل میں پکارا جاتا ہے ورنہ کبھی اس نام کا زندگی میں گزر بھی نہیں ہوتا۔ کتنے ہیں جن کے لیے اپنا مالک اور محسن ایک اجنبی اور غیر مانوس سا وجود ہے۔ کتنے ہیں جو اُس ''اجنبی'' کو رسمی طور پر پانچ دفعہ یاد کر لیتے ہیں۔ مگر وہ ''اجنبی'' نماز کے باہر بھی اجنبی رہتا ہے اور نماز کے اندر بھی۔ کچھ اور ہیں جن کے لیے یہ ''اجنبی'' اپنے

تعصّبات اور قومی جذبات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ ایک دوسری انتہا وہ ہے جو ان لوگوں کے ردعمل میں اس ''اجنبی'' کے تصور کو بھی دل و دماغ سے کھرچ کر پھینک چکی ہے اور انکار خدا کی احمقانہ نفسیات میں جی رہی ہے۔

پیغمبر ہر دور میں آتے رہے ہیں اور اس ''اجنبی'' کو زمانے کے لیے مانوس بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر افسوس کہ ہر دور میں لوگ اس کو بھولے رہے۔ اس اپنے کو اجنبی کو اپنا سمجھتے رہے۔ اس کے بجائے غیروں کی محبت میں جیتے رہے۔ اس کی قربت کے بجائے دنیا کے عارضی مزوں میں مگن رہے۔ یہ نادان ایک ایسی دنیا میں جیتے ہیں جہاں ہر ذرہ اس اجنبی کو پوجتا ہے۔ ہر درخت اس کی محبت میں جھومتا ہے۔ ہر پرندہ اس کی حمد میں گنگناتا ہے۔ ہر وجود اس کی بے کراں عنایات کی یاد دلاتا ہے۔ اس ذاکر و شاکر کائنات میں یہی انسان وہ محروم و بدبخت ہستی ہے جو ہر رنگ کو دیکھنے کے باوجود خدا کو دیکھنے کے لیے اندھا ہے۔ وہ ہر آواز کو سننے کے باوجود اس کی پکار سننے کے لیے بہرا ہے۔ وہ ایک قلب حساس رکھنے کے باوجود عنایات رب پر شکر گزار نہیں۔ وہ خواہش کی لامحدود پیاس رکھنے کے باوجود اس کی ابدی جنت کے دریاؤں کا مشتاق نہیں۔ وہ حسن کی لازوال طلب رکھنے کے باوجود اس کی فردوس کے حسن کا طلب گار نہیں۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لیے اس دنیا میں ہر معاملے میں حساس انسان کی یہ غفلت اور سرکشی برداشت کی جارہی ہے۔ مگر عن قریب جزا و سزا کی وہ دنیا قائم ہونے والی ہے جس میں وہ اجنبی رخ زیبا سے نقاب اجنبیت اتارے گا اور حسن توحید کی تجلی کائنات کے ہر ذرے کو جگمگا دے گی۔ ہاں مگر اس روز کچھ بدبخت ہوں گے جن کی تقدیر ان کے نامہ اعمال کی طرح سیاہ ہی رہے گی۔ حسن ازل کی تجلی سے ان کا وجود منور نہیں ہوگا۔ یہ وہی محروم ہوں گے جن کے لیے ان کا ان داتا اجنبی رہا۔ جن کے لیے ان کا محسن اجنبی رہا۔

ہمیں شکایت ہے

موجودہ دور میں بڑے پیمانے پر اپنی اشیا کی فروخت کے لیے مارکیٹنگ ایک بنیادی شرط بن چکی ہے۔اس مقصد کے لیے کمپنیاں ایک بہت بڑا بجٹ خاص کرتی ہیں۔اس بجٹ کا بیشتر حصہ میڈیا وغیرہ پر اشتہارات کی مد میں خرچ ہوتا ہے۔تاہم کچھ کمپنیاں مارکیٹنگ کا ایک براہ راست طریقہ بھی اختیار کرتی ہیں۔اس طریقے میں کمپنیاں اپنی مصنوعات براہ راست صارف کو مفت میں فراہم کرتی ہیں۔صارف ان چیزوں کو استعمال کرتے ہیں اور اگر انہیں چیز پسند آجائے تو مستقل خریدار بن جاتے ہیں۔

مارکیٹنگ کے اس طریقہ کار سے ہم میں سے بہت سے لوگوں کا واسطہ پڑا ہوگا۔بارہا ہمیں کسی شاپنگ سنٹر سے باہر نکلتے ہوئے کمپنی کے نمائندے ملے ہوں گے ہیں جو اپنی مصنوعات مفت تقسیم کرتے ہیں۔لوگوں کو اگر یہ اطمینان ہو جائے کہ کسی طرح کا دھوکہ نہیں ہو رہا تو وہ مفت ملنے والی ایسی چیزوں کو خوشی خوشی لیتے ہیں۔

مارکیٹنگ کے اس طریقے کی کامیابی کی وجہ انسان کی یہ نفسیات ہے کہ وہ مفت میں ملنے والی چیزیں بڑی خوشی سے لے لیتا ہے۔یہ نفسیات اس حقیقت کی بنا پر پیدا ہوتی ہے کہ اس دنیا میں کوئی شخص کسی دوسرے کو مفت میں چیزیں نہیں دیتا۔ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے اور قیمت کے بغیر چیز نہیں ملا کرتی۔چیز جتنی ضروری اور اہم ہوتی ہے اس کی قیمت اسی حساب سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

تاہم اس دنیا میں اس حوالے سے ایک انتہائی حیرت ناک استثنا پایا جاتا ہے۔وہ یہ کہ جو چیزیں سب سے زیادہ ضروری اور اہم ہیں وہ سب کی سب بالکل مفت اور باکثرت دستیاب ہیں۔مثلاً دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی چیز زندگی ہے۔وہ ہر شخص کو مفت میں ملی ہے۔پھر زندگی کو برقرار رکھنے اور اسے پرلطف بنانے کے سارے سامان مفت میں دستیاب ہیں۔مثلاً ہوا، پانی، دھرتی،

موسم، دن، رات اور پھر وجود انسانی کے اعضا وقویٰ اور جوڑ و بند وغیرہ۔یہ ان لاتعداد نعمتوں میں سے صرف چند کے نام ہیں جن کے بغیر زندگی ممکن ہے نہ اسے گزارنا آسان ہے۔

اسے ایک سادہ ترین مثال سے یوں سمجھیں عمر بڑھنے کے ساتھ گھٹنے کے جوڑوں کا درد عام بات ہے۔یہ درد بہت اذیت ناک ہوتا ہے اور کئی پہلوؤں سے آدمی کو ناکارہ کر دیتا ہے۔تاہم آج کل گھٹنے بدلنے کی ٹیکنیک عام ہوگئی ہے۔تقریباً دس بارہ لاکھ روپے میں ایک تکلیف دہ عمل کے بعد گھٹنے بدلے جاسکتے ہیں۔گو پھر بھی یہ اصل گھٹنوں کا بدل نہیں ہوتے لیکن بہ مشکل تمام انسان ایک نارمل زندگی گزار سکتا ہے۔

دوسری طرف تمام انسان یہ گھٹنے مفت میں لے کر گھومتے ہیں۔اس پر قیاس کیا جائے تو ہمارے تمام اعضا و جوارح، جوڑ و بند اور قوت وصلاحیت کی مالیت اربوں تک جا پہنچتی ہے۔یہ سب ہمیں مفت میں ملا ہے۔مگر کبھی اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔یہی معاملہ خارج کی نعمتوں کا ہے۔ہوا ہو یا پانی، سورج کی کرن ہو یا دھرتی کی مٹی؛ یہ انمول چیزیں مفت میں اور انتہائی کثرت سے باآسانی دستیاب ہیں۔مگر کمال ہے کہ ہمیں کبھی اس کا احساس نہیں ہوتا۔

ہمارے دل میں کبھی اس ہستی کی سچی یاد نہیں جاگتی جو یہ سب ہمیں دیتا چلا جاتا ہے۔آنکھیں اس کے اعتراف نعمت میں نم نہیں ہوتیں ......احساس کی دنیا اس کی محبت سے سرشار نہیں ہوتی......جذبات کی دنیا میں احسان مندی کی لہر ہلچل نہیں مچاتی۔ہمیں بس اس سے شکایت رہتی ہے۔دوسروں کو گاڑی کیوں ملی، مجھے کیوں نہیں ملی۔دوسرے کا بنگلہ کیوں ہے میرا کیوں نہیں۔دوسرے کی بیوی اتنی خوبصورت ہے میری کیوں نہیں۔ہم یہ نہیں سوچتے کہ گاڑی ہوتی مگر ٹانگیں نہ ہوتیں، بنگلے ہوتے مگر ہاتھ نہ ہوتے، خوبصورت بیوی ہوتی مگر آنکھیں نہ ہوتیں تو کیا ہوتا۔

اس سب کے باوجود ہمیں شکایت ہے۔مالک! ہمیں پھر بھی آپ سے شکایت ہے۔

فرض آشنائی

ہمارے دین میں نماز، روزہ اور دیگر عبادات کے اوقات، ایام، اذکار اور اعمال مقرر کیے گئے ہیں۔ جیسے نماز دن میں پانچ اوقات میں متعین رکعات کے ساتھ ادا کرنا ہوتی ہے۔ سال میں رمضان کے ایک ماہ کے روزے رکھنے ہوتے ہیں وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ ان عبادات کو فرد کی صوابدید پر کیوں نہیں چھوڑا گیا اور کیوں ایک خاص تعداد اور ایام مقرر کیے گئے ہیں؟

اس بات کی حکمتیں تو بلاشبہ بے شمار ہیں لیکن ایک بنیادی حکمت یہ ہے کہ عبادات نفس انسانی کی تربیت کا ایک ذریعہ بھی ہیں۔ انسانی نفس کو اگر کسی قواعد وضوابط کی عادت نہ ڈالی جائے تو وہ بے لگام ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ عقل اور فطرت کے ہر تقاضے اور فرد و معاشرے کی فلاح کے ہر پہلو کو نظر انداز کر کے اپنی خواہش اور جذبات کے مطابق عمل کرنا چاہتا ہے۔ اس رویے کی اگر اجازت دے دی جائے تو معاشرہ درہم برہم ہو جائے گا۔

یہ عبادات ہیں جو انسان کو نفس کی خواہش کے خلاف کام کرنے کا عادی بناتی اور زندگی ایک قاعدے قانون میں ڈھالنے کی تربیت دیتی ہیں۔ مثلاً فجر کی نماز صبح جلدی اٹھنے کی عادت ڈلواتی ہے۔ فجر میں میٹھی نیند کی قربانی دے کر انسان نسیم صبح کی اس تازگی کو جسم وجاں کا حصہ بناتا ہے جو کہیں نہیں مل سکتی۔ دیگر نمازوں میں وقت کی پابندی اور رکعتوں کا تعین انسان کو عادی بناتا ہے کہ وہ اپنی قوت ارادی کو اتنا مضبوط بنالے کہ وہ زندگی کی ہر مصروفیت، دلچسپی اور آرام کو چھوڑ کر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا خوگر بنے۔

یہی وہ فرض آشنائی ہے جو ایک دفعہ انسان میں پیدا ہو جائے تو وہ اپنی ذات، خاندان اور معاشرے کے حوالے سے پیدا ہونے والی ہر اخلاقی ذمہ داری کو احسن طریقے پر نبھاتا ہے۔ اس بات کا شعور جس معاشرے میں عام ہو وہاں خیر وبرکت کے پھول ہی کھلا کرتے ہیں۔

چھوٹی نعمت

ہم انسان اپنے پروردگار کی نعمتوں کو عام طور پر دو حصوں میں بانٹتے ہیں۔ ایک بڑی نعمت اور دوسری چھوٹی نعمت۔ چھوٹی بڑی نعمت کی تعریف ہر فرد کے حساب سے مختلف ہوسکتی ہے، مگر فرد کی نفسیات کے اعتبار سے اس کا معیار نعمت ملنے پر انسان کا ردعمل ہوتا ہے۔ جس چیز کے ملنے پر انسان میں اہتزاز (Thrill) پیدا ہوا اور وہ بے حد خوشی محسوس کرے وہ اس کے نزدیک بڑی نعمت ہوتی ہے۔ اور جس چیز کے ملنے پر کوئی ردعمل نہ آئے وہ انسان کے نزدیک ایک چھوٹی اور معمولی نعمت ہوگی۔ مثلاً پسند کی شادی کے وقت ایک نوجوان جتنا خوش ہوتا ہے پانی کا ایک گلاس پیتے وقت وہ کسی درجہ ویسی خوشی محسوس نہیں کرتا۔

تاہم حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر نعمت بڑی نعمت ہے۔ مثلاً شادی پر خوشیاں منانے والے نوجوان کا پانی اگر شادی سے صرف ایک دن پہلے بند کر دیا جائے تو نکاح کے وقت تک وہ اپنی دلہن کو بھول کر پانی کو زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بنا چکا ہوگا۔ تاہم یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ وہ زندگی کی ہر بڑی نعمت کو مفت میں فراہم کرتے ہیں۔ زندگی، صحت، عافیت، ہوا، پانی، رشتے ناطے یہ وہ نعمتیں ہیں جو عموماً انسانوں کو بلا روک ٹوک اور بلا مشقت مل جاتی ہیں۔

جو نادان شعور نہیں رکھتے وہ ایسی نعمتوں کو چھوٹی نعمت سمجھتے ہیں یا اکثر اوقات انہیں کوئی نعمت سمجھتے ہی نہیں۔ لیکن جو لوگ حقیقی ایمان رکھتے ہیں وہ اس احساس سے تڑپ اٹھتے ہیں کہ ان کے مہربان رب نے ضرورت کی ہر چیز انہیں بے حساب اور بالکل مفت دے رکھی ہے۔ ان کی آنکھیں شکر گزاری کے احساس سے بہنے کے لیے کسی بڑی نعمت کی منتظر نہیں رہتیں بلکہ صبح وشام وہ رب کے احسان کو یاد کر کے روتے رہتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں عنقریب جہنم کی آہ و زاری سے بچا کر جنت کی ختم نہ ہونے والی نعمتوں میں بسا دیا جائے گا۔

پاکیزگی کا راستہ

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بڑی فضیلتیں عطا فرمائی ہیں۔ ان فضائل میں سے ایک نمایاں فضیلت صفائی اور نظافت کا وہ احساس ہے جو انسانوں کو دوسری مخلوقات سے افضل بناتا ہے۔ یہ احساس انسانوں میں اتنا زیادہ ہے کہ جب ایک سروے میں دورجدید کی سب سے اہم ایجاد کے بارے میں پوچھا گیا تو اکثریت نے واش روم سے گندگی کے خود کار اخراج کے فلش سسٹم کو دور جدید کی سب سے مفید ایجاد قرار دیا۔

تاہم صفائی اور پاکیزگی کے بارے میں آخری درجے میں حساس انسان کا یہ عجیب المیہ ہے کہ وہ جس چیز کو استعمال کرتا ہے اسے گندا کر دیتا ہے۔ گھر اور برتن سے لے کر ہوا اور خوراک تک جو چیز ہمارے استعمال میں آتی ہے آخر کار گندی ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے جسم سے جو چیز بھی نکلتی ہے وہ گندگی، بدبو اور ناپاکی کا کوئی نہ کوئی پہلو لیے ہوئے ہوتی ہے۔ یہ اس انسان کا معاملہ ہے جو کرہ زمین پر حیات کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل ہے...... جو شعور اور ارادہ، علم وآگہی، ذوق جمال اور احساس نظافت رکھتا ہے۔

مگر ایک ایسی ہستی بھی ہے جو اپنی ذات میں بھی پاک ہے اور جس چیز کو استعمال کرتی ہے، اسے بھی پاکیزہ کر دیتی ہے۔ یہ اللہ پروردگار کی ہستی ہے۔ ایک بدترین انسان بھی اگر خود کو اس پاک ہستی کے استعمال کے لیے وقف کر دے تو یہ پاکیزہ ہستی اس ناپاک انسان کی ایک ایک بری عادت کو چھڑا کر اسے پاکیزہ انسان بنا دیتی ہے۔ وہ اس کی سیرت، شخصیت، جسم، روح اور اخلاق غرض ہر چیز کا میل دھو کر اسے صاف وشفاف کر دیتی ہے۔ پھر قیامت کے دن اس انسان کو اس طرح اٹھایا جائے گا کہ اس کے جسم کی ہر حیوانی گندگی کو بھی دور کر کے اسے سراپا نور بنا دے گا۔ چیزوں کو آلودہ کر دینے والے انسان کے پاس پاکیزگی کا یہی ایک راستہ ہے۔

جلال، جمال اور کمال رب

انسان کی معلوم کائنات دو دنیاؤں کا مجموعہ ہے۔ ایک خدا کی تخلیق کردہ دنیا ہے۔ یہ دنیا زندگی اور اس کی ہر رعنائی کا آخری نشان ہے۔ اس دنیا میں بے پناہ حسن ہے۔ بے حد توازن ہے۔ رنگ وخوشبو کی دل آویزی ہے۔ نغمہ وآہنگ کی دلکشی ہے۔ نور ولطافت کے ان گنت دریچے ہیں۔ لمس و لذت کے بے شمار جھروکے ہیں۔ زیست کی حرارت ہے۔ تاروں کی جگمگاہٹ ہے۔ جگنوؤں کی روشنی ہے۔ شفق کی لالی ہے۔ ہوا کی سرسراہٹ ہے۔ ساز کی دلکشی ہے۔ آواز کا سرور ہے۔ غرض حیاتِ مستعار کسی بھی خوبی کا تصور کر لے اس کا ایک مکمل نمونہ یہاں موجود ہے۔ یہ دنیا خداوند لازوال کے بے انتہا کمال کا ایک ادنیٰ تعارف ہے۔ مگر یہ کمال جمال کی رنگ آمیزی سے عبارت ہے۔

دوسری دنیا انسان کی اپنی دنیا ہے۔ اس دنیا پر موت کا راج ہے۔ یہاں فنا کی حکمرانی ہے۔ یہاں زلزلے ہیں۔ بجلیاں ہیں۔ سیلاب ہیں۔ طوفان ہیں۔ بیماریاں ہیں۔ بڑھاپا ہے۔ معذوری ہے۔ محتاجی ہے۔ غم والم ہے۔ مایوسی وحزن ہے۔ خوف وملال ہے۔ دکھ کی جلن ہے۔ پچھتاوے کی آگ ہے۔ یہاں بے گناہ قتل ہو جاتے ہیں۔ معصوم سزا پاتے ہیں۔ کمزور ظلم کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ ہنرمند بے سہارا اور باصلاحیت بے روزگار رہ جاتے ہیں۔ غرض موت ہر قبا پہنے اور پریشانی ہر ردا اوڑھے اس دھرتی اور اس کے باسیوں کو ہر روز اپنا نشانہ بناتی ہے۔ یہ دنیا گرچہ خدا کی رضا سے نہیں مگر اس کے اذن سے یقیناً ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس لیے یہ بھی خدا کے کمال کا ادنیٰ تعارف ہے۔ مگر یہ کمال اس کے جلال کا عکس لیے ہوئے ہے۔

موت وزندگی کا یہ سلسلہ نجانے کب سے شروع ہوا اور کب تک چلے گا۔ کوئی نہیں جانتا۔ مگر جو ہم جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ عنقریب انسان کی معلوم یہ دو دنیائیں ختم ہو جائیں گی۔ پھر

ایک نئی دنیا قائم ہوگی۔اس دنیا میں خدا ایک دفعہ پھر اپنے جلال وکمال اور اپنے جمال وکمال کی صناعی سے دو دنیائیں تخلیق کرے گا۔مگر یہ دو دنیائیں اس کے کمال و جمال وجلال کا تعارف نہیں بلکہ اس کا مکمل نمونہ ہوں گی۔

ان میں سے پہلی دنیا جنت کی دنیا ہوگی۔اس دنیا میں صرف جمال خداوندی کا ظہور ہوگا۔مگر ہر جمال کمال کی انتہا کو پہنچا ہوا ہوگا۔ زندگی ہوگی مگر موت سے بے خوف۔ جوانی ہوگی مگر بڑھاپے سے بے پروا۔حسن ہوگا مگر زوال سے نا آشنا۔لذت ہوگی مگر ہر بیزاری سے محفوظ۔ سکون ہوگا مگر ہر اندیشے سے مامون۔الحمد للہ و سبحان اللہ۔ تعالیٰ جد ربنا۔

دوسری دنیا جہنم کی دنیا ہوگی۔اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں، محرومی، مایوسی، بھوک، پیاس، تڑپ، بےبسی، پچھتاوے غرض عذاب اور آگ کے اتنے روپ ہوں گے کہ گنے نہ جاسکیں۔ یہ سب بھی کمال درجہ میں ہوگا۔مگر یہ کمال جلال وغضب کی اس تپش سے عبارت ہوگا جس سے سرزمین دوزخ کا ذرہ ذرہ سلگ رہا ہوگا۔سبحان اللہ و اللہ اکبر۔تعالیٰ جد ربنا۔

پہلی بستی کو دو قسم کے لوگ بسائیں گے۔ایک وہ جو اِس دنیا میں اپنے مالک سے بے پروا ہوکر نہیں جیے۔جو حکم سامنے آیا انہوں نے مانا۔جہاں غلطی ہوئی معافی مانگ لی۔ایمان واخلاق کے تقاضوں کو چاہے ان کی زندگی نہ بنے،مگر مقدور بھر وہ ان کو بجالاتے رہے۔دوسرے وہ جو جنت کی اعلیٰ بازی لے گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے خدا کو اپنی زندگی بنالیا۔وہ ہر لمحہ اس کی یاد اور محبت میں جیے۔زندگی کے ہر سرد وگرم میں اس کے سامنے جھکے رہے۔اس کے دین کی نصرت میں سعی وجہد کرتے رہے۔عبادت رب میں سرگرم رہے۔ایک ان دیکھا خدا ان کی زندگی بن گیا۔ سو روز قیامت جب خدا دکھائی دیا تو اس نے انہیں ابدی طور پر اپنے قرب سے نواز دیا۔

دوسری بستی کے باسی بھی دو قسم کے لوگ ہوں گے۔ پہلے وہ جو سرکشی کرتے رہے۔ظلم وفساد

مچاتے رہے۔قتل و رہزنی جن کا شیوہ اور فسق وفجور جن کا پیشہ رہا۔جن کے سامنے سچ آ گیا،مگر جانتے بوجھتے انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔انہوں نے حق کو حق کی شکل میں دیکھ لیا۔مگر کبرو نخوت نے ان کی گردن میں سریہ لگادیا۔ان کے سر نہ جھکے۔پیشوائی،تعصب،مفاد پرستی جن کے دلوں کی بیماریاں اور حسد وکبر جن کے سینوں کا روگ تھا۔ان کا روگ ان کو لے ڈوبا۔اور ڈوبا بھی اس بستی میں جہاں ہر طرف عذاب کی بارش ہو رہی ہے۔

اس بستی کے دوسرے مکین وہ ہیں جن کے دل غفلت کا شکار رہے۔دنیا کے مزوں اور لطف نے ان کو اندھا کردیا۔بدکاری اور بدی نے ان کی زندگی کا احاطہ کرلیا۔وہ جانور بن کر جیے اور پیٹ وفرج کے تقاضوں سے اوپر اٹھ کر نہ دیکھ سکے کہ جمال وکمال کی کس دنیا میں وہ بسائے گئے ہیں۔وہ خدا کی اس تعارف گاہ کو ایک چراگاہ سمجھے۔معرفت،عبادت اور عبادت کی خوراک کے بجائے گناہ اور معصیت کا رزق ان کا مقدر بنا۔انہوں نے معرفت رب کا ایک دفعہ ملنے والا یہ موقع ہمیشہ کے لیے گنوادیا۔ یہ غافل بھی سرکشوں کے ساتھ جلال الٰہی کی ناقابل برداشت تپش کا سامنا کریں گے۔

ہم سب ان چار گروہوں میں سے کسی ایک گروہ میں ہیں۔زیادہ وقت نہ گزرے گا کہ سب کو معلوم ہوجائے گا کہ کون تھا جو خدا کی آہٹ پر ڈرنے والا تھا اور کون تھا جو انذار آخرت کی ہر گرج کے بعد بھی غفلت کی نیند سویا رہتا تھا۔کون ہے جو سراپا حمد تھا اور کون تھا جو سرکشی کا پیکر تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

کامیاب زندگی یہ نہیں کہ آپ کتنے خوش ہیں
کامیاب زندگی یہ ہے کہ
آپ کا پروردگار آپ سے کتنا خوش ہے (ابویحییٰ)

خدازندہ ہے

کوئی بندہ مومن اگر حقیقی معنوں میں زندہ ہو اور اپنے رب سے ایک زندہ تعلق قائم رکھتا ہو تو پروردگار عالم کی معرفت کے ایسے تجربے اس پر گزرتے ہیں کہ وہ ہر لمحہ اپنی زندگی میں اپنے مالک کی کرم فرمائی اور اس کی قربت کا زندہ تجربہ کرسکتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل میرے ایک دوست نے میرے ساتھ اپنا ایک ایسا ہی تجربہ شیئر کیا۔

ایک روز انہیں اپنا کوئی ضروری دفتری کام رات گئے تک گھر میں نمٹانا تھا تاکہ اگلی صبح اسے کسی میٹنگ میں پیش کیا جاسکے۔ اس کام کے لیے انٹرنیٹ، کمپیوٹر کے کچھ سوفٹ ویئر کے علاوہ بعض دیگر لوگوں کی مدد درکار تھی۔ کام بہت مشکل تھا اور بہت رات ہوگئی تھی، مگر انہوں نے ہمت ہارے بغیر مسئلہ حل کرنے کی کوشش شروع کردی۔ ایک ایک کرکے وہ ہر رکاوٹ دور کرتے چلے گئے۔ مگر ایک آخری مسئلہ ایسا اٹکا کہ کئی گھنٹے کی کوشش کے بعد بھی حل نہ ہوسکا اور وہ ہمت ہار گئے۔

دو تہائی رات ہوچکی تھی۔ مگر وہ کچھ نوافل پڑھ کر سونے کے عادی تھے۔ تھکن کی وجہ سے وہ قدرے بے دلی کے ساتھ نفل پڑھنے لگے۔ جیسے ہی سجدے میں گئے تو ان کی کمر میں شدید چمک اٹھی۔ یہ بغیر ٹیک لگائے مسلسل بیٹھ کر کام کرنے کا نتیجہ تھا۔ اس لمحے انہیں احساس ہوا کہ وہ عاجز انسان ہیں جو اپنی قدرت سے کمر جھکا کر ایک سجدہ کرنے کے قابل بھی نہیں۔ یہ احساس انہیں تڑپا گیا۔ انہوں نے بہت شدت سے پروردگار سے دعا کی کہ اے قادر مطلق! میں کچھ نہیں کرسکتا، مگر تو سب کچھ کرسکتا ہے۔ میرا مسئلہ حل کردے۔ انہوں نے نماز ختم کی۔ ذہن میں مسئلے کا حل اچانک کوندا اور تھوڑی دیر میں وہ مسئلہ حل ہوگیا جو گھنٹوں سے حل نہ ہورہا تھا۔

خدا زندہ ہے۔ ہاں اس کو محسوس کرنے کے لیے بندے میں خود زندگی ہونی چاہیے۔ جس شخص میں ایمان کی زندگی موجود ہے وہ زندگی کے ہر موڑ پر خدا کی معیت کا زندہ تجربہ کرسکتا ہے۔

گاڑی سے پردہ

پچھلے دنوں میں نے ایک مضمون ''مردوں کی نگاہیں'' کے عنوان سے لکھا۔ اس مضمون میں مردوں کے نگاہ نیچی رکھنے کے حکم کی اہمیت بتائی گئی تھی۔ یہ مضمون ایک صاحب نے پڑھا اور اس سے مکمل اتفاق کیا۔ پھر انہوں نے ایک بڑی دلچسپ بات اپنے حوالے سے یہ بتائی کہ وہ زندگی میں ایک عرصے تک چمکتی دمکتی نئے ماڈل کی گاڑیوں سے نگاہوں کا ایسا ہی پردہ کرتے رہے ہیں۔

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب بینکوں سے قسطوں پر ملنے والے قرضوں کی وجہ سے سڑکوں پر ہر جگہ نت نئے ماڈل کی گاڑیاں نظر آتی تھیں۔ انہیں اپنی فیملی کے لیے گاڑی کی ضرورت تھی، مگر اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ نئے ماڈل کی گاڑی خرید سکیں۔ مگر جب کبھی وہ سڑکوں پر ہر طرف چلتی نئے ماڈل کی گاڑیوں کو دیکھتے تو دل میں انہی کی خواہش پیدا ہوتی۔ اس مسئلے کا ایک حل انہوں نے یہ نکالا کہ محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً نئی گاڑیوں سے نگاہوں کا پردہ شروع کردیا۔ جہاں کہیں کوئی نئی گاڑی نظر آتی وہ بالجبر اپنی نگاہیں ان کی طرف سے پھیر دیتے۔ پہلے وہ ان گاڑیوں کو غور سے دیکھتے تھے تو دل میں خواہش بڑھتی تھی، مگر اس عمل سے یہ خواہش کم ہوگئی۔

حقیقت یہ ہے کہ بندہ مومن آخرت کے لیے جیتا ہے۔ اگر وہ اپنی ساری تگ ودو کا مقصد دنیا اور اس کی رنگینیوں کو بنالے تو وہ آخرت کی فلاح کے لیے سرمایہ کاری نہیں کرسکے گا۔ اس راہ میں اکثر لوگ گناہ اور حرام کا راستہ بھی اختیار کرلیتے ہیں۔ وہ یہ نہ بھی کریں تب بھی خواہشیں اتنی ہوتی ہیں کہ ہر خواہش پوری کرنے کے بعد ایک نئی خواہش سامنے آکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ نتیجتاً وہ ساری زندگی خواہشات کے پیچھے بھاگتا رہے گا۔ اس کا تمام پیسہ اور وقت دنیا کی چیزوں کی خواہش اور پھر ان کے حصول کی جدوجہد میں گزر جائے گا۔ ایسے میں خواہشات کا راستہ روکنے کا یہی طریقہ ہے کہ بندہ مومن نگاہوں کا پردہ شروع کردے۔ چاہے وہ گاڑی سے ہو یا بنگلے سے۔ یہی رویہ جنت کی ختم نہ ہونے والی نعمتیں حاصل کرنے کا درست طریقہ ہے۔

پانچ جاتے ہیں چار پھرتے ہیں

پاکستان میں سیاسی تبدیلی آ گئی۔نواز شریف نے مسند اقتدار پر قدم رکھ دیا۔یہ وہ جگہ ہے جہاں سے 14 برس قبل ان کو نکالا گیا تھا۔ اس کے بعد اس مسند پر ظفر اللہ جمالی، چوہدری شجاعت،شوکت عزیز،محمد میاں سومرو، یوسف رضا گیلانی، راجہ پرویز اشرف اور میر ہزار خان کھوسو فائز رہے۔مگر سب ایک کے بعد ایک رخصت ہو گئے۔جبکہ میاں نواز شریف کو اقتدار سے فارغ کرنے والے پرویز مشرف کو بھی اقتدار چھوڑنا پڑا اور ان کے انتخاب کے وقت وہ اسی شہر اسلام آباد میں نظر بند تھے۔اس کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ نواز شریف کو بھی جلد اقتدار چھوڑنا ہو گا۔

یہ حکومت کے اقتدار کی کہانی ہے جسے ہر حال میں ہر شخص کو چھوڑنا پڑتا ہے۔زندگی کے اقتدار کی کہانی بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں۔یہ دھرتی جس پر آج ہم آباد ہیں۔کبھی اس پر فرعون، شداد، چنگیز،سکندر اور دارا جیسے انتہائی طاقتور لوگ حکمران تھے۔صرف سو برس قبل دنیا کی تقریباً سو فیصد آبادی ان لوگوں پر مشتمل تھی جو آج نہیں اور اگلے سو برسوں میں وہ تمام لوگ مر چکے ہوں گے جو آج اس دھرتی کے خشک و تر کے مالک بنے ہوئے ہیں۔

سب کا انجام سب کی منزل قبر کا گڑھا ہے۔مگر انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اس سب سے بڑی حقیقت سے غافل ہو کر جیتا ہے۔وہ ایسے جیتا ہے جیسے اسے کبھی نہیں مرنا۔مگر جب مرتا ہے تو ایسا ہو جاتا ہے جیسے کبھی موجود ہی نہ تھا۔یہ غافل حرام مال جمع کرتا ہے۔مگر چھوڑ کر قبر میں جا گرتا ہے۔یہ حرام کمائی سے بڑے گھر بناتا ہے۔لیکن قبر کی تنگی اس کا انجام بنتی ہے۔وہ مصاحبوں کے جمگھٹے میں جیتا ہے۔اور آخر کار چار کاندھوں پر لاد کر قبر میں ڈال دیا جاتا ہے۔کاش یہ حقیقت ہر حکمران کو یاد رہے۔کاش یہ حقیقت ہر انسان کو یاد رہے۔

ہائے غافل وہ کیا جگہ ہے جہاں
پانچ جاتے ہیں چار پھرتے ہیں

پٹا ہوا مہرہ

ایک صاحب اپنی فیملی کے ہمراہ والد صاحب کے ساتھ رہتے تھے اور والد صاحب ہی ان کا خرچہ اٹھاتے تھے۔ان کے اپنے والد صاحب سے کچھ اختلافات ہو گئے۔والد صاحب نے اس پر ناراض ہو کر ان کو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔انہوں نے اس کے جواب میں ادب سے عرض کر دیا کہ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

انسانوں کی کہانی میں ایسے کئی موڑ آتے ہیں جن کا مشاہدہ دن رات اس معاشرے میں کیا جاسکتا ہے۔تاہم باپ اور بیٹے کی یہ کہانی بعض اوقات اللہ اور بندے کی کہانی بھی بن جاتی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب زندگی میں بندہ اپنے رب سے کچھ مانگتا ہے۔مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی دعا و فریاد کا کوئی جواب نہیں آتا۔ بلکہ بارہا انسان کو نقصان اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ایسے میں کچھ لوگ اللہ سے مایوس اور بددل ہو جاتے ہیں۔انہیں رب سے شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔بعض لوگ غیر اللہ کے در پر جا پڑتے ہیں اور انہی سے حاجت روائی کی درخواست کرتے ہیں۔

تاہم بندوں کی ایک قسم اور بھی ہوتی ہے۔وہ رب کو پکارتے ہیں اور جب جواب نہ ملے تو ناراض ہونے کے بجائے اللہ تعالیٰ سے کہتے ہیں۔آپ نے جو کرنا ہے کر لیجیے۔ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔یہ الفاظ ایک ایسے انسان کے منہ سے نکلتے ہیں جو پٹے ہوئے مہرے کی طرح ہوتا ہے۔جو اپنی شکست کی آواز آپ ہوتا ہے۔

اس کے بعد کچھ بھی نہیں ہوتا......آسمان سے فرشتے نہیں اترتے۔زمین پر بھونچال نہیں آتا۔پٹا ہوا مہرہ درِ مالک پر پڑا رہتا ہے۔جو سننے والا ہے وہ سب دیکھتا ہے،مگر خاموش رہتا ہے۔اس کے ہاں سے کوئی جواب نہیں آتا۔حاملین عرش محوِ حیرت رہ جاتے ہیں۔جبریل و میکائیل پر سکتہ طاری ہو جاتا

ہے۔ ملائکہ دم سادھے کھڑے رہتے ہیں۔ زمین وآسمان ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں۔ شجر وحجر دانتوں تلے انگلیاں دبالیتے ہیں۔ سورج اور ستارے نظریں بچا کر یہ منظر دیکھتے ہیں۔ دن ورات سارے دھندے چھوڑ کر تماشائی بن جاتے ہیں۔ ہوا اور فضا، صحرا اور سمندر، دریا اور جنگل، چرند و پرند، کوہ وچمن سب اس بے رخی پر دم بخود رہ جاتے ہیں کہ مانگنے والا کیسے محروم رہ گیا۔

وقت گزر جاتا ہے۔ کون کسی کے لیے رکتا ہے۔ سو دنیا بھی اپنے اپنے دھندوں میں لگ جاتی ہے۔ ملائکہ فرمانبرداری میں؛ دن رات، سورج چاند، تارے سیارے گردش میں؛ شجر وحجر، ہوا وفضا، صحرا وسمندر، دریا اور جنگل، چرند و پرند، کوہ وچمن غرض تمام ساکنان ارض معمولات کی ادائیگی میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ پٹا ہوا مہرہ درِ مالک پر پڑا رہتا ہے۔

پھر ایک روز حاملین عرش سے پوچھا جاتا ہے: یہ کون ہے اور کیا کہتا ہے؟

بہت اعلیٰ مقام والے بہت ادب کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔ یہ ایک پٹا ہوا مہرہ ہے۔ اب تو کچھ نہیں بولتا۔ مگر جب تک بول سکتا تھا آپ کا نام لے کر کہتا تھا: ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ حاملین عرش کے پاس ایک فیصلہ آتا ہے:

اس پٹے مہرے کو تقدیر کی بساط پر دنیا وآخرت کا بادشاہ بنا دو۔

حاملین عرش محو حیرت رہ جاتے ہیں۔ جبریل و میکائیل پر سکتہ طاری ہوجاتا ہے۔ ملائکہ دم سادھے کھڑے رہتے ہیں۔ زمین وآسمان ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں۔ شجر وحجر دانتوں تلے انگلیاں دبالیتے ہیں۔ سورج اور ستارے نظریں بچا کر یہ منظر دیکھتے ہیں۔ دن ورات سارے دھندے چھوڑ کر تماشائی بن جاتے ہیں۔ ہوا اور فضا، صحرا اور سمندر، دریا اور جنگل، چرند و پرند، کوہ وچمن سب اس عنایت پر دم بخود رہ جاتے ہیں کہ پٹا ہوا مہرہ کیسے بادشاہ بن گیا۔

باپ بیٹے کو نہیں چھوڑ سکتا۔ خدا بندے کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ پٹا ہوا مہرہ اس لیے بادشاہ بن گیا۔

اکیسویں صدی کا نشہ

انسان ہر دور میں نشہ کرتے آئے ہیں۔ نشہ انسان کو وقتی طور پر مزہ یا سرور دیتا ہے اور اسے زندگی کے تلخ حقائق سے دور کر دیتا ہے۔ تاہم یہ نشہ مستقل بنیادوں پر کبھی سکون نہیں دے سکتا بلکہ نشے کا عادی ہونے کے بعد لوگوں میں نشے کی طلب بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس کا سرور کم سے کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب لوگ مزے کے بجائے مجبوری میں نشہ کرتے ہیں۔ اور طرح طرح کے عوارض اور مسائل کا شکار ہوجاتے ہیں۔

انسان اپنی تاریخ میں ناک اور زبان کے راستے ہی نشہ سے واقف رہے ہیں جیسے ہیروئن یا شراب وغیرہ۔ مگر اکیسویں صدی میں نشے کی ایک نئی قسم ایجاد ہوئی ہے جو آنکھوں کے راستے انسانوں کے اندر اتر جاتی ہے۔ یہ نشہ انفارمیشن ایج کے آلات سے ملنے والی تفریح کا نشہ ہے۔ ٹی وی، فلمیں، ڈرامے، کھیل، وڈیو گیم، انٹرنیٹ، فیس بک، چیٹنگ وغیرہ اس نشے کی نمایاں ترین مثالیں ہیں۔ اکیسویں صدی کا ہر فرد کم یا زیادہ اس نشے کا شکار ہے۔

لوگ اس نشے کے بھی اسی طرح عادی ہوجاتے ہیں جیسے شراب اور چرس کا نشہ ہوتا ہے۔ ان چیزوں کے بغیر ان کے شب و روز اور صبح و شام نہیں کٹتے۔ اس کے نتیجے میں بچے تعلیم سے، خواتین گھر گرہستی سے اور مرد ذمہ داریوں سے بے نیاز ہوجاتے ہیں۔ لوگ ایک گھر میں رہ کر ایک دوسرے سے بے خبر رہتے ہیں۔ دوست احباب اور رشتہ داروں سے ملنے کا وقت نہیں رہتا۔ وقت کا زیاں، ذہنی صلاحیت کا مفلوج ہونا اور اخلاقی اقدار کی کمزوری اس کے عام نتائج ہیں۔ یہ فرد اور معاشرے دونوں کو ایسے ہی نقصان پہنچاتا ہے جیسا کوئی اور نشہ۔

مگر بدقسمتی سے کوئی اس نشے کو نشہ نہیں مانتا۔ کوئی خود کو اور اپنے بچوں کو اس نشے سے بچانے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ یہ نشہ انہیں سکون سے مستقل طور پر محروم کر دیتا ہے۔

باخبر کی بے خبری

ایک مغربی مصنف کا قول ہے کہ اپنے اردگرد کے حالات سے سب سے زیادہ بے خبر لوگ وہ ہوتے ہیں جو مقامی خبریں مکمل ذوق وشوق سے دیکھتے، سنتے اور پڑھنے کے عادی ہوتے ہیں۔

یہ قول بلاشبہ ایک سنگین ترین حقیقت کا بیان ہے۔ اس دنیا میں ہر مزاج کے انسان پائے جاتے ہیں اور ہر طرح کے واقعات بھی رونما ہورہے ہوتے ہیں۔ یہاں حادثات ہوتے ہیں۔ جرائم اور سانحات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ مگر عام حالات میں انسانی معاشرے میں یہ استثنائی صورتحال ہوتی ہے۔ یعنی ایک کروڑ کی آبادی میں چند لوگ قتل ہوجاتے ہیں۔ بلاشبہ چند لوگوں کا قتل بھی ایک سنگین بات ہے، مگر آبادی کے تناسب کے لحاظ سے معاشرے کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

دوسری طرف اسی شہر میں ہزاروں لاکھوں معمول کے واقعات جاری وساری ہوتے ہیں۔ تاہم میڈیا کے لیے ان معمول کے نارمل اور اچھے واقعات میں خبر کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔ اس کی دلچسپی ہمیشہ استثنائی اور سنسنی خیز واقعات میں ہوتی ہے۔ اس لیے میڈیا پر ہمیشہ قتل کے جرائم کی خبریں، حادثے اور سانحات کی نوعیت کی چیزیں ہی بیان ہورہی ہوتی ہے۔ مگر جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ یہ سب استثنائی واقعات ہوتے ہیں اور لاکھوں لوگ اس سب کے باوجود نارمل زندگی گزار کر ہی اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

تاہم میڈیا دیکھنے والے نارمل حالات کے بجائے انہی سنسنی خیز اور منفی خبروں کو دیکھ کر اپنا ذہن بناتے ہیں۔ وہ مستقل خوف اور اندیشے میں جینے لگتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس میں مبتلا کردیتے ہیں۔ انہیں معاشرے میں کوئی چیز نارمل نظر نہیں آتی۔ یہی وہ چیز ہے جو ایک باخبر آدمی کی بے خبری کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ مگر یہ بے خبری بے قیمت نہیں۔ اس کی قیمت انسان کا اپنا ذہنی سکون ہے۔ بلاشبہ یہ سب سے بڑی قیمت ہے جو کوئی انسان دے سکتا ہے۔

بہترین داعی

پچھلے دنوں ایک صاحب نے مجھے اپنے تجربے کی روشنی میں بتایا کہ بہترین داعی کون ہوتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ زندگی میں ہر موقع پر لوگوں کی مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کا کام اپنا ذاتی کام سمجھ کر کردیا۔ کسی کی مالی مدد کردی۔ روڈ پر جارہے ہیں تو کسی کو اپنی سواری پر لفٹ دے دی۔

ایسے تمام مواقع پر لوگوں کے دل میں ان کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہوجاتا ہے۔ لوگ دل کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ یہ شکریہ سن کر وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ بھلائی جو میں نے آپ کے ساتھ کی ایک قرض ہے۔ یہ قرض اسی وقت ادا ہوگا جب آپ کسی اور کے ساتھ ایسی ہی کوئی چھوٹی بڑی بھلائی کردیں گے۔ ساتھ میں دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کردیں گے کہ جس نے مجھے آپ کی مدد کے لیے بھیجا۔ تب ہی یہ قرض ادا ہوگا۔

بلاشبہ یہ عمل ایک بہترین داعی کی نشانی ہے۔ کسی نارمل آدمی کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنے محسن کی نصیحت کو بھول جائے۔ انسان کی یہ نفسیات ہے کہ وہ آسانی کے وقت سرکش اور غافل بنا رہتا ہے، مگر مشکل میں وہ اپنے جامے میں آجاتا ہے۔ اس موقع پر کی گئی کوئی نصیحت خاص کر جب وہ اپنے محسن کی طرف سے کی جارہی ہو، انسان کی یادداشت کا حصہ بن جاتی ہے۔ وقت وحالات اسے کبھی یہ بات بھلادیں مگر جب کوئی مصیبت زدہ یا ضرورت منداس کے سامنے آئے گا تو بہر حال اسے یاد آجائے گا کہ کبھی کسی مہربان نے اس پر احسان کرکے بدلہ چاہنے کے بجائے دوسرے سے بھلائی کی نصیحت کی تھی۔ پھر چراغ چراغ کو جلائے گا اور برائی کا اندھیرا دور ہونا شروع ہوجائے گا۔

یہی دعوت کی وہ حکمت ہے جس کی آج سب سے بڑھ کر ضرورت ہے۔

مال اور حوصلہ

پچھلے دنوں ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ اللہ انہیں مال دے گا تو وہ لوگوں پر کثرت سے خرچ کیا کریں گے۔ اس لیے وہ اللہ سے کثرت مال کی بہت دعا کرتے ہیں۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا طلب مال کا مقصد یہی ہے تو پھر صرف مال کی دعا مت کیجیے بلکہ اللہ سے مال خرچ کرنے کا حوصلہ بھی مانگیے۔ اس لیے کہ پیسے خرچ کرنے کا تعلق اس بات سے نہیں ہوتا کہ آپ کے پاس مال کتنا ہے۔ زیادہ تعلق اس بات سے ہوتا ہے کہ آپ میں حوصلہ کتنا ہے۔

مال خرچ کرنا ایک عظیم ترین عبادت ہے۔ اس کی جتنی فضیلت قرآن وحدیث میں آئی ہے کم ہی کسی اور عبادت کی آئی ہوگی۔ نیکی کا سات سو گنا تک اجر اور اللہ کو قرض دینے جیسے عظیم مقامات کا بیان قرآن مجید میں مال خرچ کرنے کے حوالے ہی سے ہوا ہے۔ مگر مال کی ایک عجیب خصوصیت ہے۔ یہ جیسے ہی انسان کے پاس آتا ہے، اسے گن گن کر رکھنے، سمیٹنے، جمع کر لینے، تجوری اور بینک بیلنس بھر لینے کی خواہش بڑھتی چلی جاتی ہے۔

انسان بہت حوصلہ کرے تو وہ اس مال کو اپنی ذات اور خواہشات پر خرچ کر دیتا ہے۔ مگر یہ مال دوسرے پر خرچ کیا جائے اور اپنا مال لوگوں کو دیا جائے یہ حوصلہ شاذ و نادر ہی لوگوں میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ حوصلہ صرف ان لوگوں کو ملتا ہے جن پر اللہ کا خصوصی فضل ہو۔ یہ وہ بندے ہوتے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اپنی رحمتوں کے لیے چن لیتے ہیں۔ ان کے دل میں انسانیت کا درد، رشتہ داروں کی محبت اور خدا کے دین کی نصرت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

جس کے بعد انسان مال کے کم ہو جانے کے خیال سے نہیں گھبراتا۔ وہ خرچ کرتا ہے اور اللہ اسے اور دیتا ہے۔ کبھی تنگی بھی ہو جائے تب بھی ان کا ہاتھ نہیں رکتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو روز قیامت اللہ کو قرض دینے والے اور نیکیوں کا اجر سات سو گنا تک پانے والے بنیں گے۔

قرآن کا زکوۃ کیلکولیٹر

مسلمان ہر سال زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ جس میں ذاتی استعمال کی اشیاء کو چھوڑ کر جمع شدہ سرمایہ کی ہر شکل پر ڈھائی فی صد زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے۔ زکوٰۃ کا حساب رکھنا زیادہ مشکل نہیں۔ کل رقم کو چالیس سے تقسیم کر دیا جائے تو عائد ہونے والی زکوٰۃ کا حساب معلوم ہو جاتا ہے۔ تاہم جن لوگوں کے اموال مختلف مدوں میں محفوظ ہوتے ہیں، ان کے لیے یہ کام کچھ مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی سہولت کے لیے زکوٰۃ کیلکولیٹر انٹرنیٹ پر عام دستیاب ہیں۔ ان کی مدد سے باآسانی اپنی زکوٰۃ معلوم کی جاسکتی ہے۔

تاہم زکوٰۃ یا انفاق کیلکولیٹر کی ایک اور قسم بھی ہے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ خرچ کیے گئے ہر پیسے کو دس سے سات سو گنا تک بڑھا دیتے ہیں۔ جبکہ ریاکاری اور لوگوں کو دکھانے کے لیے پیسے خرچ کرنے کی صورت میں ساری رقم صفر سے ضرب کھا جاتی ہے۔ یہی معاملہ خرچ کر کے احسان جتلانے اور ایذا دینے کا ہے۔

ہر بندہ مومن کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ قرآن مجید کے بیان کردہ اس کیلولیٹر پر اپنے خرچ کا حساب ضرور کرے۔ وہ اگر اپنا انفاق پورے دل سے اللہ کی رضا کے لیے کرے گا، ہر طرح کی مشکل اور تنگی کے باوجود کرے گا، اسے لوگوں پر احسان کے بجائے خود پر اللہ کا احسان سمجھے گا، اسے اپنی پاکیزگی اور اللہ کی قربت کا ذریعہ سمجھے گا، اسے اپنی تربیت اور آخرت کی محبت کا سبب بنائے گا تو اس کا خرچ کیا ہوا ہر روپیہ سات سو روپے سے بدل جائے گا۔

اگر ہم اپنی زکوٰۃ اس طرح خرچ کرتے ہیں اور ہماری کل زکوٰۃ دس ہزار روپے بنی ہے تو اللہ کے ہاں وہ ستر لاکھ سمجھی جائے گی۔ اور ایک لاکھ ہے تو سات کروڑ روپے کے برابر سمجھی جائے گی۔ اس کے برعکس ریاکاری، نمائش اور جتلانے والے کی کروڑوں کی زکوٰۃ بھی قیامت کے دن صفر ہو جائے گی۔

سو آج کے بعد آپ زندگی میں جب بھی زکوٰۃ اور انفاق کا عزم کریں تو ہمیشہ قرآن مجید کا زکوٰۃ کیلکولٹر اٹھایئے اور اس پر اپنی رقم کے بجائے احساسات کا حساب کیجیے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا فرشتے آپ کے نامہ اعمال میں کتنی رقم لکھ رہے ہیں۔

یہ دنیا وہ دنیا

اس مادی دنیا میں ہمارا ہر عمل ایک نتیجہ تخلیق کرتا ہے۔ ہم چلیں گے تو آگے بڑھیں گے۔ بوئیں گے تو کاٹیں گے۔ کھائیں گے تو سیر ہوں گے۔ پئیں گے تو پیاس بجھے گی۔ بولیں گے تو سنے جائیں گے۔ محنت کریں گے تو اسباب دنیا جمع کرتے چلے جائیں گے۔ مگر اس دنیا میں ایمانی عمل کوئی مادی نتیجہ پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ بعض اوقات الٹا نتیجہ پیدا ہوجاتا ہے۔ ایک بندہ مومن اس طرح تڑپ کر خالق ارض وسما کی حمد کرتا ہے کہ پہاڑ و پرند اس کے ساتھ حمد کرنے لگتے ہیں، مگر وہ گھر سے بے گھر اور وطن سے بے وطن کردیا جاتا ہے۔ ایک دیانت دار شخص کرپشن کی دلدل میں گھرے ہوکر بھی خود کو آلودہ نہیں کرتا، مگر اس کی ایمانداری اس کے لیے قیمتی پلاٹ اور عالیشان گھر نہیں تخلیق کردیتی۔ ایک باحیا لڑکی اپنی شرافت کا بھرم رکھتی ہے، مگر حسن پرستی کے اس دور میں اپنا گھر اس کے لیے خواب وخیال ہوجاتا ہے۔

وہ قدریں جن کے بغیر انسانیت شرف انسانیت سے محروم ہوجائے گی وہ اس مادی دنیا میں آخری درجے میں غیر موثر ہیں۔ اس سے زیادہ حوصلہ پست کردینے والی کوئی حقیقت اس مادی دنیا میں نہیں پائی جاتی۔ ایسے میں خدا کی کتاب ہے جو یہ بتاتی ہے کہ یہ مادی دنیا ایک روز کوٹ کوٹ کر برابر کردی جائے گی اور ہر مادی عمل فنا ہوجائے گا۔

پھر ایک نئی دنیا تخلیق ہوگی۔ اس دنیا میں خدا کی محبت اور خوف میں بہنے والا ہر آنسو ستاروں اور کہکشاؤں کی بادشاہی تخلیق کردے گا۔ فحش کو دیکھ کر جھک جانے والی نگاہ حسن کے جلووں کی ابدی تماشائی بنادی جائے گی۔ اپنی نسوانیت کو مجمع میں ابھارنے کے بجائے چھپانے والی حیا جمال وکمال کے آخری قالب میں ڈھال دی جائے گی۔ ایمان، رحم، انفاق، صبر اس روز وہ چیک بکس بن جائیں گے جن سے جنت کا ہر محل اور ہر نعمت خریدی جاسکے گی۔

یہ مادی دنیا اور اس کا ہر عمل فانی ہے۔ وہ ایمانی دنیا ابدی ہے۔ اس کی ہر نعمت لازوال ہے۔

میاں بیوی اور دوستی

ہمارے معاشرے میں نوجوان شادی شدہ جوڑوں میں طلاق کی شرح بڑھ گئی ہے۔ جہاں اس کے اور کئی اسباب ہیں وہیں اس کا سبب اس بات کو نہ جاننا ہے کہ میاں بیوی کا تعلق دوستی اور برابری کا نہیں بلکہ محبت اور موافقت کا تعلق ہوتا ہے۔

میاں بیوی کے تعلق اور دوستی کے تعلق میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوست اپنے ذوق کے مطابق بناتا ہے۔ کسی بھی دو افراد کا ذوق سو فیصد ایک سا نہیں ہوسکتا۔ لیکن دوستی کے رشتے میں یہ حقیقت اس لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتی کہ انسان اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی مرضی اور موڈ کے مطابق وقت گزارتا ہے اور جب دل چاہے اپنے گھر کی راہ لے سکتا ہے۔

جبکہ میاں بیوی ایک ہی گھر میں ہمہ وقت ساتھ رہتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر ان کے ذوق، عادات، رویے اور سوچ کے تمام فرق کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ ایسے میں نبھانے کی ایک ہی شکل ممکن ہے کہ دونوں فریق کچھ نہ کچھ ایڈجسٹمنٹ کریں۔ یہ ایڈجسٹمنٹ عین عدل وانصاف کی بنیاد پر ففٹی ففٹی کے تناسب سے نہیں ہوسکتی۔ حقیقت پسند لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ زیادہ تر حالات میں شادی کے ابتدائی پانچ سات برسوں میں کم یا زیادہ بیوی ایڈجسٹ کرتی ہے جبکہ باقی ساری زندگی کم یا زیادہ مرد ایڈجسٹ کرتا رہتا ہے۔

یہ ایڈجسٹمنٹ یا موافقت برابری کی بنیاد پر نہیں بلکہ محبت کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ جبکہ دوستی ہر حال میں برابری کا تقاضہ کرتی ہے۔ یہ برابری اگر ممکن نہیں تو دوستی ختم ہوجاتی ہے۔ مگر دوستی ختم ہونے سے زیادہ فرق اس لیے نہیں پڑتا کہ انسان کو اور دوست مل جاتے ہیں۔ جبکہ میاں بیوی کی علیحدگی ایک گھر کے ٹوٹنے اور بچوں کے برباد ہوجانے کا نام ہے۔ اسی لیے میاں بیوی کو برابری اور دوستی کے بجائے محبت اور موافقت کے اصول پر زندگی گزارنی چاہیے۔

ایمان، حج اور جہاد

ذوالحجہ کا مہینہ حج کا مہینہ ہے۔ یہ عظیم عبادت جو اسلام کے بنیادی ارا کین میں سے ایک رکن ہے، زندگی میں ہر صاحب استطاعت مسلمان پر ایک دفعہ فرض ہے۔ امام بخاری اپنی صحیح کی کتاب الایمان میں ایک روایت لائے ہیں جو اس بات کا بہترین بیان ہے کہ دین اسلام میں حج کی کیا اہمیت ہے:

’’حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کونسا عمل افضل ہے۔ فرمایا: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان۔ کہا پھر کون سا عمل؟ فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد۔ پھر پوچھا گیا پھر اس کے بعد تو فرمایا: حج مبرور‘‘۔ (بخاری، رقم: 26)

یہ حج مبرور کیا ہے اس کو ایک دوسری روایت میں اس طرح واضح کیا گیا ہے:

’’جو شخص اللہ کے لیے حج کرے، پھر اُس میں کوئی شہوت یا نافرمانی کی بات نہ کرے تو وہ حج سے اِس طرح لوٹتا ہے، جس طرح اُس کی ماں نے اُسے آج جنا ہے۔‘‘ (بخاری، رقم: 1819)

اس حج مبرور کا بدلہ ایک روایت میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

’’عمرے کے بعد عمرہ اِن کے درمیان میں ہونے والے گناہوں کے لیے کفارہ ہے اور سچے حج (حج مبرور) کا بدلہ تو صرف جنت ہی ہے۔‘‘ (بخاری، رقم: 1773)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے حج دین ابراہیمی کی سب سے جامع عبادت ہے جسے تمام عبادات کا منتہائے کمال کہنا کوئی مبالغہ نہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کوئی عالم ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر وہ شخص جس نے زندگی میں یہ سعادت حاصل کر رکھی ہو وہ اپنے تجربے سے اس حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بندہ مومن صرف اللہ پر ایمان

اور اس کے رسول کے طریقے پر اپنی جان پر دکھ جھیلتا، مال کو خرچ کرتا، گھر، وطن اور رشتے ناطوں کی دوری سہتا، احرام کی سخت پابندیاں خود پر لگاتا ہوا صرف اللہ کی رضا کے لیے اس کے گھر پر حاضر ہوتا اور مناسک حج ادا کرتا ہے۔ یہی وہ قربانی ہے جو ایمان اور جہاد کے بعد حج مبرور کو سب سے بڑا عمل بنا دیتی ہے۔

تاہم ان سب کے ساتھ حج کو حج بنانے والی چیز یہ حقیقت ہے کہ حج دراصل جہاد کی تمثیل ہے۔ یہ اس جنگ کی تمثیل ہے جس کا اعلان روز ازل شیطان نے یہ کہہ کر کیا تھا کہ لاغوینهم اجمعین یعنی میں ان سب کو گمراہ کر کے دم لوں گا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی شیطان اور ذریت شیطان کی آدم اور اولاد آدم کے ساتھ ختم نہ ہونے والی جنگ شروع ہوگئی۔ بدقسمتی سے ہر دور میں انسانوں کی اکثریت اس جنگ میں اپنے باپ آدم علیہ السلام کے ساتھ کھڑے ہونے کے بجائے شیطان کے ساتھ جا کر کھڑی ہو جاتی ہے اور اس کی طرف سے جنگ شروع کر دیتی ہے۔ ایسے میں ایمان کا قلادہ گلے میں ڈالے اور اطاعت کا عہد کیے ہوئے سچے مسلمان خدا کی طرف جنگ کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ خواہشات کے تیروں اور شہوات کے شیطانی نیزوں کا مقابلہ صبر کی آہنی ڈھال سے اور تعصّبات کی ہر فصیل کو حق پرستی اور سچائی کی تلوار سے فتح کر لیتے ہیں۔ حج ایسے ہی لوگوں کے لیے گویا ایک تربیتی کورس ہے۔

یہ مومن ابراہیمی صدا پر لبیک کہتے اور دنیوی زیب و زینت اور لطافت کو ترک کر کے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کا پہلا پڑاؤ منیٰ کے فوجی کیمپ میں ہوتا ہے۔ پھر عرفات میں امام کے خطبے کی شکل میں لشکر کشی سے پہلے وعظ و نصیحت اور اللہ سے دعا و زاری کا اہتمام ہوتا ہے۔ سفر جہاد کی تمثیل میں نمازیں جمع و قصر کرتے ہوئے یہ لشکر مزدلفہ پہنچتا اور صبح دم اپنے رب کو یاد کرتا ہوا غنیم پر جا پڑتا ہے۔ یہی وہ عمل ہے جسے مناسک حج کی اصطلاح میں رمی

جمار یا شیطان کو کنکریاں مارنے کا عمل کہتے ہیں۔اس پہلے حملے کے ساتھ ہی قربانی دے کر خود کو رب کی راہ میں قربان کر دینے کا عزم کرتے ، سرمنڈوا کر اس کا شرف غلامی حاصل کرتے اور اس کے گھر کا طواف کر کے اس کو مرکز زندگی بنا کر اپنی زندگی گزارنے کا عزم کرتے ہیں۔

پہلے دن صرف پہلے بڑے شیطان پر اور اگلے دو یا تین دن تک تینوں شیطانوں پر یہ مومنانہ سنگ باری حملے جاری رہتے ہیں۔ یہ تین شیطان بھی دراصل ان تین چیزوں کی علامت ہیں جہاں سے انسان سب سے زیادہ گمراہ کیا جاتا ہے۔ پہلا ابلیس اور اس کی ذریت۔ یہ سب سے بڑی شیطانی قوت ہے۔ دوسری انسان کا اپنا نفس جو اگر خود پر غالب آجائے تو شیطان کا سب سے بڑا ساتھی بن جاتا ہے۔تیسرا انسان کا ماحول اور اس میں پائی جانے والی شیطانی ترغیبات۔ یہی وہ تین مقامات ہیں جہاں انسان کو زندگی بھر شیطانی وسوسہ انگیزیوں کے خلاف لڑتے رہنا ہوتا ہے۔اس سنگ باری کے بعد یہ مجاہد اس عزم کے ساتھ گھروں کو لوٹتے ہیں کہ زندگی بندگی میں گزرے گی اور شیطان کا ازلی چیلنج پورا نہیں ہوگا کہ خدا بندے کو شکر گزار نہیں پائے گا۔

بدقسمتی سے دور حاضر میں لوگ بڑی تعداد میں حج کرنے تو جاتے ہیں، مگر انہیں حج کی یہ حقیقی اسپرٹ نہیں بتائی جاتی۔ چنانچہ وہ اسے مناسک کا ایک مجموعہ سمجھ لیتے ہیں جسے برے بھلے طریقے پر ادا کر دیا جاتا ہے۔ بلاشبہ مالی اور بدنی طور پر قربانی دے کر جب حج کیا جائے تو اس کا اپنی جگہ بڑا اجر ہے، مگر جب لوگ اسپرٹ سے واقف نہیں ہوتے تو پھر ان کی زندگی میں وہ حقیقی اسپرٹ پیدا نہیں ہوتی۔ وہ اکثر اوقات اسے گناہ بخشوانے کا ایک سفر سمجھتے ہیں اور واپس آکر وہی شیطان کی پیروی کی زندگی گزارنے لگتے ہیں جیسی وہ پہلے گزار رہے تھے۔

لیکن اسپرٹ اگر بار بار دہرائی جائے تو انسان کا حج صرف ایک سفر نہیں رہتا بلکہ یہ زندگی کا ایک نیا آغاز بن جاتا ہے۔وہ آغاز جس کی آج ہمارے معاشرے کو سب سے بڑھ کر ضرورت ہے۔

”جب زندگی شروع ہوگی“

(مصنف: ابویحییٰ)

☆ ایک ایسی کتاب جس نے دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا
☆ ایک ایسی تحریر جسے لاکھوں لوگوں نے پڑھا
☆ ایک ایسی تحریر جس نے بہت سی زندگیاں بدل دی
☆ ایک ایسی تحریر جو اب ایک تحریک بن چکی ہے
☆ آنے والی دنیا اور نئی زندگی کا جامع نقشہ ایک دلچسپ ناول کی شکل میں
☆ ایک ایسی تحریر جو اللہ اور اس کی ملاقات پر آپ کا یقین تازہ کر دے گی
☆ علم و ادب کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف

(مزید معلومات کے لیے رابطہ: 03323051201)

''قسم اُس وقت کی''

(مصنف: ابویحییٰ)

☆ ایک ایسی کتاب جس نے کفر کی طرف بڑھتے کئی قدموں کو تھام لیا

☆ ایک منکر لڑکی کی داستان سفر جو سچ تلاش کرنے نکلی تھی

☆ ایک خداپرست کی کہانی جس کی زندگی سراپا بندگی تھی

☆ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور روز قیامت کا ناقابل تردید ثبوت

☆ رسولوں کی صداقت کا نشان دور رسالت کی زندہ داستان

☆ کفر و الحاد کے ہر سوال کا جواب ہر شبہے کا ازالہ

☆ ایک ایسی کتاب جو آپ کے ایمان کو یقین میں بدل دے گی

☆ ابویحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا دوسرا حصہ

(مزید معلومات کے لیے رابطہ: 03323051201)

''بس یہی دل''

(مصنف: ابویحییٰ)

☆ دل کو چھو لینے والے مضامین

☆ ذہن کو روشن کر دینے والی تحریریں

☆ آنکھوں کو نم کر دینے والے الفاظ

☆ ابویحیٰ کے قلم سے نکلے ہوئے وہ مضامین جو ایمان و اخلاق کی اسلامی دعوت کا بھرپور اور موثر بیان ہیں۔

☆ دلنشین اسلوب میں لکھی گئی ایسی تحریریں جنھیں پڑھ کر آپ دل کے دروازے پر ایمان کی دستک سن سکیں گے۔

(مزید معلومات کے لیے رابطہ: 03323051201)

”قرآن کا مطلوب انسان“

(مصنف: ابویحییٰ)

☆ قرآن مجید پر مبنی اپنی نوعیت کا ایک منفرد کام

☆ اللہ تعالیٰ ہمیں کیسا دیکھنا چاہتے ہیں

☆ وہ کن لوگوں کو جنت عطا کریں گے

☆ کون سے اعمال انہیں ناراض کر دیتے ہیں

☆ ان کی پسند اور ناپسند کا راستہ کیا ہے

☆ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے ان اپنے الفاظ میں جاننے کا منفرد ذریعہ

☆ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مزین اخلاق نبوی کا قرانی نمونہ

☆ ابویحییٰ کی ایک منفرد تصنیف

(مزید معلومات کے لیے رابطہ: 03323051201)

”تیسری روشنی“

(مصنف: ابویحییٰ)

☆ ابویحییٰ کی داستان حیات۔ تلاش حق کی سچی کہانی

☆ نفرت اور تعصب کے اندھیروں کے خلاف روشنی کا جہاد

☆ جب زندگی شروع ہوگی کے حوالے سے اٹھائے گئے اہم سوالات کا جواب

☆ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے والے رویوں کا تفصیلی بیان

☆ امت مسلمہ کے اتحاد کا جذبہ رکھنے والوں کے لیے ایک رہنما تصنیف

☆ ابویحییٰ کی ایک اور منفرد تصنیف

(مزید معلومات کے لیے رابطہ: 03323051201)

.... حدیث دل ....

When Life Begins

English Translation of Abu Yahya Famous book

Jab ZindagiShuruHo Gee

A Book that created ripples through out the World

A Writing that was read by Millions

A Book that changed many Lives

A Writing that has become a Movement

A Comprehensive sketch of the World and Life in the Hereafter in the form of an interesting Novel

A Book that will strengthen your Faith in God and Hereafter

The first book of its kind in the world of Literature

For more information, please call:

(92) 3323 051 201